حصّہ اوّل

اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے لیے

ناشر

بک ہاؤس، اُردو بازار لاہور

برائے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

علم التعلیم

حصہ اول

اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے لیے

ناشر بک ہاؤس

برائے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

ایڈیشن	تعداد اشاعت	تاریخ اشاعت
اوّل	۲,000	اگست 1980

تیار کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور و منظور شدہ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور/ملتان/سرگودھا، بہاولپور، راولپنڈی بطور سول ٹیکسٹ بک۔

"قومی کمیٹی برائے جائزہ کتب نصاب کی تصحیح شدہ"

* * * * *

مصنفین :

ڈاکٹر مسز نسیم شوکت

پروفیسر مسز رضیہ مدد علی

پروفیسر میاں محمد طفیل

پروفیسر منور ابن صادق

مدیر :

مسعود صدیقی

ایڈیٹر، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

مدیر نو : ڈاکٹر مسز نسیم لودھی

سینئر ماہر مضمون پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ۔ لاہور

پیش لفظ

تعلیم فرد کی ہمہ پہلو نشو و نما کا ایسا عمل ہے جس سے وہ معاشرے کے ایک مفید رکن کی حیثیت سے زندگی گزارنے کی صلاحیت حاصل کرتا ہے ۔ اس اعتبار سے تعلیم ہر معاشرے کے لیے لازمے کی حیثیت رکھتی ہے ۔ پاکستان ایک اسلامی جمہوری مملکت ہے لہذا یہاں کے معاشرے میں تعلیم کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔ اسی اہمیت کے پیش نظر موجودہ تعلیمی پالیسی 80-1972ء میں علم التعلیم کے مضمون کو ابتدائی تعلیم کے فروغ عامہ (Mass Education) کی سکیم کا حصہ بنایا گیا ہے ۔ اس سکیم کے مطابق اس مضمون کو ثانوی ، اعلیٰ ثانوی اور بی ۔ اے کی سطح پر شامل نصاب کیا جائے گا ، جس سے نچلی سطح پر تدریس کے لیے مضبوط بنیاد فراہم ہو جائے گی ۔ مزید برآں عام تعلیم کے فروغ کے لیے درکار اساتذہ کی کثیر تعداد ایسے افراد کی صورت میں دستیاب ہو جائے گی ، جنھوں نے علم التعلیم کو ایک مضمون تدریس کے طور سے پڑھا ہوگا ۔ مثلاً اس مضمون کے ساتھ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی امتحانات پاس کرنے والے افراد بالترتیب پرائمری اور مڈل جماعتوں میں تدریسی فرائض انجام دے سکیں گے ۔

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے لیے علم التعلیم کی درسی کتابیں شائع کی ہیں ۔ ان کتابوں کے لیے حکومت کے مرتب کردہ نصاب میں نظری اور عملی پہلو دونوں شامل ہیں ۔ اس نصاب کے مطابق کتابوں کی تصنیف کے لیے علم التعلیم کے ماہر اساتذہ کی ایک ٹیم کی خدمات حاصل کی گئیں اور چار کتابوں پر مشتمل ایک سلسلہ کتب کی تصنیف عمل میں آئی ، جسے ایک مجلس ادارت نے مرتب کر کے اشاعت کے لیے تیار کیا ۔

زیر نظر کتاب اعلیٰ ثانوی سطح کے طلبہ کے لیے اصولی و نظری

مباحث پر مشتمل ہے۔ اسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا
حصہ ''تعلیم اور مقاصد تعلیم'' دوسرا حصہ ''تعلیمی نفسیات و رہنمائی''
اور تیسرا حصہ ''تنظیم مدرسہ'' پر مشتمل ہے۔ ان تینوں حصوں کے
تمام ابواب میں مواد کی پیشکش کے سلسلے میں یہ امر سامنے رہا ہے
کہ اصولی و نظری مباحث کو پاکستانی ماحول کے مطابق پیش کیا
جائے اور طلبہ کی صلاحیت و استعداد اور نصابی ضرورتوں کو ملحوظ
خاطر رکھا جائے۔ ہر باب کے آخر میں ایسے مشقی سوالات شامل کیے
گئے ہیں جن سے طلبہ کے تعلم کا تخلیقی انداز میں جائزہ لیا جا سکے گا۔

مصنفین و مدیران نے کتاب کو مفید بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش
کی ہے لیکن اس کی افادیت کا انحصار بالآخر طلبہ و اساتذہ کے طریق
استفادہ پر ہے۔ لہٰذا آئندہ اشاعت کے وقت کتاب کو بہتر بنانے کے
لیے اساتذہ و طلبہ کے مشوروں کو شکریے کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔
ماہرین مضمون اور عام شہریوں سے بھی مشوروں کا خیر مقدم کیا
جائے گا۔

مسعود صدیقی

فہرست مضامین

حصّہ اوّل

تعلیم اور مقاصدِ تعلیم

صفحہ

حصّہ دوم

تعلیمی نفسیات و رہنمائی

صفحہ

حصہ سوم

تنظیم مدرسہ

ناشر:۔ شیخ محمد سعید اردو بازار لاہور۔
مطبع:۔ لیل و نہار پرنٹنگ پریس لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

تعلیم کا مفہوم اور اس کا دائرۂ عمل

تعلیم کا مفہوم

تعلیم کے مفہوم، اغراض و مقاصد اور دائرہ عمل کے متعلق مختلف ماہرین تعلیم نے مختلف آرا کا اظہار کیا ہے۔ بعض ماہرین کے نزدیک تعلیم فرد کی شخصی تکمیل کا نام ہے اور بعض کی رائے میں یہ سراسر معاشرتی عمل ہے، جس کا نصب العین فرد کا معاشرتی تسویہ (Social Adjustment) ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ تعلیم فرد کی ذہنی نشو و نما کا عمل ہے اور ایک دوسری رائے یہ ہے کہ تعلیم تہذیبی ورثے کی نسل در نسل منتقلی کا عمل ہے۔ ماہرین کا ایک گروہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ تعلیم قدیم تہذیبی سرمائے کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ جبکہ ایک دوسرا گروہ اسے تہذیب و تمدن کی تشکیل جدید کا عمل قرار دیتا ہے۔

تعلیم کے مفہوم کے سلسلے میں سقراط (Socrates) کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس کی رائے میں تعلیم سچائی کی تلاش میں مدد دینے کا نام ہے اور اس کا مقصد غلط باتوں کی روک تھام ہے۔ سقراط کا نقطۂ نظر تھا کہ سچائی افراد کے ذہنوں میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے افراد کو اس پوشیدہ سچائی سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ افلاطون (Plato) تعلیم کو معاشرے کی متوازن تنظیم کا عمل قرار دیتا ہے۔ اس میں فرد کی مخصوص جسمانی و روحانی صلاحیتوں کو اس طرح نشو و نما دی جاتی ہے کہ فرد کی شخصیت کی حتی الامکان تکمیل ہو جائے۔ ارسطو (Aristotle) کی رائے میں تعلیم بچے کی یادداشت، عادات اور خیالات کے ساتھ ساتھ اس کی عقلی اور اخلاقی نشو و نما کا عمل ہے۔ کومینیس (Comenius) نے تعلیم کو ایک ایسی کارگاہ سے

تشبیہ دی ہے جس سے انسان ڈھل ڈھل کر نکلتے ہیں۔

جدید ماہرین تعلیم میں سے پستالوزی (Pestalozi) کے نزدیک تعلیم انسان کی پوشیدہ قوتوں کی قدرتی، مربوط اور تدریجی نشو و نما کا نام ہے۔ بوڈ (Bode) اسے بالیدگی کا عمل قرار دیتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ نن (Nunn) کا قول ہے کہ ''تعلیم کا کام یہ ہے کہ فرد کے لیے ایسے حالات فراہم کرے جن کے زیر اثر اس کی انفرادیت کمال تک پہنچ جائے۔ یہ حالات ایسے ہونے چاہییں کہ فرد اپنی مخصوص فطری صلاحیتوں کے حقیقی نتیجے کے طور پر اجتماعی زندگی کے رنگا رنگ حسن میں اپنے حصے کا اضافہ کر سکے''۔ ڈیوی (Dewy) کے نزدیک تعلیم تجربے کی مسلسل تعمیر نو یا تنظیم نو کا نام ہے۔ اس سے تجربے کی معاشرتی حیثیت میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے اور فرد میں آیندہ پیش آنے والے تجربات کا رخ متعین کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ ہارن (Horne) کے نزدیک تعلیم آزاد و باشعور انسانوں کی خدا سے ہم آہنگی کا عمل ہے اور انسان کے ذہن، جذباتی اور ارادی ماحول میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ پوپ پائیس یازدہم (Pope Pius XI) کا قول ہے کہ تعلیم بنیادی طور سے اس عمل پر مشتمل ہے جس کا مقصد انسان کو اس کے مقصد وجود اور مقصد تخلیق کے لیے تیار کرنا ہے۔ تعلیم کا موضوع انسان ہے جو جسم اور روح کا مرکب ہے اور کائنات کے ساتھ ایک وحدت میں منسلک ہے۔ گرین (Greene) نے معاشرے کو انسانی جسم سے تشبیہ دی ہے جس میں تجارت کو ہاتھوں کی، نظام خاندان کو دل کی، مذہب کو روح کی اور تعلیم کو دماغ کی حیثیت حاصل ہے۔

قدیم و جدید فلسفیوں کی ان تعریفات کی روشنی میں تعلیم کے درج ذیل پہلو سامنے آتے ہیں:

۱۔ تعلیم حقیقت کی جستجو کا عمل ہے۔

۲۔ تعلیم معاشرے کی تنظیم و تہذیب کا عمل ہے۔

۳ - تعلیم فرد کی جسمانی ، عقلی ، اخلاقی ، روحانی اور جذباتی قوتوں کی قدرتی ، مربوط اور مسلسل نشو و نما اور توسیع کا عمل ہے -

۴ - تعلیم معاشرے کی تعمیر نو کا عمل ہے -

۵ - تعلیم انسان کو خدا سے ہم آہنگی کے قابل بنانے کا عمل ہے -

تعلیم کے ان مختلف پہلوؤں پر زیادہ زور دینے کی وجہ سے مختلف ماہرین تعلیم نے مقاصد تعلیم ، نصاب تعلیم ، طریق تدریس اور اصول نظم و نسق کے سلسلے میں مختلف انداز فکر اختیار کیا ہے - اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تعلیم کے ان مختلف پہلوؤں میں باہم کوئی تعارض یا تصادم ہے - دراصل تعلیم ایک ایسا جامع معاشرتی عمل ہے ، جس کے ذریعے فرد کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کی نشو و نما کا اس طرح بندوبست کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ، کائنات کی اور خالق کائنات کی حقیقت کو پا لے اور معاشرے کی تنظیم و تہذیب اور حسب ضرورت تشکیل جدید کے سلسلے میں مناسب کردار ادا کرنے کی اہلیت حاصل کرے - اس اعتبار سے تعلیم کا مفہوم بڑا وسیع ہے - فرد کی جسمانی اہلیت ، کردار اور ذہن کی تشکیل پر اثر انداز ہونے والا ہر تجربہ اور مشغلہ اس میں شامل ہو گا - اس مفہوم کے اعتبار سے تعلیم زندگی بھر جاری رہنے والا عمل ہے - اس میں رسمی اور غیر رسمی دونوں طرح کی تعلیم شامل ہو گی - محدود اصطلاحی مفہوم کے اعتبار سے تعلیم ایسا عمل ہے جس کے ذریعے معاشرہ ارادی طور سے سکولوں ، کالجوں ، یونیورسٹیوں اور دیگر اداروں کے ذریعے اپنے تہذیبی ورثے ، سرمایہ علوم و فنون اور اپنی اقدار کو نسل در نسل منتقل کرتا رہتا ہے -

تعلیم رسمی ہو یا غیر رسمی ، اس کے بنیادی عناصر ایک ہی رہتے ہیں - علم التعلیم کے طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان عناصر کو ہمیشہ پیش نظر رکھے - یہ عناصر حسب ذیل ہیں :

متعلّم ، معاشرہ معلم ، نصاب تعلیم ، عمل تدریس ، عمل تعلّم -

عمل تعلیم میں ان عناصر کی اہمیت کا مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔

متعلّم اور تعلیم

متعلم عمل تعلیم کا محور و مرکز ہے کیونکہ تعلیم کا مطمحِ نظر اس کی مناسب نشو و نما ہے۔ اس سے تعلیم کی معاشرتی حیثیت کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ فرد کی نشو و نما میں معاشرتی پہلو بھی شامل ہے۔

انسان معاشرت پسند ہے، لہٰذا معاشرے سے کاٹ کر اس کی تربیت نہیں کی جا سکتی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی انفرادی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کو نظر انداز کرنا بھی اصول تعلیم کے خلاف ہے۔ ہر فرد مخصوص استعداد اور مزاج کا مالک ہوتا ہے۔ اس کی تعلیم میں اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ متعلّم کی ضروریات اور دلچسپیوں کو سامنے رکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل نکات رہنما اصولوں کا کام دے سکتے ہیں:۔

۱۔ متعلّم ایک شہری کی حیثیت سے اپنے حقوق و فرائض معلوم کرنا چاہتا ہے اور فرائض کو کما حقہٗ ادا کرنے کی اہلیت کا خواہاں ہوتا ہے۔

۲۔ متعلّم کو دوسروں سے تعاون کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کا احترام کرنا چاہتا ہے اور اخلاق اصول و اقدار کو اپنے کردار کا حصہ بنانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

۳۔ متعلّم اپنے اور کائنات کے متعلق بنیادی سائنسی حقائق معلوم کرنا چاہتا ہے، لہٰذا اسے سائنسی طریقوں کے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

۴۔ متعلّم عقلی انداز فکر اور اظہار مافی‌الضمیر کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

۵ - متعلّم کو ایسے مواقع کی ضرورت ہوتی ہے جن سے اس کی جمالیاتی حس کو تسکین ملے - اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے مناظر فطرت اور فنون لطیفہ سے لطف اندوز ہونے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں -

۶ - اچھی صحت متعلّم کی ایک ضرورت ہے -

۷ - متعلّم نظام خاندان کی اہمیت جاننا چاہتا ہے اور کامیاب گھریلو زندگی کے اصولوں سے روشناس ہونا چاہتا ہے -

۸ - متعلّم کی ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ وہ اشیائے ضرورت اور خدمات کے حصول و استعمال کی اہلیت حاصل کرے -

۹ - متعلّم ایسی مہارتوں ، ایسے فہم اور ایسے رجحانات کی ضرورت محسوس کرتا ہے جن کی معاشرے میں قدر ہو اور وہ اسے معاشرے کی معاشی زندگی میں مفید کردار ادا کرنے کا اہل بنائیں -

۱۰ - متعلّم کو ایسی تربیت کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے فارغ وقت کا صحیح استعمال کر سکے اور اپنے وقت کو اس طرح تقسیم کر سکے کہ انفرادی مشاغل اور اجتماعی سرگرمیوں میں توازن قائم رہے -

تعلیم کے عمل میں متعلّم کی ان فطری ضرورتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے - ان کے علاوہ انسان کی فطرت کا ایک بہت بڑا تقاضا ہے کہ وہ اپنے خالق کو پہچانے - متعلّم کے اس فطری تقاضے کی تسکین بھی تعلیم کی ذمے داری ہے -

معاشرہ اور تعلیم

تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے - خصوصاً رسمی تعلیم کے لیے مناسب تعلیمی اداروں کا اہتمام تو سراسر معاشرے کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور معاشرہ ان کے ذریعے اپنے تہذیب و تمدن ، علوم و فنون اور مذہب و

اخلاق کو نئی نسل تک پہنچاتا ہے۔ گویا معاشرے اور تعلیم میں گہرا تعلق ہے۔ فرد کی فطری ضروریات کا جو خاکہ اوپر پیش کیا گیا ہے، اس پر نظر دوڑائیں تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے اکثر ضروریات بنیادی طور سے معاشری نوعیت کی ہیں۔ دراصل فرد اور معاشرہ لازم و ملزوم ہیں اور تعلیم کا کمال یہی ہے کہ دونوں میں توازن قائم رکھے۔ چنانچہ جس طرح فرد کی شخصی تکمیل (Self-Realization) تعلیم کا ایک مقصد ہے اسی طرح فرد کا معاشرتی تسویہ (Social Adjustment) بھی تعلیم کا ایک اہم مقصد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فرد متعلقہ معاشرے کی اقدار و روایات کو اپنائے اور معاشرتی اداروں سے منسلک ہو کر معاشرے میں جذب ہو جائے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اصل حقیقت اللہ کی ذات ہے اور وہی تمام اقدار کا سر چشمہ ہے۔ لہٰذا اسلامی معاشرے سے فرد کی ہم آہنگی کے لیے ضروری ہے کہ اسے اسلامی عقائد و اقدار اور طرز حیات کے مطابق تعلیم دی جائے۔

معلم اور تعلیم

ایک زمانہ تھا جب معلم کو ایسی بیساکھی سے تشبیہ دی جاتی تھی جس سے متعلّم کو کسی مخصوص نفس مضمون یا کسی خاص مہارت کے حصول میں مدد ملتی تھی۔ اس تصور کے مطابق متعلّم کی حیثیت ایک ایسے فرد کی ہوتی تھی جو خود معذور ہوتا تھا اور معلم کے سہارے چل کر زندگی کے مراحل طے کرتا تھا۔ جدید تصور کی رو سے تعلیم کسی مخصوص نفس مضمون یا کسی خاص مہارت کے حصول کا نام نہیں بلکہ یہ اپنے معاملات خود انجام دینے اور اپنے مسائل کو خود حل کرنے کی اہلیت حاصل کرنے کا نام ہے۔ اس تصور کی رو سے متعلّم خود ایک فعال کارکن کی حیثیت رکھتا ہے اور معلم کی حیثیت ایک رہنما کی ہو جاتی ہے جو متعلّم کو تعلیم کے عمل میں مدد دیتا اور رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

معلم کی حیثیت کے متعلق جدید تصور سے تعلیم و تعلم میں معلم کی مرکزی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ در اصل تعلّم کے عمل میں جان ڈالنے کا کام زیادہ تر معلم کی شخصیت ہی پر منحصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی بھی نظام تعلیم اپنے معلّمین سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ کبھی اس بات کو اس پیرائے میں بیان کیا جاتا ہے کہ کلاس میں وہی کچھ آئے گا جو کچھ جگ میں ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ متعلمین کے کردار و شخصیت کا انحصار بنیادی طور سے معلمین کے کردار و شخصیت پر ہے۔

قرآن حکیم میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فرائض نبوت میں ''تعلیم'' کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔ خود آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے بارے میں فرمایا:

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا یعنی بے شک مجھے معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس کے ساتھ آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ یعنی بے شک مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کر دوں۔ گویا متعلم کے اخلاق کی تہذیب و تعمیر معلم کا بنیادی فریضہ ہے اور یہ وہ فریضہ ہے جس کے لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھیجا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے لہٰذا اس فریضے کی ادائیگی معلمین کی ذمے داری ہے۔

نصابِ تعلیم اور تعلم

نصاب تعلیم سے مراد نفس مضمون، مہارتوں، اور تجربات و مشاغل کا وہ تمام ذخیرہ ہے جو کسی تعلیمی ادارے کی طرف سے متعلّم کے لیے فراہم کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ کمرہ جماعت کے اندر ہو یا باہر۔ زمانہ قدیم سے لے کر آج تک نصاب کو تعلیم و تعلم میں

نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ پرانے زمانے میں نصاب سے مراد مخصوص نفس مضمون ہوتا تھا اور اس کو ازبر کر لینے کو تعلیم کا کمال سمجھا جاتا تھا لیکن اب نصاب تعلیم کا مفہوم بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اس وسیع مفہوم کے مطابق نصاب تعلیم پر عبور اب بھی معیار تعلیم کے لیے لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

نصاب تعلیم کے تعلیم سے تعلق کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ تعلیم و تعلّم کے معیار پر نصاب تعلیم کے مناسب یا نامناسب ہونے کا براہ راست اثر پڑتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ نصاب تعلیم متعلم کی استعداد کے مطابق ہو اور اس کی جامع نشوونما کے تمام تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ متعلقہ معاشرے کی ضروریات اور تقاضوں کا بھی نصاب میں خیال رکھا گیا ہو۔

تدریس اور تعلیم

تدریس، تعلّم کے لیے ترغیب کا عمل ہے۔ اس میں وہ تمام رہنمائی شامل ہے جس کے ذریعے معلم متعلم کو ایک ذمے دار شہری کے طور سے کامیاب زندگی گذارنے کے قابل بناتا ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں: اول، ایسی مناسب رہنمائی جس سے متعلم کو یہ فیصلہ کرنے میں مدد ملے کہ اس کے لیے کیا کچھ سیکھنا ضروری ہے۔ دوم، ایسی امداد جس سے سیکھنے کا عمل سہل ہو جائے۔ پہلی صورت کا تعلق نصاب تعلیم سے ہے جبکہ دوسرے کا تعلق تدریس سے ہے۔ (نصاب تعلیم کے متعلق آپ مختصراً اوپر پڑھ چکے ہیں اور اس کی تفصیل چوتھے باب میں بیان کی گئی ہے۔) طریقۂ تدریس سے مراد ایک ایسا منصوبہ عمل ہے جس سے مخصوص تعلیمی نتیجہ حاصل کرنا مقصود ہو۔ صورت حال اور مضامین کے اختلاف کے مطابق مختلف قسم طریقے عمل تدریس میں مفید سمجھے جاتے ہیں اور تعلیمی تحقیق کے ذریعے نت نئے طریقے ایجاد ہو رہے ہیں۔ تعلیم کے نتائج کو بہتر اور

پائیدار بنانے کے لیے عمل تدریس کی اصلاح ضروری ہے ، اس کے بغیر مقاصد تعلیم حاصل نہیں ہو سکتے ۔

تعلّم اور تعلیم

تعلّم عمل تدریس سے استفادے کا نام ہے اور اس کے نتیجے میں عملی کام کے لیے آمادگی پیدا ہوتی ہے ۔ فرد میں کسی مخصوص تعلّم کی علامت یہ ہے کہ وہ متعلقہ صورت حال میں اس کے مطابق عمل کرے گا ۔ مثلاً آپ کو مصیبت زدوں سے ہمدردی اور ان کی مدد کرنے کی تعلیم دی گئی ہے ۔ اس تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ عملی زندگی میں آپ کسی مصیبت زدہ سے دو چار ہوں تو اپنے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات محسوس کریں اور اپنی استطاعت کے مطابق اس کی عملی مدد کریں ۔ ہمدردی کے جذبے کے احساس کو تحسین (Appreciation) کہتے ہیں اور عملی امداد کی کوشش کو رجحان ، رویہ یا طرز عمل (Attitude) کا نام دیا جاتا ہے ۔ رجحان اور تحسین میں معمولی فرق ہے ۔ رجحان ذہن کی ایسی حالت کا نام ہے جو ایک خاص طرز عمل کا تقاضا کرتی ہے ۔ تحسین رجحان کا جذباتی پہلو ہے ۔ اس میں ذہن متعلقہ صورت حال میں خاص قسم کا حظ ، اطمینان یا کرب محسوس کرتا ہے ۔

تعلّم کی ایک اور مثال یہ ہے کہ جغرافیے میں سورج کے طلوع و غروب کی نسبت سے آپ مشرق و مغرب ، شمال و جنوب سمتوں کے تعین کا طریقہ پڑھ چکے ہیں ۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ مکہ مکرمہ پاکستان کے مغرب میں واقع ہے اور کعبتہ اللہ مکہ مکرمہ میں واقع ہے ۔ آپ یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ نماز پڑھتے وقت کعبے کی طرف منہ کیا جاتا ہے ۔ اب اگر آپ اپنے شہر سے باہر کہیں سفر پر ہوں تو ان معلومات و تصورات کی روشنی میں آپ نماز پڑھنے کے لیے کعبے کی سمت کا تعین کر لیں گے ۔ اس قسم کے تعلّم کو فہم (Understandings) کا نام دیا جاتا ہے ۔ اس میں حقائق و معلومات پر مبنی تمام تصورات

شامل ہوتے ہیں۔ تعلّم کی ایک اور قسم وہ ہے جس میں فہم کے مقابلے میں عمل پر زیادہ زور ہوتا ہے۔ اسے مہارت (Skill) کہتے ہیں مثلاً اردو یا کسی زبان کا صحیح بولنا ایک مہارت ہے۔ بولنے کی اس مہارت کے حصول کے لیے گرامر کے اصولوں پر عبور تو فہم (Understandings) کا حصہ ہوگا لیکن عملاً بولنا ایک مہارت ہے۔ اس طرح ٹائپ کرنا ایک مہارت ہے، اگرچہ اس کے لیے ٹائپنگ کے بنیادی اصولوں کا سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے جو فہم کا حصہ ہے۔ گویا مہارتوں کے حصول کے لیے فہم بنیاد کا کام دیتا ہے۔

اس بحث کی روشنی میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ تعلّم ایک جامع عمل ہے، جس کی چار نمایاں صورتیں ہیں: فہم، مہارت، رجحان اور تحسین۔ عملی زندگی میں ان چاروں کی ضرورت پڑتی ہے، لہذا تعلیم جو کامیاب عملی زندگی کے لیے تیاری کا نام ہے اس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

تعلیم کا دائرۂ عمل

تعلیم کے مختلف عناصر متعلم، معاشرہ، معلم، نصاب تعلیم، تدریس اور تعلّم کے متعلق اوپر جو بحث گذری ہے اس سے آپ تعلیم کے دائرۂ عمل کی وسعت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ فرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ اس کی جامع نشوونما تعلیم کا مقصد ہے۔ دوسری طرف معاشرے سے بھی تعلیم کا گہرا تعلق ہے۔ معاشرہ تعلیم کی تنظیم اور اشاعت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تعلیم کا سارا مواد یعنی نصاب تعلیم معاشرے ہی کا ورثہ ہوتا ہے۔ تعلیمی اداروں کا پورا نظام بھی معاشرے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ خود متعلم اور معلم بھی معاشرے کے رکن ہوتے ہیں۔ طریقہ ہائے تدریس و تعلّم کے تعین میں بھی معاشرہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔

بعض اوقات فرد اور معاشرے کی اس اہمیت پر جدا جدا زور دینے کی وجہ سے ماہرین میں تعلیم کے دائرۂ عمل کے متعلق اختلاف

رونما ہو جاتا ہے۔ بعض ماہرین فرد پر زیادہ زور دیتے ہیں اور معاشرے کو نظر انداز کر دیتے ہیں جبکہ بعض دوسرے ماہرین معاشرے کی خاطر فرد کو قربان کرنے پر زور دیتے ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ سے تعلیم کے دائرہ کے متعلق دو مختلف نقطہ ہائے نظر وجود میں آئے ہیں: انفرادیت پسندی اور قوم پرستی۔ یہاں ان دونوں تصورات کے متعلق مختصر طور سے بحث کی جاتی ہے۔

انفرادیت پسند تعلیم

انفرادیت پسند تعلیم کا نظریہ اٹھارویں صدی میں رونما ہوا۔ اس وقت تک یورپ مذہبی تعصب اور توہم پرستی کا شکار تھا اور جاگیردارانہ نظام کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ اس قسم کے حالات میں فرد کی آزادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرانس کے مشہور فلسفی روسو نے اس صورت حال کے خلاف آواز اٹھائی اور اس بات پر زور دیا کہ فرد کی صلاحیتوں کو روک ٹوک کے بغیر نشوونما ملنی چاہیے۔ روسو کا یہ نظریہ ہی انفرادیت پسند تعلیم کی بنیاد بنا۔

انفرادیت پسندوں کے نزدیک بچے کی تربیت خالص فطری انداز میں ہونی چاہیے۔ جس طرح پودے فطرت کی آغوش میں پروان چڑھتے ہیں، اسی طرح بچے کو بھی نصاب تعلیم اور نظم و ضبط کی رسمی پابندیوں سے آزاد رکھ کر تربیت دی جانی چاہیے۔ ورنہ ان کی فطرت مسخ ہو جائے گی اور ان کی فطری صلاحیتیں نشو و نما حاصل نہ کر سکیں گی۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق فرد کو معاشرے سے دور رکھ کر تعلیم دی جانی چاہیے تاکہ اس کی شخصیت فطرت سے ہم آہنگ ہو اور اس کی تمام فطری صلاحیتیں معاشرتی طور طریقوں کے اثرات سے محفوظ رہیں۔

انفرادیت پسند تعلیم میں فرد کو معاشرے پر ترجیح دی جاتی ہے اور نصاب تعلیم، طریق تدریس اور نظم و نسق کو ایک ایک فرد کی دلچسپیوں، ضرورتوں اور میلان طبع کے مطابق بنانے پر زور دیا جاتا ہے۔ اس سے معاشرہ نظر انداز ہو جاتا ۔۔۔ ل بات کا اندیشہ

لاحق ہو جاتا ہے کہ فرد خود غرض ہو جائے اور معاشرے کی تخریب کا باعث بن جائے۔ اس نظریے کی دوسری خامی یہ ہے کہ اس میں نام نہاد فطری طریقۂ تعلیم کی آڑ میں تمام تعلیمی اداروں اور فرد کی تعلیم کے لیے انسانی کوششوں کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس طرح گویا ہم فرد کو بخت و اتفاق کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں، جو کبھی سازگار بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کے ناساز گار ہونے کے امکانات کہیں زیادہ ہیں۔

انفرادیت پسند تعلیم کا نظریہ دراصل اٹھارویں صدی کے یورپ میں رائج معاشرتی نظام کی بے جا پابندیوں کے خلاف ایک رد عمل تھا۔ اس معاشرتی نظام میں فرد کی حیثیت بالکل ختم ہو جاتی تھی۔ اسے بے زبان اور بے شعور جانوروں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس کے رد عمل میں شدت اختیار کی گئی تو معاشرتی پہلو پر سخت زد پڑی۔ خود روسو کے بعد کے انفرادیت پسندوں کو بھی اس کا احساس ہو گیا کہ معاشرے، قوم یا ریاست کی شرکت کے بغیر فرد کی تعلیم ناممکن ہے۔

قوم پرست تعلیم

تعلیم میں معاشرے، قوم یا ریاست کی شرکت کا تصور انفرادیت پسندی ہی سے ظہور میں آیا تھا۔ اس کا محرک تو یہ امر تھا کہ فرد کی تعلیم کو محض فطرت کے حوالے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس مقصد کے لیے معاشرے کو باقاعدہ تنظیم کا فریضہ ادا کرنا چاہیے۔ بنیادی طور سے تو تصور یہی تھا کہ معاشرہ فرد کے خادم کی حیثیت سے اس کے لیے مناسب تعلیمی وسائل و ذرائع اور ماحول فراہم کرے۔ رفتہ رفتہ اس میں یہ تصور شامل ہوا کہ تعلیم کے ذریعے فرد میں متعلقہ معاشرے سے محبت کا جذبہ بھی پیدا کیا جانا چاہیے۔ بالآخر معاملہ اس انتہا تک پہنچا کہ تعلیم کا مقصد ہی یہ ہونا چاہیے کہ افراد کو قوم، وطن، ریاست اور معاشرے کا خادم اور تابع بنایا جائے۔ یہ نظریہ قوم پرست تعلیم یا وطن پرست تعلیم کا نظریہ کہلاتا ہے۔

قوم پرست تعلیم یا وطن پرست تعلیم کا سب سے بڑا داعی جرمن فلسفی ہیگل تھا ۔ اس کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تمام معاشرتی ادارے افراد کی تخلیقی قوتوں کے مظہر ہوتے ہیں ۔ ایسے اداروں میں سب سے افضل ادارہ قومی ریاست ہے ۔ افراد کی تخلیقی قوتوں کے مظہر ہونے کی وجہ سے ان اداروں کو مقدس قرار دیا گیا اور فرد کے لیے ان کی خدمت بہت بڑا شرف قرار پائی ۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق تعلیم کا سب سے بڑا کمال یہ قرار دیا گیا کہ فرد کو قومی ریاست کا بہترین خادم بنایا جائے ۔ گویا قوم پرست تعلیم یا وطن پرست تعلیم فرد کو قومی ریاست میں گم کر دیتی ہے اور اس کی تمام وفاداریوں کو قومی ریاست کے لیے مخصوص کر دیتی ہے ۔ قومی ریاست یا مفاد اس کے لیے معیار قرار پاتا ہے ، صحیح یا غلط ، قومی ریاست کا مفاد جس بات میں ہو وہی اس کے عمل کی بنیاد ہو گی ۔

قوم پرست تعلیم کے نظریے میں دو بڑی قباحتیں ہیں ۔ اول یہ کہ اس میں فرد کی آزادی سلب ہو جاتی ہے ، دوسرے یہ کہ اس سے قومی اور وطنی تعصب اور تنگ نظری پیدا ہوتی ہے ، جو عالمی امن کے لیے زہر قاتل ہے ۔

انفرادیت اور اجتماعیت میں ہم آہنگی کی ضرورت

انفرادیت پسند تعلیم اور قوم پرست تعلیم میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے ۔ یہ تعلیم کے مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتا ۔ تعلیم فرد کی متوازن نشو و نما کا نام ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ انفرادیت اور اجتماعیت دونوں کے تقاضوں میں توازن قائم رکھا جائے ۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ ماننا چاہیے کہ ہر انسان آزاد شخصیت کا مالک ہوتا ہے اور اس کی اسی شخصیت کو انا یا خودی کا نام دیا جاتا ہے ۔ انسانیت کا تقاضا ہے کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے اس خودی کی بقا اور نشو و نما کا انتظام کیا جائے ۔

انفرادیت کی اس حفاظت اور نشو و نما کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ضروری ہے کہ فرد اجتماعیت کے تقاضوں کا لحاظ رکھے ۔ دراصل فرد

معاشرے کا ایک رکن ہے اور اپنی فطری معاشرت پسندی کی وجہ سے تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔ علامہ اقبالؒ فرد کی شخصی آزادی اور نشو و نما کے زبردست حامی ہیں۔ اس کے باوجود وہ فرد کے لیے لازم قرار دیتے ہیں کہ وہ معاشرے کے ساتھ منسلک رہے۔ دراصل فرد اور معاشرہ لازم و ملزوم ہیں۔ معاشرہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے اور افراد معاشرے ہی میں عزت و احترام حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لیے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ تعلیم میں ان دونوں پہلوؤں کے درمیان توازن قائم رکھا جائے۔ اسلامی تصور تعلیم میں اس امر کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

اسلامی تصور تعلیم

اسلام انسان کو ایک باشعور مخلوق قرار دیتا ہے اور ہر فرد کو اس کی استطاعت کے مطابق عمل کا ذمے دار ٹھہراتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی تصور تعلیم میں فرد کی تربیت کو اہم حیثیت حاصل ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسلام زندگی کے ہر شعبے میں اجتماعیت پر زور دیتا ہے۔ عبادات تک میں اجتماعی روح کارفرما ہوتی ہے۔ بغیر عذر کے نماز باجماعت کا چھوڑنا سخت گناہ ہے۔ روزہ بظاہر انفرادی عبادت ہے لیکن اس میں بھی روزوں کا زمانہ اور سحری و افطار کے اوقات مقرر ہونے کی وجہ سے اجتماعی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ زکواۃ کا نظام حکومت کی زیر نگرانی ہونا چاہیے۔ اگر اسلامی حکومت قائم نہ ہونے کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکے تو بھی انفرادی طور سے زکواۃ ادا کرنے والے کے سامنے رضائے الہیٰ کے حصول کے ساتھ ساتھ زکواۃ کی معاشرتی مصلحتیں بھی ہوتی ہیں۔ حج تو سراسر اجتماعی عبادت ہے۔ عام معاشرتی زندگی میں نظام خاندان سے لے کر نظام مملکت تک تمام امور اجتماعی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلام ان کے قیام پر بڑا زور دیتا ہے اور اس مقصد کے لیے فرد پر ضروری پابندی بھی عائد کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک انتشار معاشرتی ہو یا سیاسی انتہائی ناپسندیدہ ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم فرد اور معاشرہ دونوں میں توازن قائم

کرتی ہے۔ فرد کی صلاحیتوں کو پوری نشو و نما کے مواقع فراہم کرتی ہے تا کہ وہ ایک آزاد شخصیت کا امین بن سکے اور قرآن حکیم کی شکل میں جو ہدایت اس کے سپرد کی گئی ہے اس کا حق ادا کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ فرد اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے جد و جہد کرے اور اس کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار رہے۔ اس میں اپنی جان کی قربانی تک شامل ہے جسے اسلام کی اصطلاح میں شہادت کا نام دیا جاتا ہے۔ شہادت کا مطلب ہے گواہی گویا اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے قربانی دینے والا اپنے عمل سے اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی آقا، حاکم، مالک اور معبود نہیں۔ دراصل اسلامی تصور کے مطابق تعلیم فرد اور معاشرے کو اسی شہادت حق کے لیے تیار کرنے کا نام ہے۔ اس تصور میں نہ تو فرد کو معاشرے پر کوئی فوقیت حاصل ہے نہ معاشرے کو فرد پر بلکہ دونوں اس حق کے تابع ہیں جس کا سرچشمہ خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔

علم التعلیم کا دائرۂ عمل

تعلیم کی ایک حیثیت یہ ہے کہ یہ معاشرے میں فرد کی نشو و نما کا عمل ہے۔ اب تک اسی حیثیت سے اس کے دائرہ عمل کا جائزہ اوپر پیش کیا گیا ہے۔ اب ایک علم کی حیثیت سے بھی اس کا مفہوم سمجھ لینا چاہیے۔ ایک علم کی حیثیت سے تعلیم ان تمام امور و مسائل اور ذرائع و وسائل اور معلومات و تصورات پر مشتمل ہے جن کا تعلق عمل تعلیم سے ہو۔ اس میں تعلیم کے مختلف نظریات، تعلّم، تدریس اور نصاب تعلیم کے متعلق مباحث، تعلیمی اداروں کے نظم و نسق اور تعلیمی تحقیق اور تعلیمی منصوبہ بندی سب کا جائزہ شامل ہو گا۔

علم التعلیم کے دائرۂ عمل کے سلسلے میں بعض اوقات یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سائنس ہے یا آرٹ۔ یہاں سائنس اور آرٹ کا مفہوم سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ سائنس سے مراد علم کا ایک منظم و مربوط ذخیرہ لیا جاتا ہے۔ جس علم کے اجزا میں باہم ربط و نظم ضروری نہ ہو

وہ سائنس نہیں ۔ اس مفہوم کے اعتبار سے علم التعلیم کو ایک سائنس کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا ذخیرہ علم مربوط و منظم ہے ۔ علم التعلیم کے تعلیمی نفسیات ، نصاب سازی ، طریقہ ہائے تدریس ، نظام امتحانات جیسے شعبوں کا ذخیرۂ علم باقاعدہ سائنسی تحقیقات پر مبنی ہے ۔

آرٹ وہ فن یا سرگرمی ہے جس میں واضح مقصد کے تحت حالات و واقعات میں مداخلت کر کے حسب منشا تبدیلی لانے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ سائنس کے مقابلے میں آرٹ کا انحصار حقائق کے بجائے زیادہ تر جمالیاتی حس اور فنی مہارت پر ہوتا ہے ۔ اس اعتبار سے علم التعلیم ایک آرٹ بھی ہے کیونکہ اس میں بچے کی نشو و نما کے سلسلے میں واضح مقصد کے تحت حالات و واقعات میں تصرف کیا جاتا ہے ۔ گویا تعلیم سائنس بھی ہے اور آرٹ بھی ۔ تعلّم اور تدریس علم التعلیم کے دو انتہائی اہم موضوع ہیں ۔ تدریس کی کامیابی کا انحصار تعلّم کے متعلق صحیح نظریات و تصورات پر ہوتا ہے ۔ یہ نظریات و تصورات تعلیمی نفسیات ، اطلاقی نفسیات ، عمرانیات اور ایسی ہی دوسری سائنسوں سے حاصل ہوتے ہیں ۔ عمل تدریس میں ان کا استعمال فنی حیثیت رکھتا ہے ۔ لہذا عمل تدریس ایک آرٹ ہے ۔ اس اعتبار سے ایک اچھے استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ سائنسدان بھی ہو اور ماہر فن بھی ۔

سوالات

۱ ۔ تعلیم کی ضرورت و اہمیت پر مختصر نوٹ لکھیے ۔

۲ ۔ قدیم و جدید فلسفیوں کی آرا کی روشنی میں تعلیم کا مفہوم بیان کیجیے ۔

۳ ۔ متعلم ، معاشرہ اور تعلیم کے باہمی تعلق کو مثالوں سے واضح کیجیے ۔

۴ ۔ آپ کے خیال میں تعلیم کے عمل میں متعلم اور معلم میں سے کون زیادہ اہم ہے اور کیوں ؟

۵ - تعلیم اور تدریس میں کیا فرق ہے ؟ مثالوں سے واضح کیجیے -

۶ - تعلیم کے عناصر کون کون سے ہیں ؟ ان میں سے کون سا عنصر سب سے اہم ہے اور کیوں ؟

۷ - اسلامی تصور تعلیم انفرادیت پسند ہے یا قوم پرست ؟ مثالوں سے واضح کیجیے -

۸ - تعلیم اور علم التعلیم میں کیا فرق ہے ؟ مثالوں سے واضح کیجیے -

۹ - علم التعلیم سائنس ہے یا آرٹ ؟ مثالوں سے واضح کیجیے -

دوسرا باب

تعلیم اور نظریۂ پاکستان

تعلیم اور نظریۂ حیات

فرد ہو یا معاشرہ ، اس کی عظمت اور کامیابی کا انحصار اس کے نظریۂ حیات پر ہوتا ہے ۔ ایسا فرد یا معاشرہ جو زندگی کے متعلق کوئی واضح نظریہ نہ رکھتا ہو ، ایسے مسافر کی طرح ہے جو منزل کا کوئی تصور نہ رکھتا ہو اور یونہی چلا جا رہا ہو ۔ ایسا فرد یا معاشرہ قطعاً اعتبار کے قابل نہیں ہوتا ۔ جس طرح نظریۂ حیات فرد یا معاشرے کے طرز حیات پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح طرز تعلیم کو بھی متاثر کرتا ہےچونکہ تعلیم زندگی کا ایک شعبہ ہے بلکہ ایک اعتبار سے تعلیم پوری زندگی پر حاوی ہے ۔ زندگی سے تعلق کی وجہ سے نظریۂ حیات اور تعلیم ایک دوسرے سے براہ راست منسلک ہیں ۔ چنانچہ ایک جدید فلسفی کا قول ہے کہ ''ہم جو بھی عقائد اور جو بھی وفاداریاں رکھتے ہیں ، ان سے ہماری تدریس کا مواد اور طریقہ متعین ہوتا ہے'' ۔

نظریۂ حیات کے تعلیم پر اثرات کو سمجھنے کے لیے ایک آمر اور ایک جمہوری لیڈر کی مثال دی جا سکتی ہے ۔ جمہوری نظریۂ حیات کے مطابق قوت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں لہٰذا وہ ان کی رائے کا احترام کرتا ہے ۔ اس کے برعکس آمرانہ نظریۂ حیات میں لیڈر کو کلی اختیارات کا حامل قرار دیا جاتا ہے ۔ لہٰذا لیڈر اسے اپنا حق سمجھتا ہے کہ عوام آنکھیں بند کرکے اس کے فیصلوں کی پابندی کریں ۔ یہ دونوں نظریات باہم متضاد ہیں اور جدا جدا طرز تعلیم کا تقاضا کرتے ہیں ۔ جمہوری نظریۂ حیات میں افراد کی تعلیم کا انداز ایسا ہو گا جس میں افراد کو آزادانہ فیصلوں کا اہل بنایا جا سکے

اس کے برعکس آمرانہ نظریۂ حیات ایسے طرز تعلیم کا متقاضی ہے جس میں افراد کو لیڈر کی بلا چون و چرا اطاعت کے لیے تیار کیا جا سکے۔ جرمنی کا آمر ہٹلر تو عام تعلیم کو زہر قرار دیتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ ”میں اپنے نوجوانوں کے لیے کوئی ذہنی تربیت نہیں چاہتا۔ علم میرے نوجوانوں کے لیے تباہی ہے!“

غرضیکہ نظریۂ حیات براہ راست تعلیم کے تصور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کوئی بھی معاشرہ صحیح معنوں میں اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک کہ وہ اپنے نظریہ حیات کے مطابق تعلیم کا انتظام کر کے اس نظریۂ حیات کے تسلسل کا بندوبست کرے۔ اگر تصور تعلیم اور نظریۂ حیات میں مطابقت نہ ہوگی تو بالآخر معاشرے میں داخلی تصادم شروع ہو جائے گا۔ جس سے یا تو معاشرہ بالکل بدل جائے گا یا انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ تعلیم اور نظریۂ حیات کے اس گہرے تعلق کا تقاضا ہے کہ پاکستان میں تعلیم کے نظام کے سلسلے میں پاکستان کے بنیادی نظریۂ حیات کو سامنے رکھا جائے کیونکہ اس کے بغیر پاکستان کا وجود تک خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

نظریۂ پاکستان کی وضاحت

نظریۂ پاکستان کو صحیح طور سے سمجھنے کے لیے قیام پاکستان کی تحریک پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ پاکستان 14 اگست 1947ء کو وجود میں آیا۔ یہ برصغیر پاک و ہند کے ان حصوں میں قائم ہوا جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ مسلمانوں نے پورے برصغیر پر سات آٹھ سو سال تک حکومت کی تھی۔ وہ باہر سے یہاں آئے تھے لیکن یہیں کے ہو رہے۔ انہوں نے اس وسیع خطۂ ارض کو ایک ایسے نظریۂ حیات سے متعارف کرایا جس کی اساس اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر تھی۔ یہ خطہ کفر و شرک کی تاریکیوں میں گم تھا، مسلمانوں نے اسے اسلام کی روشنی سے منور کیا۔

مسلمانوں کی تبلیغ کے زیر اثر ہندوستان کے بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ حتیٰ کہ برصغیر میں مسلمانوں کی تعداد

کروڑوں تک پہنچ گئی۔ اس کے باوجود یہاں کے بہت سے لوگوں نے کفر ہی پر اصرار کیا۔ برصغیر میں ان کی مجموعی تعداد مسلمانوں سے چار گنا تھی۔ ان کی کوشش ہمیشہ یہ رہی کہ مسلمان ہندو تہذیب میں جذب ہو جائیں یا ختم ہو جائیں۔ مسلمانوں کو اپنی برتر تہذیب کا احساس تھا جو اسلامی نظریۂ حیات پر مبنی تھی، لہٰذا انہوں نے ہمیشہ اپنی جداگانہ حیثیت برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ اس طرح شروع ہی سے برصغیر پاکستان و ہند میں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں کشمکش جاری رہی۔

اس کشمکش کی تہہ میں دراصل یہ اصول کام کر رہا تھا کہ نظریۂ حیات کے اختلاف کی بنا پر دنیا کے لوگ ہمیشہ دو قوموں میں تقسیم رہے ہیں۔ ایک ملت اسلامیہ جو اسلامی نظریۂ حیات کے ماننے والوں پر مشتمل ہے، دوسری ملت کفر جو اسلامی نظریۂ حیات کے منکرین پر مشتمل ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کے دور حکمرانی میں ان دونوں قوموں کی کشمکش بہت کم منظرعام پر آ سکی کیونکہ مسلمانوں نے غیر مسلموں سے انتہائی رواداری کا سلوک کیا لیکن برصغیر میں مسلمانوں کے دور زوال کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو شاید ہی کوئی سازش ایسی ہو جس کی تہہ میں غیر مسلموں کا ہاتھ کام نہ کر رہا ہو۔

مسلمانوں پر زوال آیا تو باہر سے آکر انگریز برصغیر پر قابض ہو گئے۔ یہ انیسویں صدی کا زمانہ تھا۔ ہندوستانی قوموں نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی جدوجہد شروع کی تو مسلمانوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ برصغیر کے غیر مسلموں میں سے ہندو بھی اس جدوجہد میں شریک تھے۔ انہوں نے آزادی وطن کی اس جدوجہد کو وطن پرستی کی شکل دے دی۔ وطن پرستی کی بنیاد پر انہوں نے واحد ہندوستانی قومیت کا نظریہ پیش کیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ برصغیر کے تمام لوگ ایک قوم ہیں۔ دراصل اس نظریے کے ذریعے ہندو ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ کروڑوں مسلمانوں کی

قومی انفرادیت اور امتیاز کا خاتمہ اور ہندوستانی قوموں کی متحدہ قوت کے بل پر انگریزوں سے آزادی۔ اس کے نتیجے کے طور سے انگریزوں کے جانے پر اکثریت میں ہونے کی وجہ سے حکومت پر قبضہ ہندوؤں کا ہوتا۔

مسلمان رہنماؤں نے ہندوؤں کے ارادوں کو بھانپ لیا۔ وہ سمجھ گئے کہ ہندو آزادیٔ ہند کی آڑ میں ہندو راج قائم کر کے مسلمانوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو منظم کیا اور انگریزوں سے آزادی کے ساتھ ساتھ اپنے لیے علیحدہ مملکت کے حصول کی جدوجہد شروع کر دی۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں بالآخر پاکستان وجود میں آیا۔ یہ دراصل برصغیر میں مسلمان قوم کے وجود کے تحفظ کی جدوجہد تھی۔ اس اعتبار سے یہ اس طویل جدوجہد کا حصہ تھی جو مسلمانوں کی برصغیر پاکستان و ہند میں آمد کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے پہلے روز سے برصغیر کے کافروں کی کوشش یہ رہی کہ مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے اور مسلمانوں کو مسلسل یہ کوشش کرنی پڑی کہ اپنا وجود برقرار رکھیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی کشمکش کی بنیاد نظریاتی اختلاف تھا۔ مسلمان اسلامی نظریۂ حیات پر ایمان رکھتے تھے۔ یہی ایمان نظریۂ پاکستان کی بنیاد اور تحریک پاکستان کا محرک تھا۔ چنانچہ تحریک پاکستان کے دور عروج میں بچے، بوڑھے، عالم، جاہل ہر مسلمان کا نعرہ یہ تھا۔

پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ

گویا نظریۂ پاکستان کا مرکز و محور کلمہ طیبہ لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللہ تھا لہٰذا نظریۂ پاکستان کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے اس کلمے کا صحیح مفہوم سمجھنا ضروری ہے۔

کلمۂ طیبہ کلمہ توحید ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود یعنی کوئی آقا، مالک اور حکمران نہیں۔ بنی نوع انسان کو صرف اسی کے قانون یعنی قرآن حکیم کی پابندی کرنی

چاہیے اور اپنی زندگیوں کو اس نمونے کے مطابق ڈھالنا چاہیے جو اس کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے پیش فرمایا۔ جو لوگ اس معیار کو مان کر اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالنے کا عہد کرتے ہیں وہ مسلمان ہیں۔ جو اس کے منکر ہیں وہ کافر ہیں۔ اس طرح پوری نوع انسانی دو قوموں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک امت مسلمہ، ملت اسلامیہ یا مسلمان قوم اور دوسری ملت کفر۔ یہی دو قومی نظریہ برصغیر میں تحریک پاکستان کی بنیاد بنا۔

دو قومی نظریے کا مطلب یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمان اور ہندو نظریۂ حیات کے اختلاف کی وجہ سے دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں۔ سرسید نے ایک دفعہ طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں کیونکہ یہی مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہے۔ جب تک وہ اپنے مذہب پر سختی سے عمل کریں گے ایک قوم رہیں گے۔ گویا اسلام کو چھوڑ کر مسلمان اپنا قومی وجود کھو دیتا ہے۔ چنانچہ جدوجہد آزادی کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ "آزادی" سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقت ور بن جائیں"۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے مسلمانوں کی آزاد ریاست کے قیام پر زور دیا اور فرمایا کہ "اسلام کے ایک تمدنی قوت کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک مخصوص علاقے میں اس کی مرکزیت قائم ہو۔" علامہ نے واضح کر دیا تھا کہ مسلمانوں کی قومیت کا انحصار ان کے دین پر ہے۔ وطن، نسل یا زبان ان کی قومیت کی بنیاد نہیں چنانچہ فرماتے ہیں "مسلمانوں اور دیگر اقوام عالم میں امتیازی فرق یہ ہے کہ اسلام کا تصور قومیت نہ وطنی ہے نہ لسانی نہ نسلی۔" علامہ کا سارا کلام اس تصور قومیت کی وضاحت سے بھرا پڑا ہے۔ یہی تصور نظریۂ پاکستان کی بنیاد تھا۔

بانیٔ پاکستان قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بھی نظریۂ پاکستان کا یہی تصور تھا۔ وہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت میں یقین

رکھتے تھے ۔ ایک موقع پر انھوں نے فرمایا تھا ''ہم مذہب میں مختلف ہیں ، تہذیب و تمدن میں مختلف ہیں ، تاریخ میں ، زبان میں ، طرز تعمیر میں ، موسیقی میں، قانون اور اصول قانون میں، کھانے پینے میں ، معاشرت میں ، لباس میں ، غرض ہر چیز میں ان (ہندوؤں) سے مختلف ہیں ـــــ مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلافات ایسے بنیادی اختلافات ہیں کہ زندگی کا کوئی معاملہ جو کچھ بھی اہمیت رکھتا ہے ۔ ایسا نہیں ہے جس میں ان کے ہمارے درمیان اتفاق ہو۔'' ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا ''ہم ایک علیحدہ قوم ہیں جن کے پاس اپنا خاص تہذیب و تمدن ، زبان، فنون لطیفہ ، عدالتی قانون اور ضابطۂ اخلاق ، رواج ، سن تاریخ ، روایات ، رجحانات اور امنگیں موجود ہیں ۔ مختصر یہ کہ زندگی اور اس کے متعلق ہم ایک خاص تصور رکھتے ہیں اور بین الاقوامی قانون کے تمام اصولوں کے مطابق ہم ایک علیحدہ قوم ہیں ۔'' قیام پاکستان کا مقصد واضح فرماتے ہوئے آپ نے متعدد بار اس بات پر زور دیا کہ ہمارا مقصد ایسی مملکت کا قیام ہے جہاں ہم اپنے ضابطۂ حیات ، تہذیبی ارتقا اور اسلامی قانون کے مطابق حکمرانی کر سکیں ۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا تھا کہ ''قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں ۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے ۔''

نظریۂ پاکستان کے عناصر

اوپر کی بحث سے آپ نظریۂ پاکستان کا مفہوم سمجھ گئے ہونگے۔ اس میں درج ذیل تصورات کو خاص طور سے سامنے رکھیں ۔

۱ ۔ پوری نوع انسانی دو قوموں میں منقسم ہے : ملت اسلامیہ اور ملت کفر ۔

۲ ۔ اسلامی نظریۂ حیات پر ایمان رکھنے والے لوگ ملت اسلامیہ کا حصہ ہیں خواہ وہ کسی بھی علاقے یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ بالکل اسی طرح ملت کفر ان تمام لوگوں پر مشتمل ہے جو اسلام کے منکر ہوں ۔

۳ - بر صغیر پاکستان و ہند کے مسلمان ملت اسلامیہ کا حصہ ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کے ہم وطن ہونے کے باوجود ان سے علیحدہ قوم تھے - ہندوؤں کا متحدہ قومیت کا نظریہ بے بنیاد تھا کیونکہ مسلمان اور ہندو تہذیب و تمدن، قانون و اخلاق، تاریخ و روایات اور رجحانات و عزائم کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل متضاد نقطہ نظر رکھتے ہیں -

۴ - بر صغیر کے مسلمان انگریزوں اور ہندوؤں دونوں سے آزادی چاہتے تھے -

۵ - آزادی کے حصول کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کی حکمرانی قائم کی جائے -

۶ - اسلام کی حکمرانی سے مراد یہ تھی کہ معاشرے کا اجتماعی نظام قرآنی اصولوں کے مطابق منظم کیا جائے -

۷ - اسلامی اصولوں کے مطابق اجتماعی نظام قائم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ کسی علاقے میں مسلمانوں کی خود مختار ریاست قائم ہو -

۸ - پاکستان کے حصول کا مقصد یہی تھا کہ یہاں خلافت راشدہ کی طرز پر آزاد و خود مختار اسلامی ریاست قائم کی جائے -

نظریہ پاکستان کے تقاضے

نظریہ پاکستان کی تاریخ ، اس کے مفہوم اور عناصر کی روشنی میں اس کے تقاضوں کا سمجھنا آپ کے لیے کچھ مشکل نہیں - آپ کہہ سکتے ہیں کہ نظریہ پاکستان کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کا مرکز و محور بنایا جائے اور اس کی بنیاد پر اس آزاد ملک میں اسلامی نظام حیات کا قیام عمل میں لایا جائے - اس کی تفصیل حسب ذیل ہے -

سیاسی تقاضے :

نظریہ پاکستان کا سیاسی تقاضا یہ ہے کہ پاکستان میں سیاسی نظام کو اسلامی اصولوں کے مطابق قائم کیا جائے - اس میں بنیادی

بات یہ ہے کہ پوری کائنات کے حاکم یعنی اللہ تعالیٰ کو حاکم اعلیٰ تصور کیا جائے اور اس کے قانون کو ملک میں نافذ کیا جائے۔ یہ قانون قرآن حکیم اور سنت رسول کی شکل میں موجود ہے۔ اسلامی مملکت کو خدا کے نائب کی حیثیت سے خلافت کا نظام قائم کرنا چاہیے۔ خلافت کے نظام میں حکومت کسی خاص فرد، گروہ یا برادری کا حق نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے پاس اللہ کی امانت ہے۔ مسلمانوں کو مشورے سے اپنی حکومت قائم کرنی چاہیے اور قرآن و سنت کی حدود میں رہتے ہوئے تفصیلی قوانین بھی مشورے سے بنانے چاہئیں۔ گویا پاکستان کا سیاسی نظام اسلامی جمہوری نظام ہونا چاہیے۔ اس نظام میں حکومت عوام کی خادم ہو گی، ان کی بھلائی کے لیے کام کرے گی۔ عوام کو بنیادی حقوق کا تحفظ حاصل ہو گا۔ حکومت عوام میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور تعلیم کے فروغ کا انتظام کرے گی، معاشرے میں عدل و انصاف کی فضا قائم کرے گی۔ عوام کا بھی فرض ہو گا کہ ان تمام امور میں حکومت سے تعاون کریں۔ قرآن و سنت کی حدود میں اسلامی حکومت کی اطاعت عوام پر فرض ہو گی۔

معاشرتی تقاضے

نظریۂ پاکستان کا تقاضا ہے کہ پاکستان میں وحدت انسانی کو معاشرتی نظام کی بنیاد قرار دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہونے کی وجہ سے ایک نسل ہیں اور انسان ہونے کی وجہ سے برابر ہیں۔ رنگ، قبیلے، زبان یا علاقے کے امتیازات کی وجہ سے کسی کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں۔ اصل چیز انسان کا اپنا کردار ہے۔ اسی کی بنیاد پر وہ معاشرے میں عزت حاصل کر سکتا ہے اور کردار میں ایمان اور تقویٰ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

اسلامی معاشرتی نظام کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ باہمی انسانی تعلقات کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں استوار کیا جائے۔ اس میں پہلی بات یہ ہے کہ مرد و زن کے باہمی تعلقات کی صرف ان صورتوں

کو جائز رکھا جائے، جنھیں اسلام جائز قرار دیتا ہے۔ مرد و زن میں مساوات قائم کی جائے اور ہر ایک کو اس کے معاشرتی فرائض ادا کرنے کے لیے مناسب تربیت دی جائے۔ والدین، رشتہ داروں، ہمسایوں، دوستوں اور محتاجوں کے ساتھ حسن سلوک کی فضا پیدا کی جائے اور غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کا انتظام کیا جائے۔

معاشی تقاضے

نظریہٴ پاکستان کا معاشی تقاضا ہے کہ پاکستان کو ایک ایسی فلاحی ریاست بنایا جائے جس میں عوام کی بنیادی ضروریات یعنی روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور علاج کی فراہمی حکومت کے ذمے ہو۔ عوام کو حلال طریقوں سے روزی کمانے اور مال و دولت جمع اور خرچ کرنے کا حق ہو۔ زکواۃ اور وراثت کے قوانین کے نفاذ سے معاشرے میں مال و دولت کی گردش کا بندوبست کیا جائے۔ اسلام کے معاشی نظام میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دولت کو دنیا کی متاع سمجھا جائے اور اسے آخرت کی فلاح کے لیے قربان کیا جائے۔

اخلاقی تقاضے

نظریہٴ پاکستان کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو انفرادی و اجتماعی طرز عمل کی بنیاد قرار دیا جائے۔ ایسے تمام اعمال کو فروغ دیا جائے جو رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دیں اور ایسے تمام اعمال کی حوصلہ شکنی کی جائے جو اس راستے میں حائل ہوں۔ اس اعتبار سے خوف خدا، اطاعت خدا و رسول، والدین، رشتہ داروں ہمسایوں، محتاجوں اور تمام لوگوں سے حسن سلوک، توکل، خدا کی راہ میں جہاد اور استقامت، حق گوئی، غیرت، حمیت اور آزادی جیسے نیک اخلاق کو فروغ دینا اور خود غرضی، لالچ، بزدلی، غیر اللہ کا خوف، جھوٹ، چوری، جوا جیسے برے اخلاق کا سد باب کرنا نظریہٴ پاکستان کا اخلاقی تقاضا ہے۔

روحانی تقاضے

روحانیت کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خالص تعلق قائم

کیا جائے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس تعلق کو قائم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اطاعت کا محرک صرف جذبہ اخلاق ہو یعنی ہر عمل میں اللہ کی رضا مقصود ہو۔ اسلام روحانیت کے لیے سخت قسم کی ریاضت یا مجاہدے کو ضروری نہیں سمجھتا اور دنیا ترک کرنے کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں رہتے ہوئے دنیاوی کاموں کو اس طرح انجام دے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اس کے پیش نظر ہو۔ نظریۂ پاکستان کا تقاضا ہے کہ پاکستان میں اس قسم کی روحانی فضا پیدا کی جائے۔

قومی تقاضے

پاکستان اسلامی نظریۂ قومیت کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا۔ پاکستان کی قومی حیات کا تقاضا ہے کہ اس نظریے کا پورا پورا تحفظ کیا جائے۔ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مسلمانوں کی ایک قومی مملکت کی حیثیت سے پاکستان کی سالمیت کی حفاظت کی جائے۔ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے۔ اس کی ایک ایک انچ زمین کی حفاظت اسی طرح ضروری ہے جس طرح مسجد کی حفاظت کی جاتی ہے۔

بین الاقوامی تقاضے

نظریۂ پاکستان کا تقاضا ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور امن عالم کے اصولوں پر مبنی ہو۔ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ان کی مختلف مملکتوں کے درمیان بھائی چارے کا تعلق ہونا چاہیے۔ مزید برآں ایک اسلامی مملکت کی حیثیت سے پاکستان کو پوری دنیا میں فتنہ و فساد ختم کر کے امن و انصاف کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اقوام عالم کے ساتھ پاکستان کو انھی بنیادوں پر اپنے باہمی تعلقات استوار کرنے چاہییں اور معاہدوں کا پاس کرنا چاہیے۔

تعلیمی تقاضے

نظریۂ پاکستان کا تقاضا ہے کہ پاکستان کا تعلیمی نظام اسلامی

نظریے کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ نظریۂ پاکستان یا اسلامی نظریۂ حیات تعلیم کے متعلق بھی مخصوص نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو انسان کو اللہ کی معرفت اور رضا کے حصول میں مدد دے۔ اس میں اطاعت خدا و رسول کا رویہ پیدا کرے اور اللہ کے نائب کی حیثیت سے اسے دنیا میں حکمرانی کرنے کے قابل بنائے۔ نظریۂ پاکستان کا تقاضا ہے کہ پاکستانی نظام تعلیم کو انھی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔

سوالات

۱ - نظریۂ حیات اور تعلیم میں کیا تعلق ہے؟ مثالوں سے واضح کیجیے۔

۲ - ہندوؤں کا نقطۂ نظر تھا کہ بر صغیر پاکستان و ہند میں بسنے والے سب لوگ ایک قوم ہیں۔ آپ کی رائے میں یہ نقطۂ نظر کہاں تک درست ہے اور کیوں؟

۳ - دو قومی نظریے سے کیا مراد ہے؟ مسلمان لیڈروں کی آرا کے حوالے سے وضاحت کیجیے۔

۴ - نظریۂ پاکستان کا مفہوم بیان کیجیے اور اس کے مختلف عناصر کی نشان دہی کیجیے۔

۵ - نظریۂ پاکستان کے مختلف تقاضوں کی نشان دہی کیجیے۔ ان کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ مثالوں سے واضح کیجیے۔

۶ - نظریۂ پاکستان کے قومی اور بین الاقوامی تقاضوں میں کس طرح توازن قائم کیا جا سکتا ہے؟

تیسرا باب

قومی مقاصدِ تعلیم

نظریہٴ حیات اور مقاصد تعلیم

کسی بھی ملک یا قوم میں مقاصد تعلیم کے تعین کا انحصار اس ملک یا قوم کے اساسی نظریہٴ حیات پر ہوتا ہے۔ تعلیم سے نظریہٴ حیات کے تعلق کے بارے میں آپ تفصیل سے پڑھ چکے ہیں۔ یہ بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ جیسا کسی قوم کا نظریہٴ حیات ہو گا ویسی ہی اس کی تعلیم ہو گی۔ دراصل زندگی کے متعلق نظریہ ہی یہ طے کرتا ہے کہ کسی قوم کے لیے کیا موزوں ہے۔

اقدار ہی مقاصد تعلیم کا سرچشمہ ہوتی ہیں۔ چونکہ زندگی کے متعلق نقطہٴ نظر کے اختلاف کی وجہ سے اقدار مختلف ہو جاتی ہیں لہٰذا نظریہٴ حیات کے فرق کی وجہ سے مقاصد تعلیم بھی بدل جاتے ہیں۔ مثال کے طور سے اسلامی نظریہٴ حیات میں آخرت کی فلاح کا حصول ایک بنیادی قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا اسلامی نظام تعلیم میں طلبہ کو آخرت کی فلاح کے لیے آمادہٴ عمل کرنا ایک مقصد تعلیم ہوگا۔ لیکن اشتراکی یا دوسرے لا دین فلسفے جو سرے سے آخرت کی زندگی کے قائل ہی نہیں اور صرف اس مادی دنیا ہی کو اول و آخر مقصود سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک دنیا میں مادی خوشحالی کو سب سے بڑی قدر کی حیثیت حاصل ہوگی، چنانچہ امریکہ میں جہاں مذہب کو تعلیم سے علیحدہ قرار دے دیا گیا ہے فرد کی معاشی اہلیت (Economic Efficiency) کو ایک قومی مقصد قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی نقطہٴ نظر سے [illegible] پورا کرنا ایک ضروری قدر ہے لہٰذا اسلامی معاشرے میں طلبہ [illegible] ایفائے عہد کی صفت کی نشو و نما ایک لازمی مقصد تعلیم ہو گا

مادیت پرست فلسفیوں اور اشتراکی مفکرین کے نزدیک ایفائے عہد کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ قومی ضرورتوں کے تحت ہر قسم کے دھوکے، فریب اور مکاری و عیاری کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ غرض یہ کہ مقاصد تعلیم کے تعین کا انحصار براہ راست اقدار حیات سے ہے اور اقدار حیات نظریۂ حیات سے جنم لیتی ہیں۔

نظریۂ پاکستان اور اقدار حیات

پاکستان کے قومی نظریۂ حیات یا نظریۂ پاکستان کی حقیقت اور اس کے تقاضوں پر مفصل بحث پہلے گذر چکی ہے۔ اس کی روشنی میں پاکستانی قوم کے لیے اقدار حیات کی ایک فہرست بنائی جا سکتی ہے۔ اس سے قبل اقدار حیات کے معاملے میں چند بنیادی سوالات کے جواب ذہن نشین کر لینے چاہییں۔ مثلاً مختلف اقدار کی اساسی قدر (Root value) کیا ہے؟ اقدار حیات مستقل ہوتی ہیں یا بدلتی رہتی ہیں۔ ان کا تعلق تمام افراد سے یکساں ہوتا ہے یا مختلف افراد کے لیے اقدار مختلف ہوتی ہیں؟ مختلف فلسفے ان سوالوں کا مختلف جواب دیتے ہیں۔ جدید لا دینی فلسفوں میں بالعموم کسی قدر کو مستقل قرار نہیں دیا جاتا بلکہ فوری مفادات کے لیے جو طرز فکر یا طرز عمل مفید ہو وہ اس خاص موقع کے لیے قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح ہر فرد کی اقدار دوسرے سے مختلف ہو جاتی ہیں جس سے انارکی کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ بعض فلسفوں میں اچھے معاشرتی روابط کو اساسی قدر قرار دے کر انارکی کے اس رجحان کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

نظریۂ پاکستان یعنی اسلامی نقطۂ نظر سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کو بنیادی قدر کی حیثیت حاصل ہے، باقی تمام اقدار اس سے جنم لیتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے طرز فکر اور طرز عمل کا کوئی معاملہ اس وقت تک پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ اس کا مقصود رضائے الٰہی کا حصول نہ ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ رضائے الٰہی کے نام پر کوئی شخص جو چاہے کرتا

ہورے ، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے اقدار کے ساتھ ساتھ ان کے حصول کے ذرائع کا صالح اور جائز ہونا بھی ضروری قرار دیا ہے اور اس کی حدود بھی بیان کر دی ہیں ۔ رضائے الٰہی کو بھی یونہی مبہم نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ بتا دیا گیا ہے کہ اللہ کی رضا کن باتوں میں ہے اور ناراضی کن باتوں میں ۔ دراصل رضائے الٰہی کا حصول ایک ایسی قدر ہے جس کا براہ راست تعلق انسان کی نیت سے ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طرز فکر یا طرز عمل کے تمام معاملات میں پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ نیت میں اخلاص ہو ۔ اس کے بغیر کوئی اچھے سے اچھا عمل بھی پسندیدہ یا مقبول نہیں ہو سکتا ۔ مثلاً مصیبت زدہ کی مدد کرنا ایک اچھی قدر ہے ۔ اسلام بھی اسے پسندیدہ اقدار میں شمار کرتا ہے ۔ لیکن اگر یہ اسلام کی بنیادی قدر ''رضائے الٰہی کے حصول'' سے ہٹ جائے یعنی مدد کرنے والے کی غرض کچھ اور ہو جیسے شہرت یا مقبولیت حاصل کرنا تو اسلامی نقطہ نظر سے اس کا یہ عمل قدر شمار نہیں ہو گا ۔

اس بحث سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ریاکاری انتہائی ناپسندیدہ عمل ہوگا ۔ ریا کا مطلب ہے دکھاوا یعنی رضائے الٰہی کے بجائے محض دکھاوے کے لیے کوئی عمل کیا جائے ۔ شریعت میں اس کی بڑی مذمت بیان ہوئی ہے ۔ حتیٰ کہ اسے شرک خفی یعنی چھپا ہوا شرک قرار دیا گیا ہے ۔ گویا اسلامی نقطۂ نظر سے رضائے الٰہی کے حصول کو بنیادی قدر کی حیثیت حاصل ہے اور یہ مستقل اور مطلق ہے ۔ نہ تو زمان و مکان سے اس میں کوئی فرق پڑتا ہے اور نہ ہی کسی فرد یا گروہ کے اختلاف سے اس میں کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے ۔ اس طرح فکر و عمل کے اور بھی ایسے پہلو ہیں جنہیں اسلام نے مطلوب قرار دیا ہے اور ان کے اطلاق کے پہلوؤں کی باقاعدہ وضاحت کر دی ہے ۔

قومی مقاصد تعلیم

قومی مقاصد تعلیم سے مراد وہ مقاصد ہیں جو ملکی سطح پر پورے

۹ - محنت کی عظمت کا احساس پیدا کرنا اور نوجوانوں کو مقامی سطح پر خدمت خلق کے لیے تیار کرنا ۔

انفرادی مقاصد

۱۰ - فرد کی مکمل شخصیت کی اس طرح نشو و نما کرنا کہ اس میں اس کے روحانی ، ذہنی ، جسمانی ، جذباتی ، جمالیاتی اور اخلاقی پہلو شامل ہوں ۔ اس سلسلے میں تنقیدی و تخلیقی انداز فکر ، خود اعتمادی ، تعاون ، عزت نفس ، دیانت ، احساس ذمہ داری اور حرکت و عمل کی تخلیق پر خاص زور دیا جائے گا ۔

۱۱ - نوجوانوں کو ان کی دلچسپیوں اور میلان طبع کے مطابق مفید ملازمتوں کے لیے تیار کرنا اور معاشرتی ضرورتوں کے مطابق زرعی اور ٹیکنیکل پہلوؤں سے نئی مہارتیں حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرنا ۔

بین الاقوامی مقاصد

۱۲ - بین الاقوامی شعور اور اقوام عالم کے لیے جذبہ خیر سگالی پیدا کرنا ۔

اسلامی مقاصد تعلیم

نظریہء پاکستان کی روشنی میں مقاصد تعلیم متعین کیے جائیں تو اسلامی مقاصد تعلیم اور قومی مقاصد تعلیم میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے ۔ اسلامی مقاصد تعلیم سے مراد وہ مقاصد ہیں جن کا اسلامی فلسفہ تعلیم تقاضا کرتا ہے ۔ یہ مسلمانوں کے ہر معاشرے کے لیے نظام تعلیم کی اساس بن سکتے ہیں ۔ خواہ وہ معاشرہ دنیا کے کسی بھی خطے میں قائم ہو ۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اسلامی اقدار میں رضائے الٰہی کے حصول کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔ اس اعتبار سے اسلامی مقاصد تعلیم میں اسے مرکزی حیثیت حاصل ہو گی ۔ اس میں یہ بات خود بخود شامل ہے کہ فرد مومن یعنی صاحب ایمان ہو گا ۔ کیونکہ ایمان کے بغیر رضائے الٰہی کے حصول کی کسی خواہش کا

کوئی اعتبار نہیں ۔ ایمان کا لب لباب یہ ہے کہ بندہ صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا حاکم ، آقا اور معبود سمجھے ، اس کے رسولوں کو سچا جانے اور آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے ضابطۂ حیات کو واحد ذریعۂ نجات سمجھے ، تمام آسمانی کتابوں کو سچا جانے اور قرآن حکیم کو آخری وحی مانے ، فرشتوں کو اللہ کی مطیع و فرمان بردار مخلوق تسلیم کرے ، تقدیر کو مانے اور آخرت اور جزا و سزا پر یقین رکھے ۔ ایمان میں یہ بات از خود شامل ہے کہ بندہ اللہ اور رسول کے احکام کو واجب اطاعت سمجھے اور ان کے خلاف کسی ضابطے یا قانون کو قبول نہ کرے ۔

اسلامی نقطۂ نظر سے ایمان کے بعد تقویٰ کا درجہ ہے ۔ یہ دراصل ایمان کے مطابق عمل کرنے کا نام ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ عملاً شریعت کے احکام کی پابندی کرے ۔ اوامر (جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے) کی پابندی کرے اور نواہی (جن امور سے روکا گیا ہے) سے اجتناب کرے ۔ گویا خدا و رسول کی اطاعت کا نام تقویٰ ہے اور صاحب تقویٰ شخص کو متقی کہتے ہیں ۔ اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم کا بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں میں تقویٰ پیدا کیا جائے ۔ تقویٰ سے آگے کا درجہ احسان کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اللہ کو خوش کرنے کے لیے اس کے مطلوبہ اعمال سے بھی بڑھ چڑھ کر کوشش کرے ۔ دراصل یہ اللہ کے لیے بندے کے اخلاص کی انتہائی شکل ہے ۔ اس کیفیت کا حصول صرف اس طرح ممکن ہے کہ بندہ ہر وقت یہ سمجھتا رہے کہ خدا اس کے بالکل سامنے موجود ہے اور وہ خدا کو دیکھ رہا ہے، یا کم از کم اسے یہ یقین ہو کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے ۔ اس صورت میں بندہ تہذیب نفس کی آخری منزل پر ہو گا۔ ایسے شخص کو اسلامی اصطلاح میں محسن کہتے ہیں ۔ اس کا مطلب ہے احسن یعنی بہترین طریقے پر عمل کرنے والا ۔ غرض یہ کہ اسلامی مقاصد تعلیم میں فرد کو مومن ، متقی اور محسن بنانے پر زور دیا جاتا ہے ۔ اس میں فرد کی زندگی کے وہ تمام پہلو شامل ہوتے ہیں جن کا تعلق اللہ سے ہو یا اللہ کے دوسرے بندوں سے ۔

اسلامی نقطۂ نظر سے کائنات کے ساتھ انسان کا تعلق ایک خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ انسان اللہ کے سامنے تو ایک عاجز بندے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے باقی تمام کائنات سے افضل ہے اور دنیا میں خدا کے نائب کی حیثیت سے اسے یہ حق حاصل ہے بلکہ یہ اس کے منصب کا عین تقاضا ہے کہ وہ کائنات کے وسائل و ذرائع کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرے ۔ اسلام ترک دنیا یا رہبانیت کو پسند نہیں کرتا لہٰذا کوئی ایسا مومن ، متقی ، محسن شخص اللہ کے نزدیک پسندیدہ نہیں جو گوشہ نشینی اختیار کر کے ہر وقت رسمی ذکر و افکار یا پوجا پاٹ میں مصروف رہے ۔ اللہ کے نزدیک پسندیدہ وہ شخص ہے جو دنیا کے گھمسان میں زندگی گزارے ، کائنات کے مادی وسائل کی تسخیر کرے اور اس کے باوجود دم بھر کے لیے اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو ۔ علامہ اقبال مرحوم نے اس مقصد کو یوں بیان کیا ہے ۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

گویا اسلامی نقطۂ نظر سے تسخیر کائنات بھی تعلیم کا ایک اہم مقصد ہے ۔ بقول اقبالؒ

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری
کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری

اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تمام ترقیات کو استعمال کرنا اور ان میں مزید تحقیقات کرتے رہنا شامل ہے اور سب سے اہم بات ایک مخصوص سائنسی طرز فکر کی نشو و نما ہے جس کا مطمحِ نظر یہ شعور ہے کہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق چل رہی ہے ۔ ان قوانین کا علم حاصل کر کے کائنات کی قوتوں سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے ۔

اسلامی نقطہ نظر سے ایک اور اہم مقصد تبلیغ اسلام ہے ۔ انسان محض اپنی اصلاح کر کے اور ضروری سائنسی وسائل کو کام میں لا کر سبکدوش نہیں ہو سکتا ۔ اس کے فرائض میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ اس پیغام حق کو دوسروں تک بھی پہنچائے جس کی برکتوں سے وہ خود بہرہ ور ہے ۔ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق نیکیوں کو عام کرے اور برائیوں کی روک تھام کرے اور حسب ضرورت اس کے لیے جان لڑانے سے بھی گریز نہ کرے ۔ غرضیکہ تعلیم کے مقاصد میں یہ بات شامل ہونی چاہیے کہ افراد معاشرہ میں جذبۂ تبلیغ و جہاد کی نشو و نما کی جائے ۔

اسلامی مقاصد تعلیم کا یہ ایک عام خاکہ ہے جسے ہر اسلامی معاشرے میں نافذ کیا جا سکتا ہے ۔ پاکستان بھی ایک ایسا ہی معاشرہ ہے لہٰذا یہ تمام مقاصد پاکستان کے نظام تعلیم کا حصہ ہونے چاہییں ۔ ان کے علاوہ چند ایسے مقاصد اور بھی ہو سکتے ہیں جو پاکستان کی مخصوص ضروریات سے تعلق رکھتے ہوں ۔ مثلاً بر صغیر پاکستان و ہند میں دو قومی نظریے کی روشنی میں قیام پاکستان کے محرکات کا فہم اور پاکستان کی قومی آزادی کا دفاع ایسے مقاصد ہیں جنہیں پاکستانی نظام تعلیم کا لازمی جزو ہونا چاہیے ۔ نظریۂ پاکستان کے ضمن میں آپ دو قومی نظریے کے مفہوم سے واقف ہو چکے ہیں ۔ پاکستان کی قومی آزادی کے دفاع کے لیے اس نظریے کی صداقت پر یقین ضروری ہے ۔ مزید برآں آزادی کی قدر و قیمت ، پاکستان سے دلی محبت ، جذبۂ ایثار اور شوق شہادت کی نشو و نما بھی لازمی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کے مادی اور عسکری استحکام کی بھی ضرورت ہے ۔ اس میں پاکستان کے بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ پالیسی بھی شامل ہو گی ۔ یہ سب امور پاکستان کے قومی مقاصد تعلیم کا حصہ ہوں گے ۔

مقاصد تعلیم کا یہ عام خاکہ ہے جس کا ہر استاد کو علم ہونا چاہیے اور ہر شاگرد کی تربیت میں اسے سامنے رکھنا چاہیے ۔ علاوہ ازیں ہر باشعور شہری کو بھی قومی مقاصد تعلیم سے پوری آگاہی ہونی

چاہیے اور اسے چاہیے کہ اپنی اور اپنی اولاد کی تربیت کے سلسلے میں انہیں ہمیشہ پیش نظر رکھے۔

سوالات

۱ - مقاصد تعلیم کے تعین میں نظریۂ حیات کی اہمیت مثالوں سے واضح کیجیے۔

۲ - اقدار سے کیا مراد ہے؟ اقدار اور مقاصد تعلیم میں کیا تعلق ہے؟ مثالوں سے واضح کیجیے۔

۳ - پاکستان میں اسلامی مقاصد تعلیم اور قومی مقاصد تعلیم میں کیا تعلق ہے؟ مثالوں سے واضح کیجیے۔

۴ - پاکستان کے قومی مقاصد تعلیم میں تمام اسلامی مقاصد تعلیم شامل ہیں۔ بحث کیجیے۔

۵ - حکومت پاکستان کے مقرر کردہ قومی مقاصد تعلیم کون کون سے ہیں؟ ان میں سے کون سے مقاصد ایسے ہیں جو آپ کے خیال میں کسی دوسرے مسلمان ملک کے نظام تعلیم کے لیے بھی موزوں ہو سکتے ہیں؟

۶ - اسلامی نقطۂ نظر سے بنیادی مقاصد تعلیم بیان کیجیے اور بتائیے کہ پاکستان میں ان کے علاوہ مزید کن مقاصد کو نظام تعلیم کا جزو بنانا ضروری ہے اور کیوں؟

۷ - اسلامی مقاصد تعلیم اور حکومت پاکستان کے شائع کردہ قومی مقاصد تعلیم کا موازنہ کیجیے اور دونوں کے مشترک اور مختلف نکات کو علیحدہ علیحدہ بیان کیجیے۔

چوتھا باب

مڈل جماعتوں میں تعلیم کے مقاصد اور ان کے حصول کے ذرائع

مقاصد تعلیم کے شعبے

گذشتہ صفحات میں قومی اور اسلامی مقاصد تعلیم کا ذکر تفصیل سے کیا جا چکا ہے - اب ان مقاصد کی روشنی میں مڈل جماعتوں کے خصوصی مقاصد تعلیم کا مطالعہ کیا جائے گا - نئی قومی تعلیمی پالیسی کی رو سے ابتدائی تعلیم کا دائرہ کار جماعت ہشتم تک وسیع ہوگا - اس لحاظ سے ششم، ہفتم اور ہشتم جماعتوں کی تعلیم و تربیت ابتدائی تعلیم کا دوسرا حصہ تصور ہو گی - سردست بیشتر مدارس میں ششم ، ہفتم اور ہشتم جماعتوں کی تعلیم ثانوی مدارس کا جزو اول متصور ہوتی ہے - ان حالات میں ان جماعتوں کے طلبا کی تعلیم و تربیت کی دو نوعیتیں ہوں گی - اول یہ کہ ان جماعتوں کو بہت سے طلبا کے لیے تعلیم کا اختتامی درجہ قرار دیا جائے اور ان میں طلبا کی تربیت اس طرح کر دی جائے کہ وہ بطور پاکستانی شہری آبرومندانہ زندگی گذارنے کا اسلوب اور ڈھنگ سیکھ لیں - دوم یہ کہ ان جماعتوں کو آیندہ جماعتوں اور تعلیم کے لیے بنیاد قرار دیا جائے اور آیندہ مدارج کی تیاری کے طور پر استعمال کیا جائے۔

قومی مقاصد تعلیم کی روشنی میں مڈل جماعتوں کے مقاصد خصوصی کی ترتیب کے سلسلے میں ان حقائق کو سامنے رکھنا ہوگا کہ ان جماعتوں کی نوعیت اختتامی بھی ہے اور آیندہ جماعتوں کے لیے تیاری کی بھی - مرکزی وزارت تعلیم کے قومی ادارہ برائے نصابات و درسی کتب نے مڈل جماعتوں کے خصوصی مقاصد کو درج ذیل تین شعبوں میں تقسیم کیا ہے -

اول : معلومات/ تفہیمات

دوم : عادات و خصائل اور تحسینات

سوم : عملی سرگرمیاں ، فنون اور مہارتیں ۔

ان مقاصد کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

معلومات / تفہیمات

تہذیبی مقاصد

۱ - طلبا کو قیام پاکستان کے اسباب سے روشناس کرانا اور انہیں انفرادی اور معاشرتی زندگی کے متعلق اسلامی ضابطۂ حیات کی واقفیت بہم پہنچانا ۔

۲ - بیسویں صدی میں تعلیم کی اشاعت اور سائنسی تحقیق کی وجہ سے جو سہولیات زندگی مہیا ہوتی ہیں ، ان کا شعور دلانا ۔

۳ - ذرائع معلومات کا علم مہیا کرنا ۔

۴ - معلومات کو وسیع کرنے کے لیے تحقیق ، تجربے اور علمی جستجو کے طریقوں کا علم مہیا کرنا ۔

معاشرتی مقاصد

۵ - (الف) عقائد و ارکان اسلام کے متعلق علم و فہم کو وسعت دینا ۔

(ب) مسلمان مفکروں اور سائنس دانوں نے انسانی تہذیب و تمدن کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کا تعارف کرانا ۔

(ج) طلبا کو قیام پاکستان کے بعد کی کامیابیوں سے روشناس کرانا ،

۶ - (الف) ان نمایاں عوامل کا علم مہیا کرنا جو انکشافات کا موجب بنتے ہیں ۔

(ب) سائنسی اور تکنیکی ترقی کے متعلق واقفیت بہم پہنچانا ۔

(ج) مسائل حل کرنے کے طریقوں کے متعلق معلومات فراہم کرنا ۔

۷ ۔ سائنسی اور تکنیکی ترقی کے فوائد و ثمرات سے طلبا کو آگاہ کرنا اور ترقی کے حصول کے لیے مطلوبہ ذرائع کے متعلق واقفیت دلانا ۔

۸ ۔ قومی ذرائع ، ضروریات اور منصوبوں کا علم مہیا کرنا ۔

۹ ۔ طلبا کو معاشرتی کارکنوں کے کردار کے متعلق واقفیت دلانا ۔

انفرادی مقاصد

۱۰ ۔ (الف) طلبا کو عام افراد کی بنیادی حیاتیاتی ، نفسیاتی اور معاشرتی ضرورتوں کے متعلق علم مہیا کرنا ۔

(ب) طلبا کو ان بنیادی ذرائع اور طریقوں کا شعور دلانا جو ایک عام فرد کی جسمانی ، ذہنی ، اخلاقی ، روحانی اور جمالیاتی نشوونما اور بالیدگی کے لیے ضروری ہیں ۔

۱۱ ۔ (الف) طلبا کو ان قابلیتوں ، صلاحیتوں اور مہارتوں کا علم مہیا کرنا جو اوسط اور اعلیٰ درجے کی مختلف ملازمتوں اور پیشوں کے لیے ضروری ہیں ۔

(ب) طلبا کو مختلف ممالک کے باشندوں کی بود و باش میں اختلاف کے اسباب و عوامل کا فہم اور شعور دلانا ۔

(ج) طلبا کو اقوام کے باہمی انحصار کی حقیقتوں اور بین الاقوامی تعاون کے مشترکہ فوائد کی واقفیت دلانا ۔

(د) اقوام متحدہ ، اس کے مخصوص اداروں اور ان کی خدمات کے متعلق معلومات مہیا کرنا ۔

(ہ) قوموں کے باہمی تعاون کے دیگر اداروں اور ان کی خدمات سے طلبا کو روشناس کرانا ۔

عادات و خصائل اور تحسینات

تہذیبی مقاصد

(۱) طلبا میں ایسا طرز عمل بیدار کرنا جس سے وہ پابند قانون شہری بن سکیں اور دینی ، اخلاق اور معاشرتی فرائض کو پورا کر سکیں ۔

(۲) طلبا میں قیام پاکستان کے لیے تحریک چلانے کی ضرورت کا استحسان پیدا کرنا ۔

۳ - طلبا میں ان فوائد کا استحسان پیدا کرنا جو زندگی کے مختلف شعبوں میں علم کے اضافے اور تحقیق میں ترقی سے پیدا ہوتے ہیں ۔

۴ - معلومات کے معتبر ذرائع سے استفادے کی ضرورت و اہمیت اور قدروقیمت کا احساس دلانا ۔

۵ - طلبا کو ایجادات و اختراعات کے فوائد اور نئی ایجادات کے لیے کوششوں کی ضرورت کا احساس دلانا ۔

معاشرتی مقاصد

۶ - (الف) طلبا میں اسلام کے بنیادی عقائد و ارکان کے لیے محبت اور عقیدت کے جذبات پیدا کرنا ۔

(ب) اسلام کے بیش قیمت ورثہ کی حفاظت کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے کا جذبہ پیدا کرنا ۔

(ج) طلبا میں نظریۂ پاکستان پر یقین و اعتقاد اور اس کے تحفظ کا عزم راسخ پیدا کرنا ۔

(د) پاکستان کی ترقی اور وقار کے لیے جدوجہد کرنے کا پختہ عزم پیدا کرنا ۔

۷ - (الف) طلبا میں سائنسی اور تکنیکی علوم کی جستجو اور اختراع کی خواہش پیدا کرنا ۔

(ب) مقاصد کے حصول کی لگن اور ان مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری مہارتوں کے حصول کی خواہش پیدا کرنا ۔

۸ ۔ قومی ذرائع ، ضرورتوں اور منصوبوں کا استحسان پیدا کرنا اور ان قومی ذرائع سے موزوں طور پر استفادے کا عزم پیدا کرنا ۔

۹ ۔ طلبا میں قومی زندگی میں مختلف پیشوں کی اہمیت ، رواداری اور تعاون کے جذبات کا فہم اور استحسان پیدا کرنا ۔

انفرادی مقاصد

۱۰ ۔ (الف) معاشرے کے دوسرے لوگوں کی بنیادی حیاتیاتی ، نفسیاتی اور معاشرتی ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھنا ۔

(ب) انفرادی اختلافات کا اعتراف کرانا اور ان کے لیے احترام کے جذبات بیدار کرنا ۔

(ج) طلبا کو تجزیہ نفس کرنے اور اپنی خامیوں اور خوبیوں کو قبول کرنے کے قابل بنانا ۔

(د) اسلام کی اخلاق اقدار کو عالمگیر بنانے کے لیے طلبا میں جذبۂ شوق پیدا کرنا ۔

(ہ) افراد میں باہمی مطابقت کا جذبہ پیدا کرنا ۔

۱۱ ۔ (الف) شاندار کارنامے انجام دینے کے لیے طلبا میں اُمنگ پیدا کرنا ۔

(ب) طلبا کو محنت کی عظمت کا احساس دلانا ۔

(ج) طلبا میں اپنی صلاحیتوں کی زیادہ سے زیادہ نشوونما کی لگن پیدا کرنا ۔

(د) طلبا میں اپنی ذات ، کنبے اور قوم کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا جذبہ پیدا کرنا ۔

(ہ) طلبا میں تاحیات علم کی جستجو کا جذبہ پیدا کرنا ۔

(و) طلبا کو وقت کی قدر و قیمت کا احساس دلانا ۔

بین الاقوامی مقاصد

۱۲ ۔ (الف) بود و باش کے مختلف طریقوں کی تفہیم اور ان کے لیے جذبۂ رواداری پیدا کرنا ۔

(ب) مختلف اقوام کے عمل و کردار کے اسباب کا استحسان کرنا ۔

(ج) اس حقیقت کا اعتراف کرنا کہ مختلف ممالک اور اقوام ایک دوسرے پر انحصار رکھتی ہیں اور بین الاقوامی تعاون سے متوقع باہمی مفادات کا استحسان کرنا ۔

عملی سرگرمیاں ، فنون اور مہارتیں

تہذیبی مقاصد

۱ ۔ طلبا کو خود مختار مملکت پاکستان کے استحسان کی نشو و نما کے لیے سرگرمیوں میں شریک کرنا ۔

۲ ۔ مطالعے اور تحقیق سے معلوم ہونے والے طریقوں کے مناسب استعمال اور استفادے کے لیے مختلف مہارتیں اور فنون سکھانا ۔

۳ ۔ مزید علم حاصل کرنے کے لیے مناسب ذرائع معلومات سے استفادے کی عادات پختہ کرنا ۔

۴ ۔ تجربات کرنے اور بیانات و خیالات کی تنظیم کرنے کی مہارتیں سکھانا ۔

۵ ۔ مناسب مفروضے قائم کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ۔

معاشرتی مقاصد

۶ ۔ (الف) طلبا کو نماز ادا کرنے اور اللہ کے دوسرے احکامات بجا لانے کی مہارتیں سکھانا ۔

(ب) اسلامی ورثے کے تحفظ کے انفرادی اور اجتماعی طریقے سکھانا۔

۷ - (الف) قومی نظریے کے تحفظ کے لیے موزوں پروگراموں میں سرگرمی سے شریک کرنا۔

(ب) طلبا کو ایسے انفرادی اور اجتماعی کردار و عمل کے لیے تیار کرنا جس سے ملک کی ترقی اور وقار میں اضافہ ہو۔

۸ - (الف) طلبا کو تجربات کرنے میں سرگرمی اور جوش سے شریک کرنا۔

(ب) ملکی و قومی یک جہتی اور وحدت کے مطلوبہ پروگراموں اور سرگرمیوں میں شریک کرنا۔

۹ - انفرادی صلاحیتوں اور رجحانات کے مطابق پیشہ اختیار کر کے قومی ذرائع سے استفادے کے پروگراموں میں شرکت کے قابل بنانا۔

۱۰ - معاشرتی بہبود کے پروگراموں میں شرکت کرنا اور ان پروگراموں کو منظم کرانا۔

انفرادی مقاصد

۱۱ - (الف) اپنی اور دوسرے افراد کی بنیادی حیاتیاتی، نفسیاتی اور معاشری ضرورتوں کی تسکین کے لیے رواداری اور باہمی احترام کا اظہار کرنا۔

(ب) دوسرے افراد کی مملوکہ اشیا کا احترام کرنا۔

(ج) صلاحیتوں، دلچسپیوں اور اقدار کے سلسلے میں انفرادی اختلافات کا احترام کرنا۔

۱۲ - (الف) اپنی قابلیت کے مطابق قیادت سنبھالنے اور اسے بام عروج تک پہنچانے کی کوشش کرنا۔

(ب) محنت کی عظمت کے متعلق مدرسے کی طرف سے ترتیب دے گئے خصوصی پروگراموں میں شرکت کرنا ۔

(ج) اپنی اپنی صلاحیتوں کی بہترین نشو و نما کے لیے مختلف سرگرمیوں میں حصہ لینا ۔

(د) اکتسابی قوتوں کو کنبے اور معاشرے کی بہبود کے لیے استعمال کرنا ۔

(ہ) فارغ وقت کے بہترین اور نفع بخش استعمال کے لیے علم اور مہارتیں حاصل کرنا ۔

بین الاقوامی مقاصد

۱۳ ۔ (الف) ممکن حد تک دوسرے ممالک کے افراد سے ملنے اور ان کے ساتھ رہنے کا تجربہ حاصل کرنا ، یا کم از کم اپنے ہی ملک کے مختلف صوبوں کے افراد سے ملنے اور ان کے ساتھ رہنے کا تجربہ حاصل کرنا ۔

(ب) لوگوں کے کردار و عمل میں اختلاف کی وجوہ کا فہم حاصل کرنے کے لیے عملی سرگرمیاں انجام دینا ۔

(ج) یوم اقوام متحدہ کی تقریبات اور ملکی اور بین الاقوامی اداروں کی تقریبات میں شرکت کرنا ۔

(د) دوسری اقوام کے بچوں سے قلمی دوستی پیدا کرنا ۔

(ہ) بین الاقوامی ریڈ کراس کے ذریعے دوسرے ملکوں کے افراد سے تحائف کا تبادلہ کرنا ۔

مڈل جماعتوں کے مندرجہ بالا مقاصد تعلیم کی تفصیل پیش کرنے کے بعد ہم مختصراً ان مقاصد کو اس طرح پیش کر سکتے ہیں ۔

۱ ۔ طلبا کو اسلام کے بنیادی عقائد و ارکان ، اسلامی ضابطۂ حیات کی جامعیت ، اسلام کی عالمگیر اقدار اور اسلام کے ثقافتی و تہذیبی ورثے کے متعلق معلومات و تفہیمات حاصل کرنے،ان کے متعلق

مثبت عادات و خصائل اور تحسینات کا اظہار کرنے اور عملی سرگرمیاں انجام دینے کے قابل بنانا ۔

۲ - نظریۂ پاکستان ، تحریک پاکستان ، قیامِ پاکستان کی تفہیم ، قومی سالمیت کی بقا و ترقی ، قومی وقار، قومی وحدت و یک جہتی اور قومی ذرائع سے بہترین استفادے کے لیے انفرادی اور اجتماعی تدابیر کے لیے معلومات حاصل کرنا ۔ رجحانات ، عادات و خصائل اور تحسینات کا اظہار کرنا اور عملی سرگرمیاں انجام دینا ۔

۳ - طلبا کو قوم و ملت کی خدمت کے لیے سائنس کی ترویج ، ایجادات و انکشافات کے متعلق معلومات حاصل کرنے اور سرگرمیاں انجام دینے کے قابل بنانا ۔

۴ - ہر فرد کی صلاحیتوں ، رجحانات ، دلچسپیوں ، عمر اور انفرادی اختلاف کے مطابق اس کی نشو و نما کا اہتمام کرنا ۔ اسے قوم و ملت کا بہترین فرد اور کامیاب شہری بنانا ۔ ہر فرد کو اس قابل بنانا کہ وہ دینی ، اخلاقی ، سیاسی اور معاشی فرائض کی ادائیگی کے قابل ہو سکے اور اپنی قوم اور ملک کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی صلاحیتیں بہترین طریقے سے استعمال کر سکے ۔

۵ - طلبا میں بین الاقوامی فہم اور شعور پیدا کرنا ۔ دوسرے ممالک اور اقوام اور ان کے افراد کے لیے رواداری اور تعاون کا جذبہ پیدا کرنا ۔ انسانیت کے احترام کے جذبات کو پروان چڑھانا ۔

۶ - طلبا کو اس قابل بنانا کہ وہ معاشی طور پر خود کفیل بننے کے لیے مناسب پیشے کا انتخاب کر سکیں ۔ وہ محنت کی عظمت کا اعتراف کریں اور خود عملی طور پر کام کرنے پر فخر محسوس کریں ۔

۷ - طلبا کی شخصیت کی اس طرح تعمیر کرنا کہ وہ فارغ وقت کا صحیح اور نفع بخش استعمال کر سکیں ۔

۸ - طلبا میں تا حیات علم حاصل کرنے کے لیے لگن ، محنت اور مستعدی کے اوصاف پیدا کرنا ۔

حصول مقاصد کے ذرائع

نصاب تعلیم

مڈل جماعتوں کے مقاصد خصوصی ترتیب دے لینے کے بعد یہ
مرحلہ پیش آتا ہے کہ ان مقاصد کو کس طرح حاصل کیا جائے۔
اس سلسلے میں سب سے پہلے نصاب تعلیم پر نظر پڑتی ہے۔ نصاب ان
سب سرگرمیوں، فعالیتوں، تجربات، تفہیمات، رجحانات اور تحسینیات پر
مشتمل ہوتا ہے جن سے مدرسے کی نگرانی میں بچوں کے ذہنی، روحانی،
سماجی، اخلاق، سیاسی اور معاشی کردار و سیرت کی تعمیر ہوتی ہے۔
عام مفہوم میں نصاب ان مضامین پر مشتمل ہوتا ہے جو ایک درجے
یا جماعت کے بچے دوران سال میں پڑھتے ہیں لیکن نصاب کا حقیقی اور
وسیع تر مفہوم وہی ہے جو مضامین کی مخصوص معلومات، سرگرمیوں
اور تجربات کی حدوں کو پھاند کر طلبا کی پوری تعلیمی زندگی کی
سرگرمیوں پر محیط ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے نصاب وہ ذریعہ ہے جس سے
بچے کی پوری شخصیت اور سیرت و کردار کی نشو و نما ہوتی ہے۔
اس لیے اس میں مضامین کے علاوہ کھیل کود، علمی و ادبی سرگرمیاں
اور سماجی، اخلاق اور روحانی اقدار کی نشو و نما کے دیگر ذرائع بھی
شامل ہیں۔ اس مرحلے پر یہ صراحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ
اگرچہ بنیادی طور پر نصاب تعلیم ہی مقاصد تعلیم کے حصول کا ضامن
ہے لیکن مقاصد تعلیم کے حصول کے لیے درج ذیل ذرائع بھی کچھ کم
اہم نہیں ہیں۔

۱ - اساتذہ اور دیگر کارکنان مدرسہ۔
۲ - مدرسے کی عمارت، کمرۂ جماعت، کھیل کے میدان اور دیگر عمارات۔
۳ - درسی کتب۔
۴ - لائبریری اور عجائب گھر۔
۵ - تعلیمی معاونات وغیرہ وغیرہ۔

نصاب کی معلومات، سرگرمیوں اور تجربات کو بعض اوقات دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے: اول نصابی سرگرمیاں جن میں مضامین کو شامل کیا جاتا ہے۔ دوم، غیر نصابی یا ہم نصابی سرگرمیاں جن میں وہ سرگرمیاں شامل کی جاتی ہیں جو مضامین کے علاوہ طلبا مدرسے کی نگرانی میں مدرسے کے اندر یا باہر انجام دیتے ہیں۔ یہ دونوں قسم کی سرگرمیاں یکساں طور پر اہم ہیں۔ ماہرین تعلیم تو ان کو علیحدہ علیحدہ قسمیں قرار دینے کے بھی خلاف ہیں لیکن عملی صورت حال یہی ہے کہ نصاب تعلیم کو نصابی سرگرمیوں (مضامین) اور غیر نصابی یا ہم نصابی سرگرمیوں (سماجی مشاغل) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اب ہم باری باری ان دونوں کو زیر بحث لا کر یہ دیکھیں گے کہ ان کے ذریعے سے کون کون سے مقاصد کس طرح حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

نصابی مضامین

تعلیمی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے نصاب کے مضامین بہت اہم ہیں۔ ان مضامین کے ذریعے معلومات، تفہیمات مہیا کر کے عادات و خصائل اور استحسان پیدا کر کے اور علمی سرگرمیوں مہارتوں اور فنون کا اکتساب کرا کے مڈل جماعتوں کے خصوصی مقاصد کے حصول میں بہترین مدد لی جا سکتی ہے۔

مڈل جماعتوں کے خصوصی مقاصد کے حصول کے لیے ان جماعتوں کے مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

اول: لازمی مضامین

	تعداد پریڈ فی ہفتہ
۱ - اردو	6
۲ - انگریزی	6
۳ - ریاضی	4
۴ - سائنس	3
۵ - مطالعہ پاکستان/معاشرتی علوم	3

٦ - صحت اور جسمانی تعلیم	3
۷ - اسلامیات	4
۸ - عملی فنون	2

دوم : اختیاری مضامین

۹ - دوسری زبان (اردو کے علاوہ)	4
۱۰ - پیشہ ورانہ مضامین	10

تعداد مضامین 10 — تعداد پریڈ 45

اس نقشے سے یہ ظاہر ہے کہ کل مضامین دس ہوں گے اور ان کے لیے پورے ہفتے میں پنتالیس پریڈ ہوں گے - پریڈ چالیس (40) منٹ کا ہو گا - جدید سفارشات کے مطابق ہر ہفتے میں مدرسے پانچ مکمل دن اور ایک نصف دن کام کریں گے . ہفتہ وار مکمل تعطیل ایک یوم کی ہو گی - مکمل دن میں مدرسے میں آٹھ پریڈ ہوں گے اور پانچ گھنٹے اور بیس منٹ درس و تدریس کا کام ہو گا - نصف دن میں پانچ پیریڈ ہوں گے جن میں تین گھنٹے اور بیس منٹ کے لیے تدریسی کام ہو گا - ان کے علاوہ پورے دن میں 30 منٹ کی تفریح اور 10 منٹ کی صبح کی اسمبلی ہو گی اور نصف تدریسی دن میں 10 منٹ کی صبح کی اسمبلی اور 10 منٹ کی تفریح ہو گی -

محولہ بالا نقشے میں دوسری زبان (اردو کے علاوہ) عربی ، بنگالی ، گجراتی ، پالی ، پشتو ، پنجابی ، فارسی اور سندھی زبانوں میں سے کوئی سی منتخب کی جا سکتی ہے - پیشہ ورانہ مضامین کو درج ذیل مضامین میں سے منتخب کیا جا سکتا ہے - مٹی کے ماڈل بنانا ، کھلونے بنانا ، ٹوکریاں بنانا ، برتن بنانا ، کپڑے منقش کرنا ، چمڑے کا کام کتابوں کی جلد بندی کرنا ، کپڑا بننا ، بید اور بانس کا کام ، لکڑی کا کام ، دھات کا کام ، زرعی اور صنعتی علوم جیسے بجلی کا کام ، زراعت اور باغبانی ، مچھلیوں کی افزائش اور دیکھ بھال اور گھریلو معاشیات یا امور خانہ داری وغیرہ -

مضامین کی اس تفصیل اور ضمنی مباحث کے بعد اب نمونے کے طور پر چند مضامین کے مقاصد اور ان کے حصول کی سرگرمیوں کا ذکر کیا جائے گا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان مضامین کی تدریس سے مڈل جماعتوں کے مقاصد تعلیم کس طرح پورے ہو سکتے ہیں۔

اُردو

مڈل جماعتوں میں مضمون اُردو کی تدریس کے ذریعے درج ذیل مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں:

۱ - تحریری اور زبانی طور پر طلبا میں سادہ، صاف، واضح اور درست طریقے سے اظہار خیال کی اہلیت اور مہارت کی نشو و نما۔

۲ - طلبا میں صحیح ہجوں اور خوشخطی کی مہارت اور نظم و نثر کی قرأت میں صحیح لہجے اور تلفظ کی مہارت۔

۳ - طلبا میں قومیت اور حب الوطنی کی پرورش اور ان کے اخلاق و کردار کی تعمیر۔

۴ - انسانی اور روحانی اقدار کا استحسان۔

۵ - طلبا میں قومی وحدت اور قومی تفاخر کے جذبے کی تعمیر۔

۶ - قومی تہذیب اور ادب سے محظوظ ہونا اور ان پر فخر کرنا۔

۷ - قومی نظریے اور تہذیب کے احترام کی نشو و نما۔

۸ - ذاتی کردار کی پختگی اور سماجی خدمت کے جذبے کی تعمیر۔

۹ - اسلامی عقائد و اعمال کا احترام کرنا اور ان پر کاربند رہنا۔

۱۰ - قومی شعائر سے وابستگی اور عمل سے اُن کا اظہار۔ مثال کے طور پر قومی پرچم اور قومی ترانے کے آداب، قومی رہنما کا احترام، اسلامی روایات سے محبت وغیرہ۔

زبان اُردو میں ان مقاصد کے حصول کے لیے تحریری اور زبانی کام کے لیے روز مرہ دلچسپی کے عنوانات کا انتخاب کیا جائے۔ طلبہ کو تحریری اور زبانی طور پر آزادانہ اظہار خیال کی مشق کروائی جائے۔

مختصر تقاریر اور نظم خوانی کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ طلبا میں تحریک پیدا کی جائے کہ وہ حظ اٹھانے کے لیے اضافی مطالعہ کر سکیں۔ اضافی کتب مدرسے کی لائبریری میں مہیا کی جائیں۔ گفتگو ، قرأت ، تحریری کام اور عملی قواعد میں مہارت پیدا کرائی جائے۔ درسی کتب میں مندرجہ ذیل عنوانات شامل ہوں۔

جماعت ششم

۱ - گھر اور مدرسے کے ماحول کے متعلق مضامین۔

۲ - مشہور سیاحوں اور انکشافات کے متعلق کہانیاں۔

۳ - قومی اور اسلامی رہنماؤں کی زندگی کے متعلق کہانیاں۔

۴ - سائنسی ایجادات کے متعلق کہانیاں۔

۵ - پاکستان کے مختلف علاقوں اور لوگوں کے متعلق کہانیاں۔

۶ - شہریت کا شعور پیدا کرنے والی کہانیاں۔

۷ - بیانیہ نظمیں۔

۸ - روزمرہ سائنس ، صحت و صفائی اور ابتدائی طبی امداد کے متعلق معلومات۔

۹ - اسلامی تاریخ سے دلچسپ مواد کا انتخاب اور سوانح جن سے طلبا میں بہادری اور شجاعت کا جذبہ پیدا ہو۔

۱۰ - دوسرے ممالک کے ساتھ پاکستان کے تہذیبی اور ثقافتی تعلقات۔

۱۱ - آسان اور دلچسپ مکالمے جن میں سماجی اور اخلاقی اقدار کو نمایاں کیا گیا ہو اور سماج دشمن سرگرمیوں کی حوصلہ شکنی کی گئی ہو۔

۱۲ - حمد ، نعت ، قدرتی مناظر اور نصیحت آموز نظمیں۔

درسی کتب کے ان عنوانات کے علاوہ طلبا ایسی سرگرمیوں میں حصہ لیں جن سے وہ اپنی جماعت کا رسالہ تیار کر سکیں ، قلمی دوستی کر سکیں ، روزمرہ عنوانات پر گفتگو کر سکیں ، بچوں کے ریڈیو

پروگرام کو سن سکیں اور درسی کتاب میں سے اشعار زبانی یاد کر سکیں ۔

جماعت ہفتم

درسی کتاب کا 1/5 حصہ نظم کے لیے مخصوص ہو ۔ جماعت ششم میں دیے گئے عنوانات کے علاوہ یہ عنوانات شامل کتاب کیے جائیں ۔

۱ - حیرت انگیز کہانیاں ۔

۲ - عجیب و غریب پودے اور جانور ۔

۳ - فطرت کی فیاضیاں ۔

۴ - پاکستان کی زرعی صنعتیں اور فنی ترقی ۔

۵ - قومی تہوار اور میلے ۔

۶ - محنت کی عظمت کے متعلق مضامین ۔

۷ - شہری کے حقوق و فرائض ۔

درسی کتب کے ان عنوانات کے علاوہ طلبا کچھ سرگرمیاں بھی انجام دیں ، جیسے ریڈیو پروگرام سننا اور دلچسپ چیزوں کو نوٹ کر لینا ، غیر درسی کتب میں سے دلچسپ جملے اور پیراگراف اپنی کاپی میں نقل کرنا ۔

جماعت ہشتم

جماعت ہشتم کی درسی کتاب میں 1/5 حصہ نظم کے لیے مخصوص ہو ۔ جماعت ششم اور ہفتم کے عنوانات کے علاوہ ایسے مضامین کہانیاں وغیرہ شامل کی جائیں جن میں اخلاقی صفات کی توصیف و مدح پائی جائے ۔ فرمان برادری ، وفاداری اور شجاعت پر بھی مواد شامل نصاب کیا جائے ۔ نیک اشخاص کے سوانح حیات ، اسلامی تاریخ سے نمایاں کارنامے وغیرہ بھی شامل ہوں ۔ جماعت ہفتم کی سرگرمیوں کے علاوہ درج ذیل سرگرمیاں ترتیب دی جائیں ۔

۱ - تصویری البم تیار کرنا اور تصاویر کے متعلق مختصر نوٹ لکھنا ۔

۲ - درسی کتاب میں شامل ڈرامائی حصے تمثیل کاری کے ذریعے پیش کرنا -

۳ - گروہی بحث میں حصہ لینا -

۴ - تمثیل کاری اور مکالمہ بازی -

۵ - مدرسے کے رسالے کے لیے کہانیاں لکھنا اور طلبا کی سرگرمیوں کے متعلق نوٹ تحریر کرنا -

سائنس

مڈل جماعتوں میں سائنس کی تدریس سے درج ذیل مقاصد پورے ہو سکتے ہیں :

۱ - طلبا میں فطرت اور فطرت کی قوتوں کے متعلق فہم کی نشو و نما -

۲ - طلبا میں غائر مشاہدے کی عادت اور ان مشاہدات کو منضبط کرنے کی اہلیت، کی نشو و نما -

۳ - طلبا میں تنقیدی فکر آرائی کی عادات اور مشاہدات سے نتائج اخذ کرنے کی نشو و نما -

۴ - سائنسی امور میں طلبا کی اہلیت کی تشخیص کرنا اور ان میں سائنسی صلاحیت اور رجحان کی نشو و نما کے لیے ذہنی تحریک پیدا کرنا -

۵ - طلبا کو یہ سمجھانا کہ موجودہ تمدن سائنس پر مبنی ہے نیز طلبا کو یہ استحسان کرانا کہ انسانیت سائنس دانوں کی محنت اور مشقت کی مرہون منت ہے -

۶ - طلبا کو یہ سمجھنے میں مدد دینا کہ سائنس انسان کی دوست ہے دشمن نہیں -

۷ - علت اور معلول کے تعلق کو سمجھنے میں طلبا کی مدد کرنا اور ان میں معروضی نقطہ نظر پیدا کرنے کی صلاحیت کی نشو و نما کرنا -

۸ - طلبا کو عام شہریوں اور تکنیکی افراد کی طرح موجودہ سائنسی اور تکنیکی دنیا میں رہنے کے قابل بنانا۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے سائنس کی درسی کتب میں درج ذیل بڑے بڑے عنوانات شامل کیے جائیں:

جماعت ششم

(۱) ہوا (۲) پانی (۳) پودا اور اس کے حصے (۴) حیوانات کی زندگی (۵) صحت و صفائی (۶) پیمائش (۷) سیارے اور ستارے (۸) مقناطیس (۹) بجلی۔

جماعت ہفتم

(۱) ہوا (۲) پانی (۳) پھول اور پھل (۴) حیوانات کی زندگی (۵) خوراک (۶) حرارت (۷) روشنی (۸) بجلی (۹) سیارے اور ستارے۔

جماعت ہشتم

(۱) ہوا (۲) پانی (۳) حرارت (۴) روشنی (۵) خوراک (۶) زمین (۷) مقناطیس اور بجلی (۸) حیوانات کی زندگی (۹) پودوں کی زندگی (۱۰) ہوا اور خون کی گردشوں کا نظام (۱۱) ستارے اور سیارے۔

اسلامیات

مڈل جماعتوں کے خصوصی مقاصد کے حصول کے لیے اسلامیات کا مضمون بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے درج ذیل مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔

۱ - طلبا کو اسلام کے بنیادی اصولوں کا فہم عطا کرنا۔

۲ - اللہ تعالیٰ، قرآن اور نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں اعتقاد اور ان کے لیے طلبا کے دلوں میں تکریم کا جذبہ پیدا کرنا۔

۳ - دوسرے پیغمبروں اور الہامی کتب کے لیے طلبا میں احترام کا جذبہ پیدا کرنا۔

۴ - طلبا میں یہ تحریک پیدا کرنا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی اقدار کے حصول میں بلند معیار پر فائز ہوں اور ایسی عمدہ اور اعلیٰ زندگی بسر کریں جو خیالات میں پاکیزہ اور اعمال میں درست ہو-

۵ - طلبا میں اسلامی قدروں کی نشو و نما کرنا مثلاً صداقت ، عدل و انصاف ، رواداری ، عفو و درگزر ، رحم دلی ، دیانت داری ، سادگی ، ذاتی قربانی ، سماجی خدمت ، علم کے لیے جستجو ، حق کی تنقید کے لیے مستعدی اور باطل سے کشمکش میں استقامت وغیرہ

۶ - طلبا میں یہ احساس پیدا کرنا کہ اسلامی اقدار ہی تمام انسانوں کی بھلائی کی ضامن ہیں -

ان مقاصد کے حصول کے لیے درسی کتب میں درج ذیل بڑے بڑے عنوانات شامل کیے جائیں :

جماعت ششم

قرأت : قرآن کریم کی سورۃ بقرۃ کا ناظرہ پڑھنا - آیتہ الکرسی اور سورۃ بقرہ کی پہلی پانچ اور آخری دو آیتیں زبانی یاد کرنا - سورۃ فاتحہ ، اخلاص فلق اور الناس کا ترجمہ - عربی رسم الخط میں حروف ابجد بسم اللہ اور کلمہ طیبہ لکھنا -

عقائد

آیتہ الکرسی کی روشنی میں اللہ کی صفات -

اخلاق

آداب مجلس ، آداب مکتب ، آداب مسجد ، والدین اور ہمسایوں کے حقوق -

سیرت

ہجرت سے پہلے تک کی رسول کریمؐ کی مکی زندگی کے حالات و واقعات -

عبادت

توحید ، رسالت اور نماز سے متعلقہ ضروری مسائل -

جماعت ہفتم

پچھلی جماعت میں کیے گئے کام کا اعادہ۔

قرأت

سورۃ آل عمران اور سورۃ النسا کے ابتدائی چار رکوعوں کی تلاوت ناظرہ۔ سورۃ فیل سے سورۃ لہب تک ترجمہ و مطالب مع حواشی۔ سورۃ فاتحہ کو عربی رسم الخط میں تحریر کرنا۔

عقائد، اخلاق اور اعمال

قرآن کریم کی سورۃ بقرہ کی آیات 177، 285 اور 286 کی روشنی میں ایمان مفصل کی تشریح۔

سیرت

رسول کریمؐ کی مدنی زندگی کے حالات بشمول مواخات۔ غیر مسلموں کے ساتھ معاہدے۔ جنگ بدر، احد، احزاب اور فتح مکہ۔ آخری حج اور وصال۔

عبادت

روزے اور زکواۃ کے متعلق ضروری مسائل۔

جماعت ہشتم

پچھلی جماعت میں کیے گئے کام کا اعادہ۔

قرأت

سورۃ النسا کے پانچویں رکوع سے آخر تک۔ سورۃ یٰسین، الرحمٰن اور الملک کی ناظرہ قرأت۔ سورۃ بقرہ کی پہلی پانچ اور آخری دو آیتوں کا مطلب مع حواشی۔ عربی رسم الخط میں سورۃ اخلاص اور درود شریف تحریر کرنا۔

عقائد، اخلاق اور اعمال

سورۃ آل عمران کی آیات نمبر 102 تا 110 کی روشنی میں انفرادی اور اجتماعی (ذاتی اور معاشرتی) اقدار کا بیان۔ قرآن کریم اور احادیث کی روشنی میں جانداروں پر رحم۔

(۱۹) جونئیر ریڈ کراس سوسائٹی (۲۰) ابتدائی طبی امداد (۲۱) سول ڈیفنس کلب (۲۲) سکاوٹنگ (۲۳) گرل گائیڈنگ (۲۴) باغبانی (۲۵) مدرسے کا ہاؤس سسٹم (۲۶) طلبا کی کونسل برائے حکومت خود اختیاری (۲۷) ڈاک کے ٹکٹ اکٹھے کرنے کا مشغلہ وغیرہ

یہ سب سماجی مشاغل مڈل جماعتوں کے طلبا کے لیے وضع کردہ مقاصد کی تکمیل میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں ۔

سوالات

۱ ۔ مڈل جماعتوں کے مقاصد تعلیم کا مختصر خاکہ بنائیے ۔

۲ ۔ مڈل جماعتوں کے مقاصد تعلیم میں سے دو اہم ترین مقاصد انتخاب کیجیے ۔ اپنے اس انتخاب کے لیے دلائل بھی تحریر کیجیے ۔

۳ ۔ مڈل جماعتوں کے مقاصد تعلیم کے حصول کے لیے درسی مضامین کی اہمیت بیان کیجیے ۔

۴ ۔ قومی مقاصد تعلیم کی روشنی میں مڈل جماعتوں کے مقاصد تعلیم کا جائزہ لیجیے ۔

۵ ۔ چھٹی جماعت کی درسی کتاب برائے ''معاشرتی علوم'' کا مطالعہ کرنے کے بعد بتائیے یہ معاشرتی علوم کا مضمون مڈل جماعتوں کے کون کون سے مقاصد پورے کرتا ہے ؟

۶ ۔ نصابی مضامین اور ہم نصابی سرگرمیوں میں سے مقاصد تعلیم کے حصول کے لیے کون سا ذریعہ زیادہ اہم ہے اور کیوں ؟

۷ ۔ ہم نصابی سرگرمیوں سے حاصل ہونے والے چند مقاصد تحریر کیجیے ۔

پانچواں باب

تعلیمی نفسیات اور اس کی اہمیت

تعلیم کے عمل کا مطلب ہے ایک فرد کے علم میں اضافہ کرنا ، اسکے کردار میں مناسب تبدیلیاں لانا ، اس کی عادات سنوارنا اور اس میں صحیح قسم کے نظریات اور اقدار پیدا کرنا ۔ لہٰذا اس حقیقت کو تسلیم کرنا ضروری ہے کہ تعلیم کے عمل میں استاد کا کام اتنا آسان اور سادہ نہیں جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے ۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بچوں کو معیاری تعلیم دی جائے تو ہمیں چاہیے کہ اساتذہ کی تربیت کا بہترین بندوبست کریں اور ان کو ایسے مضامین اور علوم سے اس طرح روشناس کرائیں کہ وہ دوران تدریس ان سے استفادہ کر سکیں ۔ ان علوم میں سے ایک علم نفسیات ہے جس کا تعلق انسان کے رویہ ، کردار اور عمل سے ہے اور استاد کا تعلق بھی انسان کے رویہ ، عمل اور کردار کی تشکیل سے ہے لہٰذا نفسیات کا علم استاد کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے ۔ ایسی معلومات اس سے اسے حاصل ہوتی ہیں جو دوران تدریس اس کے لیے معاون و مددگار ثابت ہوتی ہیں ۔

تعلیمی نفسیات

تعلیمی نفسیات کا علم استاد کی تربیت کا ایک اہم حصہ ہے ۔ تعلیمی نفسیات اس علم کی شاخ ہے جسکا تعلق سیکھنے کے عمل سے ہے ۔ یہ ایک ایسی سائنس ہے جو سیکھنے والے کی خصوصیات ، سیکھنے والے کے عمل اور اس پر اثر انداز ہونے والے عناصر کا گہرا مطالعہ کرتی ہے اور اس مطالعہ کا مرکز انسان ہے ۔ اس کا نفس مضمون ان نتائج اور حقائق پر مبنی ہے جو مشاہدے اور تجربے کا نتیجہ ہیں ۔ یہ مشاہدے اور تجربے صرف تجربہ گاہوں تک محدود نہیں رہے بلکہ ان کو کمرہ جماعت میں بھی آزمایا گیا ہے ۔

ماہر نفسیات یہ کوشش کرتے ہیں کہ انسان کے بارے میں جہاں سے بھی ممکن ہو علم حاصل کیا جائے۔ مثلاً عمرانیات سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ معاشرہ کس طرح سیکھنے پر اور سیکھنے والے پر اثر انداز ہوتا ہے اور یہ بھی کہ بچوں کو کس طرح سکھایا جائے اور کیا سکھایا جائے کہ وہ معاشرے کے مفید افراد بن سکیں۔

علم حیات (Biology) ہمیں بتلاتی ہے کہ وراثت (Heredity) انسان کے سیکھنے کے عمل کو کس طرح محدود کرتی ہے اور اس پر ماحول کس حد تک اثر ڈال سکتا ہے۔

علم الابدان (Physiol ogy) سے ہمیں انسانی دماغ اور ذہن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ، بچوں کی نشو و نما کے بارے میں صحیح معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ نفسیات کی دوسری شاخیں مثلاً عمرانی نفسیاث کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ استاد اور ہم جاعتوں کا سیکھنے کے عمل سے کیا تعلق ہے۔

بچوں کی نفسیات میں ہم بچوں کی نشو و نما پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تجرباتی نفسیات سیکھنے کے عمل کے بارے میں تجربات فراہم کرتی ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تعلیمی نفسیات کا نفس مضمون وسیع مطالعے پر مبنی ہے اور اس کے حقائق اور معلومات مختلف ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں۔

تعلیمی نفسیات کے مقاصد :

ہر سائنس کا پہلا مقصد ہے جاننا اور سمجھنا۔ اسی طرح تعلیمی نفسیات کا بھی پہلا مقصد بچوں کی نفسیات اور سیکھنے کے عمل کو سمجھنا اور نشو و نما کے اصولوں کو جاننا ہے۔ ماہر طبیعیات یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ مادے کی حقیقت کو سمجھے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ اس حقیقت کو سمجھتے سمجھتے جوہر یعنی ایٹم تک پہنچ گیا۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سمجھنے کی خواہش کا دوسرا نام تجسس ہے اور انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے اور اپنے ماحول کے

بارے میں طرح طرح کے سوال کرتا ہے اور پھر ان کا جواب تلاش کرتا ہے۔ اسی دوران وہ یہ پتا چلاتا ہے کہ اس کے ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیچھے کیا اسباب ہیں مثلاً اگر ایک بچہ بار بار فیل ہوتا ہے اور استاد کی پوری کوشش کے باوجود وہ کچھ نہیں سیکھتا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا کیا سبب ہے؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ صرف یہ جاننا چاہیں کہ آیا بچوں کی اصلاح سزا سے ہو سکتی ہے یا انعام دینے سے۔

تعلیمی نفسیات میں ہم بچوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان کی نشوونما کیسے ہوتی ہے، ان کے کردار میں تبدیلی کیسے لائی جاتی ہے۔ بچے جرائم پیشہ کیوں بن جاتے ہیں۔ ماں باپ کا رویہ اور گھر کا ماحول بچوں کی تعلیمی کارکردگی پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے اور کس طرح اس کی تعلیمی ترقی میں حائل ہوتا ہے۔ تعلیمی نفسیات کا دوسرا مقصد ہے پیشگوئی۔ یہاں پیش گوئی سے یہ مراد نہیں کہ نجومیوں کی طرح پیشگوئی کی جائے بلکہ تعلیمی نفسیات میں پیش گوئی سے مراد سائنسی طریقوں سے حاصل شدہ معلومات پر مبنی قیاسات ہیں۔

اگر ہم یہ جان چکے ہیں کہ پانی دو گیسوں کے خاص مقدار میں یک جا ہونے سے بنتا ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر دو حصے آکسیجن اور ایک حصہ ہائیڈروجن ملائی جائے تو پانی بن جائے گا۔ یا یہ کہ اگر ہم ایک اونچی جگہ سے ایک بھاری اور ایک چھوٹا پتھر یک وقت نیچے پھینکیں تو دونوں ایک ہی وقت میں نیچے گریں گے۔ یہ ساری پیشگوئیاں ہم اس لیے کر سکتے ہیں کہ ہمیں اسباب اور نتائج کا علم ہے۔ اگر سبب معلوم ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح کے نتائج واقع ہونگے یا اگر نتیجے کا علم ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سبب ہوگا مثلاً مریض کی حالت اور بیماری کی علامتیں نتیجہ ہیں اور ڈاکٹر بتا سکتا ہے کہ اس مرض کی وجہ کیا ہے۔ اب کمرہ جماعت کی مثال لیجیے۔ اگر استاد جانتا ہے کہ سزا سے

بچوں میں خوف پیدا ہوتا ہے اور خوف کی حالت میں بچے یاد کیا ہوا مواد جلد بھول جاتے ہیں تو پیشگوئی کر سکتا ہے کہ اس نے بچوں کو سزا دی تھی لہذا ممکن ہے کہ کل ان بچوں کو مضمون اتنی اچھی طرح یاد نہ ہو جتنا کہ ہونا چاہیے - یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تعلیمی نفسیات میں وثوق کو دخل نہیں بلکہ ہم ممکنات کی بات کرتے ہیں اور یہی سائنسی طرز فکر ہے -

تعلیمی نفسیات کا تیسرا مقصد ہے حالات پر قابو پانا اور خاطر خواہ نتائج حاصل کرنا - مثلاً جب آپ یہ جان جاتے ہیں کہ ملیریا کیوں ہوتا ہے تو پھر آپ یہ کوشش کرتے ہیں کہ ملیریا نہ پھیلے اور اس کے لیے آپ ان تمام اسباب کو دور کرتے ہیں جو ملیریا کا باعث ہیں اور اکثر اوقات اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوتی ہے - اسی لیے اب بہت سی بیماریوں مثلاً طاعون کا مکمل طور پر خاتمہ ہو چکا ہے -

زراعت کی مثال ہمارے سامنے ہے - ہم اناج اور پھلوں کی نئی قسمیں اگانے کے قابل ہو گئے ہیں اور فی ایکڑ پیداوار بڑھا لی ہے - تعلیم میں حالات پر قابو پانے کا مطلب ہے کہ جس طرح انسان نے تسخیر کائنات میں ترقی کی ہے اسی طرح تسخیر ذہن بھی کرے یعنی ایسے مواقع پیدا کرے جس سے تعلیمی لحاظ سے خاطر خواہ نتائج حاصل ہوں - بچوں کیلئے ایسا تعلیمی ماحول پیدا کیا جائے کہ ان میں متوقع تبدیلیاں رونما ہوں اور وہ بڑے ہو کر معاشرے کے مفید اور قابل فخر رکن ثابت ہوں -

ان تینوں مقاصد کا ایک دوسرے سے کیسے گہرا تعلق ہے یہ سمجھے بغیر پیشگوئی ممکن نہیں اور حالات پر قابو اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اسباب اور نتائج کا صحیح علم نہ ہو -

تعلیمی نفسیات کا نفس مضمون

ماہرین تعلیم اور خاص طور پر استاد اس بات پر متفق ہیں کہ تعلیم ایک ایسی منظم کوشش ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کو

اس قابل بنایا جائے کہ وہ ایسی معلومات ، مہارتیں اور اقدار حاصل کریں جن سے ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی بہتر بنے - اس تعلیم کا نتیجہ ہے وہ تمام تبدیلیاں جو انسان میں تجربات کے بعد رونما ہوں لہٰذا تعلیمی نفسیات کے مضمون میں مندرجہ ذیل موضوعات شامل ہیں -

۱ - بچہ ، اس کی نشوونما اور اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل -

۲ - انفرادی اختلافات ، ان کی وجوہات اور تعلیمی اہمیت -

۳ - سیکھنے کا عمل اور اس کا دلچسپی ، آمادگی ، مشق اور ترغیبات سے تعلق -

۴ - بچوں کی رہنمائی -

تعلیمی نفسیات کے مطالعے کے طریقے

چونکہ تعلیمی نفسیات ایک سائنس ہے اس لیے اس میں مطالعہ کے وہی طریقے استعمال ہوتے ہیں جو دوسرے سائنس دان کرتے ہیں -

ایک سائنس دان کا مطالعہ اس کی ذاتی رائے اور تعصب سے پاک ہونا چاہیے - نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے مطالعے کے نتائج کو آزمایا جا سکے اور اگر کوئی دوسرا سائنس دان ان ہی حالات میں تجربہ دوہراتا ہے اور پہلے جیسے نتائج حاصل ہوتے ہیں تو سائنس دان کا مطالعہ قابل قبول ہوتا ہے ورنہ اس پر مزید تجربے ضروری ہیں - سائنسی طریقوں کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں -

۱ - Precision — صحت اور سچائی -

۲ Objectivity — معروضیت یعنی ذاتی رائے اور تعصبات سے پاک ہو -

۳ - Repeatibility — یعنی انہیں دہرایا جاسکے -

تعلیمی نفسیات کے اصول بھی اسی مطالعے کی روشنی میں مرتب کیے گئے ہیں جن میں مندرجہ بالا خصوصیات پائی جاتی ہیں - بچوں کے بارے میں معلومات مشاہدے اور تجربوں کی مدد سے حاصل کی گئی ہیں -

مشاہدہ :

کمرۂ جماعت میں استاد دیکھتا ہے کہ اختر کبھی حمید کی کتاب چھینتا ہے کبھی اس کی پنسل لے لیتا ہے اور کبھی اسے منہ چڑاتا ہے۔ اختر کی ان حرکات کے مشاہدے سے وہ اندازہ لگاتا ہے کہ اختر سبق میں دلچسپی نہیں لے رہا ہے اور حمید کو تنگ بھی کر رہا ہے۔ استاد ایک ہفتہ تک اختر کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ روز ایسا ہی کرتا ہے اور استاد ان مشاہدات کا اندراج اپنی ڈائری میں کرتا ہے۔ وہ دوسرے استادوں سے پوچھتا ہے کہ آیا اختر نے ان کی کلاس میں بھی ایسے ہی رویہ کا اظہار کیا۔ استاد کھیل کے میدان میں بھی اختر کی حرکات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ مختلف طریقوں سے مزید معلومات حاصل کرتا ہے اور پھر ان مشاہدات کی روشنی میں اندازہ لگاتا ہے کہ اختر کو خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ بہرحال یہ مشاہدہ ہی تھا جس کی مدد سے ایک بچے کے بارے میں کچھ پتا چلا۔

تجربہ :

دراصل منظم طریقے سے خاص حالات میں مشاہدے کا نام ہی تجربہ ہے۔ یہ تجربات کمرۂ جماعت میں بھی کیے جا سکتے ہیں اور تجربہ گاہ میں بھی۔ ان میں ایک تجربہ کرنے والا ہوتا ہے جو پہلے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ کس چیز کا مطالعہ کن حالات میں کرے گا اور یہ تجربہ کس پر ہو گا۔ مثلاً آپ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ شور و غل کا یادداشت پر کیا اثر ہوتا ہے تو آپ بچوں کے دو ایسے گروہ لیتے ہیں جو عمر، تعلیم اور ذہانت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے برابر ہوں۔ یادداشت کے لیے ایک پچاس الفاظ کی فہرست لیتے ہیں۔ ایک گروپ کو ہم الف اور دوسرے کو ب کہتے ہیں۔ گروپ الف کو ہم ایک کمرے میں بٹھا کر فہرست یاد کرنے کے لیے دیتے ہیں اور اس کمرے میں ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے خوب شوروغل کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ بچوں کو فہرست یاد کرنے کے لیے ایک گھنٹہ دیا جاتا ہے۔

گروپ ب کو بھی ایک گھنٹہ میں وہی فہرست یاد کرنے کے لیے دیتے ہیں لیکن اس دفعہ کمرے میں اور اس کے باہر مکمل خاموشی رکھی جاتی ہے۔ اس عمل کے تین گھنٹے بعد دونوں گروہوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ یاد کیے ہوئے الفاظ لکھیں۔ اگر گروپ الف میں بچوں کے یاد کیے ہوئے الفاظ کی اوسط صرف 20 ہے اور گروپ ب میں 40 تو ہم کہتے ہیں کہ تجربہ سے پتا چلا کہ شور و غل کی حالت میں کم مواد یاد ہوتا ہے۔

ان دو طریقوں کے علاوہ استاد مندرجہ ذیل طریقے بھی استعمال کرتا ہے۔ ان کی تفصیل انفرادی اختلافات کے باب میں پیش کی جائے گی۔

۱ - سوالنامے

۲ - انٹرویو

۳ - سوانح عمری

۴ - معیاری امتحانات

تعلیمی نفسیات کی اہمیت -

تعلیمی نفسیات ایک اطلاقی سائنس ہے یعنی اس کے اصول اور حقائق تعلیمی مسائل حل کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ موضوعات اور مقاصد اس طرح مرتب کیے جاتے ہیں کہ اساتذہ ان سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکیں۔ تعلیمی نفسیات کی اہمیت کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم یہ دیکھیں کہ استاد کے کیا مختلف فرائض ہیں؟

استاد کا کام ہے سکھانا۔ وہ پڑھنا لکھنا سکھاتا ہے۔ بچے کبھی اس سے سوئی پکڑنا سیکھتے ہیں تو کبھی ہتھوڑا پکڑنا۔ کبھی جمع تفریق سیکھتے ہیں اور کبھی ضرب تقسیم۔ تعلیمی نفسیات میں سیکھنے کے عمل پر غور کیا جاتا ہے لہٰذا استاد اپنے مطالعہ سے تدریس کے بہتر طریقے استعمال کرتا ہے۔ اسے بچوں میں دلچسپی پیدا کرنے کی اہمیت کا علم ہوتا ہے اور وہ مختلف طریقوں سے اپنی تدریس میں

دلچسپی پیدا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ استاد کو کلاس میں نظم و ضبط قائم رکھنا ہوتا ہے۔ تعلیمی نفسیات کے علم سے اسے پتا چلتا ہے کہ بچے شرارتیں کرتے ہیں تو اس کی وجہ کیا ہوتی ہے۔ کیونکہ بچے کا کوئی فعل بلاوجہ نہیں ہوتا۔ وہ مشاہدے اور دیگر طریقوں سے وجہ معلوم کرتا ہے اور اس کے بعد مناسب اقدام کرتا ہے تاکہ بچے کی اصلاح ہو جائے، کیونکہ نفسیات اس بات پر زور دیتی ہے کہ استاد کو بھی ایک ڈاکٹر کا سا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ علم نفسیات کی مدد سے استاد کو ان وجوہات کا پتا چلتا ہے جو بچوں کو شریر بناتی ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سزا اور مار پیٹ سے نہ بچے کی اصلاح ہو گی اور نہ صحیح نظم و ضبط قائم ہو گا۔ علم نفسیات میں نظم و ضبط کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے اور یہ علم استاد کو بتاتا ہے کہ کلاس میں ڈر اور خوف کی وجہ سے مکمل خاموشی کا نام نظم و ضبط نہیں بلکہ بچے میں قانون کے لیے عزت و احترام کا احساس پیدا کیا جائے اور قانون ایسے بنائے جائیں جو اس کی عمر اور پختگی کے مطابق ہوں۔ اس مقصد کے لیے اصول اور قانون وضع کرتے وقت بچوں کی رائے لینے سے ان میں قانون کی عزت و احترام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

استاد کا کام بچوں کی رہنمائی بھی ہے۔ ہر انسان کو زندگی میں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے بچوں میں یہ صلاحیت پیدا کرنا ضروری ہے کہ وہ ان مشکلات پر قابو پائیں اور ان کا مناسب حل ڈھونڈیں۔ تعلیمی نفسیات کی مدد سے استاد بچوں کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔ بچوں کی ذاتی، تعلیمی اور پیشہ ورانہ رہنمائی سے ان کی شخصیت سنورتی اور نکھرتی ہے۔ بہترین استاد وہی ہے جو بچوں میں صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرے۔ ہمارے ملک کی اکثریت ناخواندہ ہے لہٰذا بہت سے والدین تعلیم سے محروم ہیں۔ استاد معاشرے کا تعلیم یافتہ فرد ہونے کی حیثیت سے والدین تک ایسی معلومات پہنچا سکتا ہے جو بچوں کی مناسب پرورش کے لیے

ضروری ہیں اور نفسیات ایک ایسا علم ہے جو بچوں اور ان کی نشوونما کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے ۔ استاد کا ایک اہم کام بچوں کی تعلیمی ترقی کا جائزہ لینا ہے ۔ یہاں لفظ امتحان اس لیے استعمال نہیں کیا گیا کہ جائزہ ایک وسیع منصوبے کا نام ہے اور امتحان ایک محدود طریقہ ہے ۔ پچھلے چند سالوں میں ماہرین نفسیات نے کئی ایسے طریقوں کو رواج دیا ہے جن کی مدد سے ان جملہ تبدیلیوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے جو بچے میں رونما ہوتی ہیں. ان تبدیلیوں سے استاد کو یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ جدید طریقے کئی طرح سے تعلیم و تدریس میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں اور ان کا مقصد صرف یہ نہیں کہ بچوں کو پاس یا فیل کیا جائے ۔

ناخواندگی ہمارے ملک کا ایک بڑا مسئلہ ہے ۔ ملک کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ تعلیم حاصل کریں تاکہ ملک کے وسائل سے فائدہ اٹھایا جائے اور ہر انسان کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں ۔ یہ اس وقت ہی ممکن ہو سکتا ہے جب ہمارے استاد جدید تحقیق سے استفادہ کریں اور تدریس کو بہتر بنائیں ۔ ناقص تدریس کی وجہ سے فیل ہونے والوں کی تعداد بڑھتی ہے ۔ بچے ابتدائی تعلیم مکمل کیے بغیر سکول چھوڑ دیتے ہیں اور بعض اوقات پڑھے لکھے بھی اپنے غلط طور طریق سے جاہلوں سے بھی بدتر نظر آتے ہیں ۔

تعلیمی نفسیات ان مسائل کے حل میں بہت مددگار ثابت ہو سکتی ہے ۔ اگر استاد تعلیمی نفسیات سے استفادہ کر کے پڑھائے گا تو بچوں میں تعلیم کے لیے دلچسپی پیدا ہو گی ۔ وہ سکول سے نہیں بھاگیں گے ۔

سوالات

۱۔ اساتذہ کی تربیت میں تعلیمی نفسیات کا مضمون شامل کرنا کیوں ضروری ہے ؟

۲۔ چند ایسے تعلیمی مسائل کا ذکر کیجیے جن کے حل میں تعلیمی نفسیات مددگر ثابت ہو سکتی ہے ۔

۳۔ انسان کے کردار کے مطالعہ کے طریقے بیان کیجیے ۔ کیا ہم ان کو سائنسی طریقے کہہ سکتے ہیں ؟

۴۔ تعلیمی نفسیات کے مقاصد کیا ہیں اور ان کا تدریس سے کیا تعلق ہے مثالیں دے کر واضح کیجیے ۔

۵۔ تعلیمی نفسیات کے کون کون سے موضوعات ہیں جن کا تعلق براہ راست تدریس سے ہے ؟

چھٹا باب

بچوں کی نشوونما

استاد خواہ ابتدائی مدارس میں پڑھاتا ہو خواہ ثانوی مدارس میں ، اس کا واسطہ مسلسل ایسے افراد سے ہوتا ہے جو بدل رہے ہیں اور بڑھ رہے ہیں ۔ ان میں سے کچھ تبدیلیاں جسمانی ہوتی ہیں اور کچھ نفسیاتی ۔ ان جملہ تبدیلیوں کا نام نشوونما ہے ۔ بچے میں سب سے زیادہ نمایاں تبدیلیاں جسمانی ہوتی ہیں لیکن نشو و نما سے مراد صرف قد یا وزن کا بڑھنا نہیں ہے بچے میں ذہنی،جذباتی ، معاشرتی اور اخلاقی تبدیلیاں بھی رونما ہوتی ہیں ۔ وہ بولنے ، پڑھنے اور لکھنے کی مہارتیں بھی سیکھتا ہے ۔

اگر جسم کی نشوونما کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اس پر وراثت اور ماحول دونوں اثر انداز ہوتے ہیں ۔ قد کا بڑھنا ، دودھ کے دانت ٹوٹنا اور اصلی دانتوں کا نکلنا ایسی تبدیلیاں ہیں جو پختگی کے عمل میں شامل ہیں۔ ان کا وراثت سے گہرا تعلق ہے اور یہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ازخود نمایاں ہوتی ہیں ۔

اس کے برعکس ایک شیرخوار بچے کو لیجیے جو ماں کو دیکھ کر روتے روتے چپ ہو جاتا ہے یعنی وہ ماں کو پہچان جاتا ہے ۔ چند مہینوں میں وہ اسے ماں کہہ کر پکارتا ہے ۔ چند سالوں بعد سکول جاتا ہے اور اس لائق ہو جاتا ہے کہ لکھ پڑھ سکے ۔ کیا وہ یہ تمام کام بغیر سیکھے یا بغیر کسی تجربے کے کر سکتا ہے ؟ اور کیا وہ مختلف قسم کے کام ایک خاص وقت سے پہلے کر سکتا ہے ؟ ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نشوونما میں پختگی کے عمل اور سیکھنے کے عمل کا ایسا امتزاج ہے کہ دونوں کو علیحدہ کرنا مشکل ہے ۔

اکثر اوقات لوگ اس بحث میں پڑ جاتے ہیں کہ بچے کے افعال، اعمال اور کردار پر وراثت کا زیادہ اثر ہے یا اس کے ماحول کا۔ اس سلسلے میں جو لوگ وراثت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ بچہ اس دنیا میں سیکھنے کی صلاحیت لے کر آتا ہے اور اس کی نشوونما اور ترقی کا انحصار ان عناصر پر ہے جو اسے اپنے آباواجداد سے ورثے میں ملتے ہیں اور پیدائش کے وقت اس میں موجود تھے۔ لہٰذا والدین اور اساتذہ کے لیے یہ ممکن نہیں کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی لائیں۔ اس کے برعکس جو لوگ ماحول کی اہمیت کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ وراثت کی عائد کردہ حدود اتنی مستقل اور دیرپا نہیں ہوتی ہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اگر بچے کے ماحول کو بہتر بنایا جائے تو اس کی صلاحیتیں ابھر سکتی ہیں اور اس کی کارکردگی بہتر ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں نظریے انتہا پسندانہ ہیں۔ ایک بچے کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ صرف ماحول یا صرف وراثت کو اہمیت دینا بے سود ہے۔ نشوونما ان دونوں کے تفاعل کا نتیجہ ہے۔

اگر بچے کو اپنے والدین سے ورثے میں اعلیٰ ذہانت ملی ہے لیکن وہ ایسے ماحول میں پرورش پاتا ہے جہاں غربت ہے اس کے والدین ان پڑھ ہیں اور اسے بھی یہ موقعہ نہیں ملتا کہ وہ کسی مدرسے میں داخل ہو تو اس بچے کی ذہانت کو پھلنے پھولنے کا موقعہ نہیں ملے گا۔ ایک اور بچہ پیدائشی کند ذہن ہے اس کی پرورش خواہ کتنے ہی اعلیٰ ماحول میں کی جائے اسے بہترین سے بہترین سکول میں بھیجا جائے، وہ تعلیمی لحاظ سے عام بچوں سے پیچھے ہی رہے گا۔ اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ غیر معمولی ذہانت کا مالک بن جائے اور کوئی سائینسدان یا ادیب بن کر نام پیدا کرے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے یعنی اپنی کفالت کر سکے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جہاں تک موروثی خصوصیات کا تعلق ہے استاد انہیں نہیں بدل سکتا، لیکن بچوں

کی نشوونما کے لیے ماحول کو بہتر بنا سکتا ہے تاکہ بچے کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقعہ ملے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ استاد کو نشوونما کے اصولوں کا علم ہو۔

نشوونما کے اصول

بچہ جب نشوونما کے ایک دور سے دوسرے دور میں داخل ہوتا ہے تو اس میں کئی قسم کی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ تحقیق سے پتا چلا ہے کہ ان تبدیلیوں کے پیچھے چند اصول کارفرما ہوتے ہیں۔

۱۔ نشوونما ایک سلسلہ وار عمل ہے

اس اصول کا مطلب ہے کہ نشوونما ایک زینے کی مانند ہے اور اس زینے کی دوسری سیڑھی تک پہنچنے کے لیے پہلی سیڑھی سے گزرنا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے نشوونما ایک تدریجی سلسلہ ہے۔ اس میں مختلف منازل اور دور آتے ہیں۔ ایک منزل دوسری منزل کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ مثلاً پہلے بچہ بیٹھنا شروع کرتا ہے پھر وہ گھٹنوں چلتا ہے، اس کے بعد وہ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے بعد چلنا شروع کرتا ہے۔ اسی طرح بچہ پہلے غوں غاں کرتا ہے پھر ماما یا دادا کہنے لگتا ہے پھر ایسے جملے بولتا ہے جس میں دو یا تین الفاظ ہوں اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ لمبی لمبی تقریریں کرنے لگتا ہے۔ اس اصول کو سمجھنے سے استاد کو نصاب تیار کرنے اور تدریس میں بہت مدد ملتی ہے۔

۲۔ ہر بچے کی نشوونما کی رفتار مختلف ہوتی ہے۔

اگرچہ بچوں کی نشوونما کا سلسلہ یکساں ہوتا ہے تاہم ہر بچہ اپنی خصوصی اور انفرادی رفتار سے بڑھتا پھولتا ہے کیوں کہ ہر بچہ پیدائشی طور پر دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور ہر بچے کا اپنا ماحول ہوتا ہے۔ اکثر اوقات اساتذہ ان انفرادی اختلافات کو نظرانداز کر دیتے ہیں اور بچوں سے یکساں قسم کی توقعات وابستہ کرتے ہیں۔ اسی طرح والدین بھی ان اختلافات کو نہیں سمجھتے۔ والدین

اور اساتذہ کا اس قسم کا رویہ بچوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ والدین اور اساتذہ کے لیے یہ بات اضطراب کا باعث بن سکتی ہے کہ بعض بچے اپنے بہن بھائیوں یا ہم عمروں جیسے کیوں نہیں ہیں۔ حالانکہ اس قسم کے اختلافات کا موجود ہونا ایک فطری بات ہے۔

۳۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں میں نشو و نما کی رفتار مختلف ہوتی ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ نشوونما کئی قسم کی تبدیلیوں کا نام ہے یعنی بچے کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو بچہ جسمانی لحاظ سے تیزی سے بڑھ رہا ہے، اس کی ذہنی نشوونما کی بھی وہی رفتار ہو۔ تجربے اور تحقیق سے پتا چلا ہے کہ بچے کی جسمانی، ذہنی اور جذباتی نشوونما یکساں نہیں ہوتی۔ بعض اوقات دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک پانچ سالہ بچہ گو قد میں چھوٹا ہے لیکن وہ گفتگو سات سال کے بچے کی طرح کرتا ہے اور وہ بات بات پر اس طرح رو پڑتا ہے جیسے کہ تین سالہ بچے۔ یعنی وہ ذہنی طور پر اپنے ہم عمروں سے آگے ہے لیکن جذباتی طور پر وہ پیچھے رہ گیا ہے۔ لہٰذا ایک خاص عمر کے بچے کے لیے ممکن نہیں کہ اس کی ذہنی، جذباتی اور جسمانی پختگی کی سطح ایک ہو۔

۴۔ نشوونما کے مختلف پہلو ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس اصول کا مطلب ہے کہ نشوونما کے پہلوؤں میں ایک ربط ہوتا ہے یعنی جسمانی، ذہنی اور جذباتی نشوونما کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ مثلاً ایک پندرہ سال کا لڑکا قد میں اپنے ہم عمروں سے چھوٹا ہے اور اس میں اب تک وہ جسمانی خصوصیات نمایاں نہیں ہوئی ہیں جو ایک پندرہ سال کے لڑکے میں پائی جاتی ہیں تو ضروری بات ہے کہ وہ جذباتی طور پر مضطرب ہو جائے گا اور ممکن ہے کہ اس بات کا اس کے ذہن پر بھی اثر پڑے اور وہ تعلیمی طور پر بھی دوسروں سے پیچھے رہ جائے۔ اسی طرح ایک ایسے بچے کا مشاہدہ کریں جس نے ابھی چلنا شروع کیا ہے، اس بچے میں تجسس زیادہ ہو گا

اس کی توجہ کھلونوں سے ہٹ کر ماحول کی دیگر اشیا کی طرف مبذول ہو گی اور اس طرح اس کی دلچسپیاں بدل جائیں گی ۔ وہ نئے الفاظ سیکھ جائے گا ۔ اس کے الفاظ کا ذخیرہ یک دم وسیع ہو جائے گا

بچوں کے مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل ڈھونڈنے کے لیے ضروری ہے کہ اس اصول کو مدنظر رکھا جائے اور بچے کو مجموعی طور پر سمجھا جائے ۔ جس بچے کو آپ پڑھنا سکھا رہے ہیں وہ چند جذبات رکھتا ہے ، اس کی کچھ عادتیں ہیں ۔ اس کا پچھلا تجربہ ہے ۔ لہٰذا آپ کا تعلق صرف اس کے ذہن سے نہیں بلکہ اس کی پوری ذات سے ہونا چاہیے ۔

نشوونما اصولوں کو سمجھنے کے بعد ضروری ہے کہ نشوونما کے مختلف پہلوؤں کا بغور مطالعہ کیا جائے ۔ چونکہ اس کتاب میں ہمارے مطالعے کا موضوع ایسے بچے ہیں جو چھٹی ، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں میں پڑھ رہے ہیں ۔ لہٰذا اس دور کی نشوونما پر توجہ دی جائے گی اور مندرجہ ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی ۔

۱ ۔ جسمانی نشوونما

۲ ۔ جذباتی نشوونما

۳ ۔ معاشرتی نشوونما

۴ ۔ ذہنی نشوونما ۔

۱ ۔ جسمانی نشو و نما

چھٹی ، ساتویں اور آٹھویں جماعت میں پڑھنے والے بچوں کی عمر عام طور پر گیارہ اور چودہ سال کے درمیان ہوتی ہے ۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بجا ہوگا کہ بچہ اپنی عمر کے اس دور میں ہے جس میں وہ بچپن کو خیرباد کہہ رہا ہے اور دور بلوغت میں قدم رکھنے والا ہے ۔

5 اور 10 سال کے درمیان بچے کا قد اور وزن زیادہ تیزی سے نہیں بڑھتا لیکن گیارہ سال کے بعد عام طور پر یہ رفتار تیز ہو جاتی ہے ۔

گیارہ سال کے لڑکے لڑکیوں کی لمبائی تقریباً ایک سی نہیں ہوتی ہے لیکن لڑکیوں کی نشو و نما کی رفتار لڑکوں کی نسبت قدرے تیز ہوتی ہے ، اس لیے تیرہ یا چودہ سال کی لڑکی اسی عمر کے لڑکے کے مقابلے میں زیادہ بڑی نظر آتی ہے۔

وزن کے بڑھنے میں اتنی باقاعدگی نہیں ہوتی جتنی کہ قد میں ہوتی ہے کیونکہ اس پر خوراک ، بیماری اور جذبات کا بہت اثر ہوتا ہے۔ لڑکوں کا وزن لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔

جسمانی نشو و نما پر اثر انداز ہونے والے عوامل

بچے کی جسمانی نشو و نما کی امکانی قوت اسے اپنے آباواجداد سے ورثے میں ملتی ہے لیکن اس کے پوری طرح ظہور میں آنے کا انحصار ماحول پر بھی ہے۔ ماحول سے مراد ہے گھر والوں کا رویہ اور ان کے باہمی تعلقات ، خوراک ، والدین کا پیشہ اور ان کی تعلیم - یہ سب ایسے عوامل ہیں جو بچے کی جسمانی نشو و نما پر اثر انداز ہوتے ہیں - مثلاً اگر گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑا ہے تو بچوں کی نگہداشت اچھی طرح نہیں ہوتی - والدین تعلیم یافتہ ہیں تو بچوں کو مناسب خوراک دیں گے - ان کا ڈاکٹری معائنہ کروائیں گے ، بیماریوں سے بچاؤ کے طریقے اختیار کریں گے اور اس سے پہلے کہ بیماری اپنے دائمی اثرات چھوڑے والدین اس کا مکمل علاج کروا کے بچوں کو پھلنے پھولنے کے مناسب مواقع فراہم کریں گے اور ان کے کھیل اور آرام کا خاص خیال رکھیں گے۔

مناسب اور غیر مناسب خوراک کے اثرات بچے کی جسمانی وضع قطع اور کارکردگی سے ظاہر ہو جاتے ہیں - جو بچے مناسب خوراک کھاتے ہیں ان کی صحت ٹھیک رہتی ہے اور وہ ہر کام چستی سے کرتے ہیں۔

جسمانی نشو و نما کی تعلیمی اہمیت

جو بچہ حصول علم میں مصروف ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی جسمانی صحت تسلی بخش ہو - وہ کام کرنے کی قوت رکھتا ہو ،

اس میں چستی اور پھرتی ہو ، اس کا وزن مناسب ہو ، ورنہ وہ پڑھائی کی طرف توجہ نہ دے سکے گا ۔ اگر وہ موٹاپے کا شکار ہے تو بچوں کے تمسخر کا نشانہ بن جائے گا ۔ بعض بچے آئے دن کئی بیماریوں کی وجہ سے سکول سے غیر حاضر رہتے ہیں ۔ اس کے لیے سکولوں میں ڈاکٹری معائنہ کا انتظام کیا جائے تاکہ بچوں کے جسمانی نقائص کا پتا چل جائے اور ان کا تدارک کیا جائے ۔ مثلاً کسی بچے کی بینائی کمزور ہے تو اس کو عینک لگوانے کا مشورہ دیا جائے یا وہ کسی مرض میں مبتلا ہے تو تشخیص کر کے علاج کی طرف رجوع کیا جائے ۔ وقتاً فوقتاً والدین سے رابطہ قائم کر کے استاد انھیں مناسب خوراک ، بچوں کی نشو و نما اور کھیل کود کی اہمیت کے بارے میں معلومات فراہم کر سکتے ہیں ۔ ہمارے ملک میں اکثر لوگ ناخواندہ ہیں اور بچوں کے ساتھ ساتھ والدین کو تعلیم دینے کی ذمہ داری بھی مدرسے پر عاید ہوتی ہے ۔

سکولوں میں جسمانی ورزش اور کھیل کود کے مواقع فراہم کیے جائیں ۔ اس کے علاوہ بچوں کی اس بات میں مدد کی جائے کہ وہ اپنے میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھ سکیں ورنہ ممکن ہے کہ وہ ان تبدیلیوں سے خوفزدہ ہو جائیں ۔ اکثر اوقات بچوں کی اس سلسلے میں رہنمائی نہیں کی جاتی اور وہ نامناسب ذرائع سے غلط معلومات حاصل کر لیتے ہیں جو ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں ۔

جو بچے تیزی سے نہیں بڑھتے وہ پریشان ہو جاتے ہیں کیونکہ ایک انسان کے لیے اس کی ظاہری شکل و صورت بہت اہمیت رکھتی ہے ۔ اسی طرح ضرورت سے زیادہ موٹے یا دبلے بچے بھی فکر مند ہو جاتے ہیں ، کیونکہ دوسرے بچے ان کا مذاق اڑاتے ہیں ۔ اس سلسلے میں بچوں سے بات چیت کر کے استاد انھیں فکر سے آزاد کرا سکتا ہے ، انھیں اطمینان دلا سکتا ہے کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے ۔ وہ موٹے بچوں کو بتا سکتا ہے کہ وہ کیا کھائیں ، کس طرح ورزش کریں وغیرہ ۔

۲ - جذباتی نشو و نما

نشو و نما کا سب سے زیادہ ناقابل فہم پہلو جذبات ہیں - جب انسان اپنے ماحول سے خوش ہوتا ہے تو اس میں خاص رد عمل پیدا ہوتا ہے - اسی طرح جب وہ ناخوش ہوتا ہے تو مختلف قسم کا رد عمل رو نما ہوتا ہے - اس قسم کے جوابی عمل کو جذبات کا نام دیا جاتا ہے - [illegible] کیفیت جذبات کا ایک اہم حصہ ہے - یہ جذبات خوشگوار بھی ہوتے ہیں اور ناخوشگوار بھی - خوشی، محبت اور امید ، خوشگوار جذبات ہیں اور غصہ ، حسد ، خوف اور نفرت ناخوشگوار - گیارہ سے چودہ سال کے بچے یہ سمجھ چکے ہوتے ہیں کہ غصے اور خوف کے جذبات سے بے قابو ہونا ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے - بات بات پر رونے پر ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے - لہٰذا اس عمر کے بچوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے جذبات کا موقعہ و محل کے مطابق اظہار کریں - اس عمر کے بچے عام طور پر خوش نظر آتے ہیں - ان کے بچپن کے خوف بھی ختم ہو جاتے ہیں - وہ اب کتوں ، بلیوں ، کیڑوں یا بھوت پریت سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا کہ پہلے ڈرتے تھے -

اس عمر کے بچے اکثر غصے سے بے قابو ہو جاتے ہیں ، کیونکہ اس عمر میں ان کی آزادی کی خواہش ابھرتی ہے اور والدین یا اساتذہ جب اس خواہش کو پورا نہیں کرتے تو بچہ غصے میں آ جاتا ہے - وہ اس وقت بہت ناراض ہوتا ہے جب اس کے کام یا کھیل میں دخل دیا جائے اور اسے کوئی اور کام کرنے کے لیے کہا جائے یا اسے سب کے سامنے ڈانٹا جائے یا اس کا مقابلہ دوسرے بچوں سے کیا جائے - اس کو ناانصافی کا احساس بھی بہت شدید ہوتا ہے - اسے اپنی ناکامی کا احساس بھی بہت پریشان کرتا ہے - اس کا اظہار بچے زبان سے بھی کرتے ہیں اور ہاتھوں سے بھی لیکن خاص بات یہ ہے کہ ان کا غصہ دیرپا نہیں ہوتا - بہرحال جذباتی لحاظ سے بچے اب پختگی کی طرف مائل نظر آتے ہیں اور ان کی طفلانہ حرکات کافی حد تک کم ہو چکی ہوتی

لڑکے شرمانا اور جھجکنا کم کر دیتے ہیں لیکن لڑکیوں میں شرم کا احساس زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس عمر میں بچے پڑھائی، بیماری اور والدین کی صحت کے بارے میں فکر کرتے ہیں۔ اب وہ والدین اور اپنے ہم جولیوں کی توقعات پر پورا اترنا چاہتے ہیں۔

بچے کی جذباتی نشو و نما پر اثر انداز ہونے والے عوامل

جب بچے کی فطری خواہشات کی تسلی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو وہ جذباتی طور پر مضطرب ہو جاتا ہے اور اس میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مضطرب اور بے چین بچے ایسے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں جہاں بچوں کی فطری خواہشات کو دبایا جائے یعنی ماں باپ انھیں پیار و محبت سے محروم رکھیں، ان کی آزادی سلب کر دیں، انھیں بات بات پر سزا دیں۔ ایسے بچے خوف، غصے اور تفکرات کے شکار ہو جاتے ہیں۔ گھر میں والدین میں ناچاقی، ایک دوسرے کے لیے عزت اور لحاظ کی کمی، بچوں کو یہ سکھاتی ہے کہ زندہ رہنے کا یہی طریقہ ہے۔ وہ بھی بات بات پر لڑتے ہیں اور غصے پر قابو پانا نہیں سیکھتے۔

بعض اوقات والدین بچوں سے غلط قسم کی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور بچے کو احساس ہوتا ہے کہ وہ ان توقعات پر پورا نہیں اتر رہا ہے تو وہ احساس ناکامی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ایک کمتر قسم کا انسان ہے۔

جذباتی نشو و نما کی تعلیمی اہمیت

خوف اور غصے میں مبتلا بچے سیکھنے سے قاصر رہتے ہیں مثلاً اگر بچہ کلاس میں ڈرا ہوا بیٹھا ہے اور استاد کہتا ہے $3 \times 2 = 6$ تو ممکن ہے کہ وہ سنے $3 \times 2 = 7$ یا اگر وہ صحیح سمجھ بھی لے تو خوف کی حالت میں وہ یاد نہیں کر سکتا اور سبق جلد بھول جاتا ہے یعنی ناخوشگوار جذبات عقل پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس خوشگوار جذبات کا مطلب ہے کہ بچے اپنے ماحول سے خوش ہیں کیونکہ ان کا رد عمل

خوشگوار ہے۔ خوشی کی حالت میں وہ کام پر پوری توجہ دیتے ہیں اور پڑھایا ہوا سبق اچھی طرح یاد کرتے ہیں۔ کامیاب استاد یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ دوران تدریس بچوں میں خوشگوار جذبات پیدا کرے، غصے اور خوف کو جگہ نہ دے۔

آج کے بچے کل کے بڑے ہیں۔ ایسے بچے جو جذبات سے بے قابو ہو جاتے ہیں بڑے ہو کر گھر میں، شہر میں، اور پھر ملک میں بد امنی اور افراتفری پیدا کرنے کا سبب ہو سکتے ہیں۔ گھر اور سکول ہی ایسی جگہیں ہیں جہاں بچوں کو جذبات پر قابو پانا سکھایا جا سکتا ہے۔ استاد اور والدین اپنے رویے اور سلوک سے بچے کے لیے نمونہ پیش کر سکتے ہیں اور بچے ان کی تقلید کر کے صحیح راہ اختیار کر سکتے ہیں۔ ایسا استاد جو بات بات پر غصہ کرے اور طیش میں آئے بچوں کو برا بھلا کہے، بچوں کی جذباتی نشو و نما پر برا اثر ڈالتا ہے۔ اس کے برعکس ایسا استاد جو بچوں سے پیار و محبت سے پیش آتا ہے انہیں ڈراتا دھمکاتا نہیں، ایسا ماحول فراہم کرتا ہے جس میں بچے کے جذبات کی صحیح پرورش ہوتی ہے تو اس کے جذباتی طور پر صحت مند ہونے کے امکان روشن ہو جاتے ہیں۔

۴۔ معاشرتی نشو و نما

عام طور پر دس سال کے بعد بچے عمر کے ایسے دور میں داخل ہوتے ہیں جب ان میں یہ خواہش شدت اختیار کر لیتی ہے کہ ان کے دوست ان کو پسند کریں۔ وہ اپنے ہمجولیوں میں شامل ہوں اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ ناخوش اور پریشان رہنے لگتے ہیں۔ یہاں یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس سے پہلے بچہ خود غرضی اور خود مرکزیت کے دور میں تھا یعنی اسے دوسروں میں اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی کہ اپنی ذات میں اور اسی لیے وہ بات بات پر لڑتا تھا لیکن دس گیارہ سال کی عمر میں وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ دوستوں میں مقبول ہو، اس لیے وہ انہیں خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے، ان سے ہر کام میں تعاون کرتا ہے اور اس کوشش میں ہر قربانی دینے کو تیار ہوتا ہے۔

اب وہ ایک یا دو بچوں کی دوستی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ دوستوں کے گروہ میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ وہ ایسے کھیل کھیلتا ہے جس میں پوری ٹیم ہو۔ وہ اپنے کلب یا سوسائٹی بناتے ہیں، اس کا لیڈر چنتے ہیں اور اس کے قوانین وضع کرتے ہیں۔ اس باہمی میل جول کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے اپنے ہم عمروں کی خوشی کی خاطر قوانین کی پابندی کرتے ہیں، انصاف اور لاقانونیت میں امتیاز کرتے ہیں، تعاون اور ہمدردی کی قدر پہچان جاتے ہیں اور تمسخر کے ڈر سے اپنی طفلانہ حرکات کو خیر باد کہتے ہیں۔ عام طور پر ایسے بچے اپنے ہم عمروں میں زیادہ مقبول ہوتے ہیں جو کھیل میں اچھے ہوں، خوش مزاج ہوں، جن کی دلچسپیاں کئی قسم کی ہوں، ہارجیت کے وقت خندہ پیشانی سے پیش آتے ہوں، دوسروں پر رعب نہ ڈالتے ہوں اور اپنے کھلونے یا کتابیں ایک دوسرے کو دینے میں تامل نہ کرتے ہوں۔

جو بچے ناپسند کیے جاتے ہیں وہ دوسروں سے بری طرح پیش آتے ہیں۔ جیت کر شیخی میں آ جاتے ہیں اور ہار کر رو پڑتے ہیں، بات بات پر رعب ڈالتے ہیں، اپنی چیزیں دوسروں کو نہیں دیتے اور ہر دفعہ اپنی مرضی دوسروں پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔

معاشرتی نشو و نما پر اثر انداز ہونے والے عوامل

والدین کی شخصیت اور بچوں کی پرورش کے طریقوں پر کی گئی تحقیق سے پتا چلا ہے کہ جن بچوں کو پیار محبت کی فطری خواہش کی تسکین کا موقع نہیں ملتا وہ تشنہ رہ جاتے ہیں اور اپنی زندگی میں دوسروں سے یا تو خوفزدہ رہتے ہیں یا ان میں لوگوں کے خلاف نفرت کے جذبات جنم لے لیتے ہیں۔

ایسے گھرانے جہاں ماں باپ بچوں کی پرورش پر صحیح توجہ دیتے ہیں، انھیں پیار کی دولت سے مالا مال کرتے ہیں اور باہمی اعتماد اور میل جول کا نمونہ پیش کرتے ہیں، وہ بچے معاشرتی طور پر صحیح راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کو خوش کرنے کی کوشش

کرتے ہیں کیونکہ اس طرح سے وہ خود بھی خوش رہتے ہیں - ایسے بچے اپنے تعلقات بہتر بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں - اس کے برعکس خود غرضی ، جھگڑالو اور آدم بیزار والدین کے بچے بھی ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں -

معاشرتی نشو و نما کی تعلیمی اہمیت

کمرۂ جماعت ایک طرح کا معاشرہ ہے جس میں بچہ ایک گروہ سے تعلق رکھتا ہے - اس گروہ کے کچھ قواعد و ضوابط ہوتے ہیں - اس گروہ کے افراد ایک دوسرے سے چند توقعات وابستہ کرتے ہیں اور یگانگت کی خواہش کی تشفی کرتے ہیں - اس گروہ کا لیڈر استاد ہوتا ہے - اگر استاد بچوں کی نشو و نما کے ادوار سے آگاہ ہے تو وہ بچوں کو گروہی سرگرمیوں کے ذریعے تعلیم دے گا کیونکہ اس عمر کے بچوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ہر کام گروہ میں کریں - اس طرح بچے تعاون کرنا سیکھتے ہیں ، قاعدے قوانین وضع کرتے ہیں اور پھر ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں -

گروہی کاموں میں سے ایک کام ہے گفتگو اور بحث کرنا - اس کے ذریعے بچے یہ سیکھتے ہیں کہ دوسروں کی بات سننی چاہیے اور یہ کہ اختلاف رائے جھگڑے کا باعث نہیں ہوتا - غرضیکہ کمرۂ جماعت میں بچے جمہوری معاشرے کی قدریں اور طریقے سیکھتے ہیں -

تدریس کے دوران استاد بچوں کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر کے ان میں ایک کو لیڈر منتخب کرا کے ذمہ داری بانٹ دے - اس طرح بچے یہ سیکھتے ہیں کہ لیڈر کی ذمہ داریاں کیا ہیں ، اس کے حقوق اور فرائض کیا ہیں - استاد اپنے رویے سے بھی صحیح قسم کے لیڈر کا نمونہ پیش کرے ، جس میں انصاف پسندی اور مدد کا جذبہ ہو اور جس میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ سب کو کام کرنے کا موقعہ دے اور ان کے کام کو سراہے -

اس کے علاوہ استاد ایسے بچوں کا پتا چلائے جو اپنی جماعت میں ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں اور پھر ایسے بچوں کا بغور

مطالعہ کرے کہ ان کی نامقبولیت کی وجہ کیا ہے ۔ اس کے بعد وہ بچوں میں ایسی عادتیں پیدا کرے کہ وہ دوسروں میں مقبول ہو سکیں ۔ ورنہ یہ بچے ناخوش رہیں گے اور اس کا اثر ان کی پڑھائی پر پڑے گا ۔

۴ ۔ ذہنی نشو و نما

ذہنی لحاظ سے دس سال کا بچہ حقیقت پسند ہوتا ہے۔ وہ اسباب اور ان کے نتائج پر غور کرنا شروع کر دیتا ہے یعنی اب وہ خیالی دنیا سے نکل کر ایسی دنیا میں داخل ہوتا ہے جہاں ہر واقع کا کوئی سبب ہوتا ہے اور ہر سبب کا تعلق نتیجے سے ہوتا ہے ۔ دس سالہ بچے روانی سے پڑھ سکتے ہیں ، ان کے الفاظ کا ذخیرہ وسیع ہوتا ہے ، ان کی قوت استدلال تیز ہوتی ہے ، وہ زیادہ سے زیادہ مواد کافی عرصے تک یاد کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔

ان خواص سے پتا چلا کہ ذہنی نشو و نما سے مراد ہے فہم ، بول چال ، یادداشت اور قوت استدلال ۔ کسی بچے میں یہ خواص کس حد تک موجود ہیں ؟ اس سوال کا جواب ہمیں یہ بتاتا ہے کہ بچے میں سیکھنے کی صلاحیت کتنی ہے یعنی سیکھنے کا انحصار ان خواص پر ہے ۔

ذہانت سے ایسی استعداد مراد ہے جس کی مدد سے انسان سیکھے اور پچھلے تجربات کو وہ اس طرح سے کام میں لائے کہ نئی صورت کا مقابلہ کر سکے ۔ فہم ، بول چال ، یادداشت اور قوت استدلال ایسی صفات ہیں جو سیکھنے کی صلاحیت اور ماحول سے مطابقت کی اہلیت سے وابستہ ہیں ۔ ایک کلاس میں بعض بچے زیادہ ذہین ہوتے ہیں کچھ اوسط درجے اور کچھ غبی ہوتے ہیں ۔ ان کی ذہنی سطح کا علم مشاہدے سے بھی ہوتا ہے اور ذہنی آزمائشوں کی مدد سے بھی ۔ ذہانت کی آزمائشیں تیار کرنے میں سائنسی طریقے اختیار کیے گئے ہیں اور کئی ماہرین نفسیات نے ان پر تحقیق کی ہے ۔ ذہنی آزمائشیں فرد کی ذہنی ترقی اور سطح کا جائزہ لیتی ہیں ۔ یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ ذہانت کی پیمائش براہ راست نہیں ہوتی ۔ اس مقصد کے لیے چند ایسے کرداری

نمونوں کا انتخاب کیا جاتا ہے، جو ذہانت سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اس میں فرد کی کارکردگی کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور اس کی کارکردگی کا اس کے ہم عمروں سے موازنہ کیا جاتا ہے ۔ اگر اس کی کارکردگی اپنے ہم عمروں سے کم ہے تو وہ کم ذہانت کا مالک ہے اور اگر وہ اپنے سے بڑے بچوں کی طرح کام کرتا ہے تو وہ زیادہ ذہین ہے ۔ یعنی ذہانت کی پیمائش کردار کی مدد سے ہوتی ہے کیونکہ آزمائشوں کے علاوہ بچوں کی دلچسپیوں کا مشاہدہ ان کی ذہنی نشو و نما اور ذہنی سطح کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے ۔ جب بچے لڑکپن میں داخل ہوتے ہیں تو وہ ایسی باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں جس سے انھیں کسی چیز کی اصلیت معلوم ہو۔ ان میں تجسس نمایاں ہوتا ہے، وہ ہر شے کی تفصیل میں جاتے ہیں ۔

ذہنی نشو و نما کا اندازہ لگانے کے لیے بچے کی گفتگو ایک عمدہ ذریعہ ہے ۔ الفاظ ، جملے کی ساخت اور گفتگو میں روانی بچے کی ذہانت کی سطح کی نشاندہی کرتے ہیں ۔

ذہانت کا سیکھنے سے گہرا تعلق ہے لہٰذا کم ذہانت کے بچے پڑھائی میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور اعلیٰ ذہانت کے بچے پڑھائی میں ہوشیار ہوتے ہیں ۔

ذہانت کی نشو و نما کے سلسلے میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ عام طور پر ذہنی سطح تمام عمر یکساں رہتی ہے یعنی جو بچے اوائل عمر میں ذہین ہیں وہ بڑے ہو کر بھی ذہین رہیں گے بشرطیکہ ان کا ماحول بھی یکساں ہو ۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ چند بچے ایسے ہوں جن کی ذہانت کی سطح عمر کے ساتھ ساتھ گھٹتی بڑھتی رہے ۔

ذہنی نشو و نما پر اثر انداز ہونے والے عوامل

ذہانت موروثی ہے یا اکتسابی یہ ایک پرانی بحث ہے ۔ ماہرین نے اس بحث کو حل کرنے کے لیے تحقیق کی اور اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ ذہانت کافی حد تک موروثی ہوتی ہے ، لیکن اس پر ماحول بھی بہت

حد تک اثر انداز ہوتا ہے لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ ذہانت ، وراثت اور ماحول دونوں سے متاثر ہوتی ہے۔ ذہانت وراثتی عطیہ ہے۔ پیدائشی کند ذہن بچے کو ماحول ذہین نہیں بنا سکتا لیکن ذہانت کو مکمل طور پر بروئے کار لانے کے لیے موزوں ماحول کی ضرورت ہے یعنی اگر ذہین سے ذہین بچے کو مناسب ماحول نہ ملے تو اس کی فطری ذہانت کو اظہار اور نشو و نما کا موقعہ نہیں ملے گا اور وہ اپنی ذہانت سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکے گا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک اوسط درجے کی ذہانت رکھنے والے بچے کو اعلیٰ تعلیمی ماحول میں رکھا جائے تو وہ پڑھائی میں تسلی بخش ترقی کرے گا اور زندگی میں کسی مناسب اور اعلیٰ مقام پر پہنچ سکے گا ۔ اس کے برعکس اگر اسے برا ماحول ملے تو وہ پڑھائی میں پیچھے رہ جائے گا اور زندگی میں نمایاں کام نہیں کر سکے گا ۔ ہر بچے کا دائرۂ عمل اس کے توارث اور ماحول نے محدود کر دیا ہے ۔

ایسے بچے جن میں کوئی حسی نقص بالخصوص دیکھنے اور سننے کا نقص ہو ذہانت کی آزمائش میں زیادہ نمبر حاصل نہیں کرتے ۔ سیکھنے کا حواس سے گہرا رشتہ ہے لہٰذا ایسے بچوں کی سیکھنے کی صلاحیت حسی نقائص سے متاثر ہوتی ہے ۔

گھریلو ماحول اور ذہانت

تعلیمی لحاظ سے اعلیٰ ماحول میں بچوں کی ذہنی نشو و نما مناسب طریقے سے ہوتی ہے ۔ والدین کی تعلیم ان کا پیشہ ، گھر میں ابلاغ عامہ تک رسائی ایسے عوامل ہیں جس سے ذہانت متاثر ہوتی ہے یعنی عام طور پر تعلیم یافتہ والدین کے بچے ذہین ہوتے ہیں ۔ گھروں میں کتابیں ، رسالے ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی موجودگی ذہنی سطح کو بلند کرتی ہے ۔

دیہاتی اور شہری ماحول

شہری ماحول میں سیکھنے کے زیادہ مواقع فراہم ہوتے ہیں ۔ لہٰذا

ذہنی آزمائشوں میں شہری بچے زیادہ نمبر لیتے ہیں ۔ اس کے مقابلے دیہاتی بچوں کی کارکردگی کم درجے کی ہوتی ہے ۔

ذہانت کی تعلیمی اہمیت

مشاہدے اور ذہنی آزمائشوں کی مدد سے بچے کی ذہنی سطح کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور اس طرح استاد یہ جان سکتا ہے کہ جو بچے پڑھائی میں کمزور ہیں اس کی وجہ ان کی ذہانت ہے یا ان کی عادات اور کم ہمتی ہیں ۔

اکثر اوقات طلبہ کی جماعت بندی ذہنی آزمائشوں کی مدد سے کی جاتی ہے مثلاً استاد ذہنی آزمائش کرنے کے بعد جماعت کو تین گروہوں میں تقسیم کر دے ۔

پہلے گروہ میں ذہین بچے ہوں اور دوسرے میں متوسط ذہانت کے بچے اور تیسرے میں کمزور بچے ۔ اس کے بعد ان کی تعلیم ان کی ذہنی سطح کے مطابق ہو اور ہر گروہ کے بچوں کو ان کی ذہانت کے مطابق کام دیا جائے ۔ ذہین بچے تیزی سے کام ختم کر لیں گے لہٰذا انہیں دوسرا کام دیا جائے ۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو یہ بچے بیزار ہو جائیں گے اور طرح طرح کی شرارتوں پر آمادہ ہو جائیں گے ۔

کمزور بچے ہر کام سست رفتاری سے سیکھتے ہیں ۔ اگر انہیں ذہین بچوں کے ساتھ رکھا جائے گا تو وہ احساس ناکامی کا شکار ہو جائیں گے اور ان کے سیکھنے میں بھی نقص رہ جائے گا اور وہ تعلیم سے پوری طرح مستفید نہیں ہوں گے ۔ بچے کی ذہانت کی سطح سے آگاہی رہنمائی میں مدد دیتی ہے ۔ موزوں مضامین کے انتخاب کے لیے ذہانت کے بارے میں جاننا ضروری ہے ۔ بعض بچے چند مضامین سے نفرت کرنے لگتے ہیں ۔ اس کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ بچے کی ذہنی نشو و نما کے مطابق نہیں ہوتے ۔

استاد ان کے تجربات وسیع کر کے ان کے لیے ایسا ماحول فراہم کرتا ہے جس سے ان کی صلاحیتیں ابھریں ۔ یہاں تجربات سے مراد ہے

علمی سیریں ، سائنس کے تجربے ، انوکھے اور دلچسپ کام اور مفید مشاغل ۔ استاد کو چاہیے کہ وہ بچوں میں تجسس کا مادہ ابھاریں اور تجسس کی تشفی کرنے کے مواقع فراہم کریں ۔

بعض کم ذہانت کے بچوں کو انفرادی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے ۔ وہ جماعت بندی کے باوجود خاطر خواہ ترقی نہیں کرتے ۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ذہنی آزمائشیں بچے کی ذہانت کے بارے میں ایسی معلومات فراہم کرتی ہیں جو تدریس اور رہنمائی کے لیے ممد و معاون ہوں اور اس طرح استاد اپنے کام کو بخوبی ادا کر سکتا ہے ۔

سوالات

۱ - استاد کے لیے یہ کیوں ضروری ہے کہ اسے نشو و نما کے اصولوں کا علم ہو ؟

۲ - کسی ایسے مثالی سکول کا خاکہ پیش کیجیے جو آپ کے خیال میں بچوں کی جسمانی نشو و نما کے لیے موزوں ہو ۔ اس لحاظ سے پاکستانی مدارس میں کیا خامیاں ہیں ؟

۳ - سزا ، تعلّم اور جذبات کا آپس میں کیا تعلق ہے ؟

۴ - معاشرتی نشو و نما کن عوامل سے متاثر ہوتی ہے؟ اس سلسلے میں استاد کے فرائض بیان کیجیے ۔

۔ اگر آپ کو بچوں کی ذہنی سطح کے بارے میں پتا چلانا ہے تو آپ کیا طریقے اختیار کریں گے اور پھر اپنی تدریس کو کس طرح بہتر بنائیں گے ؟

ساتواں باب

تعلّم

مدرسہ ایسی جگہ ہے جہاں مختلف قسم کے تجربات اس لیے فراہم کیے جاتے ہیں کہ بچوں میں مناسب تبدیلیاں لائی جا سکیں - استاد کا کام ہے کہ وہ بچوں میں آمادگی اور دلچسپی پیدا کرے - ان کی رہنمائی کرے تا کہ وہ مدرسے کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکیں - یہ آسان کام نہیں کیونکہ ہر بچہ ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے- وہ جب مدرسے میں داخل ہوتا ہے تو قطعی طور پر ایک سادہ کاغذ کی مانند نہیں ہوتا کہ اس پر آپ اپنی مرضی کے نقوش بنا لیں بلکہ وہ اپنے ساتھ ایسے خواص لاتا ہے جو اسے ورثے میں ملے ہوتے ہیں - وہ اپنے ساتھ ماضی کے بعض تجربات اور اثرات لاتا ہے جو اس کی ننھی سی زندگی میں رونما ہو چکے ہوتے ہیں - وہ اپنے بارے میں اچھی یا بری رائے رکھتا ہے - اس کے ذہن میں مدرسے کا تصور قائم ہو چکا ہوتا ہے - لہٰذا استاد کے قول اور فعل ہر بچے پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ اپنی مخصوص رفتار سے بدلتا اور سیکھتا ہے -

سکول میں داخل ہونے کے دن سے لے کر دس جماعتیں پاس کرنے تک بچے میں کئی قسم کی تبدیلیاں آ چکی ہوتی ہیں - مثلاً بچے کا قد بڑھ جاتا ہے ، وزن میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے ، اس کا ذخیرہ الفاظ وسیع ہو جاتا ہے ، اس کی معلومات دوگنی چوگنی ہو جاتی ہیں ، اس نے کھیلوں میں بھی نمایاں ترقی کر لی ہوتی ہے ، شاید فنون عملی پر بھی عبور حاصل کر چکا ہو ، وہ اپنے حقوق و فرائض سے آگاہ ہو جاتا ہے ، اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھا لیتا ہے ، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے ، اکثر اوقات دوسروں کے فائدے کے لیے اپنے مفاد کی قربانی بھی دے سکتا ہے - ان تبدیلیوں میں سے چند ایسی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ اس میں رونما ہوتی ہیں مثلاً قد اور وزن کا بڑھنا۔ ان

کو تغیرات پختگی کہتے ہیں - ان کے علاوہ چند تبدیلیاں ایسی ہیں جو زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور تجربات کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہو سکتیں مثلاً بچے کا حساب سیکھنا ، کسی خاص زبان میں اظہار خیال کرنا اور کھیل میں مہارت حاصل کرنا - ہر بچہ عمر کے ساتھ حساب خود بخود نہیں سیکھ جاتا - اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے کوئی سکھانے والا ہو ، اس میں سیکھنے کی خواہش ہو اور اسے سیکھنے کے بعد مشق کے مواقع ملتے ہوں -

ایسی تبدیلیوں کو جو تجربات کے نتیجے میں رونما ہوتی ہیں تعلّم کا نام دیا گیا ہے - جب انسان کسی مہیج (Stimulus) سے دوچار ہوتا ہے اور اس میں کوئی رد عمل پیدا ہوتا ہے ، اس کے رد عمل کا نام ہے تجربہ مثلاً ایک بچہ دوڑا دوڑا جاتا ہے اور ایک گرم پانی کی کیتلی کو چھو لیتا ہے- ظاہر ہے اس کا ہاتھ جلے گا اور وہ تکلیف محسوس کرے گا- یہاں گرم کیتلی مہیج ہے اور اسے چھونے کے بعد تکلیف محسوس کرنا رد عمل ہے اور یہ بچے کا تجربہ ہے- اب یہی بچہ دوسرے دن بھی گرم کیتلی دیکھتا ہے لیکن اسے ہاتھ نہیں لگاتا- اب اس میں تبدیلی واقع ہو گئی ہے یعنی وہ اب کیتلی سے دور رہتا ہے - اس کے نزدیک نہیں جاتا - اس تبدیلی کو تعلم کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہ کسی تجربے کی وجہ سے پیش آئی ہے -

یہ ضروری نہیں کہ اس قسم کی تبدیلی کے لیے تجربات یکساں ہوں - یہ بھی ممکن ہے کہ ایک اور بچہ کیتلی کے پاس جاتا ہے تو اس کی ماں کہتی ہے خبردار اس کے قریب نہ جانا ، اور ساتھ ساتھ اس کی پٹائی بھی کر دیتی ہے - بچہ دوسرے دن کیتلی دیکھتا ہے لیکن اس کے قریب نہیں جاتا ہے - ایک تیسرا بچہ دیکھتا ہے کہ اس کا بھائی گرم چیز کو چھونے سے جل گیا تو وہ بھی اس گرم چیز سے دور رہتا ہے - ان بچوں کو مختلف تجربات سے دوچار ہونا پڑا لیکن ان میں یہ تبدیلی آئی کہ وہ گرم چیزوں سے دور رہنے لگے - اکثر اوقات ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تعلم صرف حصول علم یا اکتساب فن کا نام ہے لیکن

یہ ایک محدود نظریہ ہے۔ تعلّم کئی قسم کی تبدیلیوں کا نام ہے۔ اس میں عادات و اطوار، آداب محفل، قوانین کا احترام، ہمدردی، اقدار، نفرت اور محبت اور شخصیت کے دیگر خواص شامل ہیں۔ یعنی بچہ گھر اور مدرسے کے ماحول میں جن تجربات سے دوچار ہوتا ہے ان کے باعث وہ چند عادات سیکھتا ہے۔ اسے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ دوسروں سے کس طرح پیش آنا چاہیے۔ غرضیکہ اس کی شخصیت کی تشکیل میں زندگی کے تجربات خاص کردار ادا کرتے ہیں اور تشکیل کا یہ سلسلہ پیدائش سے لے کر موت تک جاری رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر تعلّم ایک ایسا عمل ہے کہ جس کے ذریعے ایک نوزائیدہ بچہ زندگی کے مختلف ادوار سے گزرنے کے بعد اور چند تجربات سے دوچار ہونے کے بعد ایسا انسان بن جاتا ہے جو سوچ سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے، فیصلے کر سکتا ہے، مسائل حل کر سکتا ہے، جس کی اپنی پسند یا ناپسند ہوتی ہے اور جو ایک نمایاں شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔

شخصیت کی تکمیل میں گھر اور مدرسہ دونوں شریک ہیں۔ بچہ کچھ عادات اور اقدار گھر میں والدین سے سیکھتا ہے اور کچھ مدرسے سے۔ اکثر اوقات سیکھنے کے لیے سکھانے والے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن بعض اوقات بچہ اپنے تجربات سے خود بخود سیکھ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اس بچے کی مثال یاد رکھیے جس نے کیتلی کو ہاتھ لگایا تھا۔ استاد کے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا ہے کہ وہ اس قسم کے تجربات مہیا کرے جس سے بچوں میں پسندیدہ عادات پیدا ہوں۔ انھیں علوم و فنون پر عبور حاصل ہو اور وہ بڑے ہو کر اپنی روزی کما سکیں اور اپنی اور دوسروں کی زندگی بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوں۔

عمل تعلّم کے مراحل

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچوں میں تبدیلیاں کیوں اور کیسے وقوع پذیر ہوتی ہیں اور ان میں سے کون سی دیرپا ہوتی ہیں اور بعض تھوڑے عرصے کے بعد کیوں ختم ہو جاتی ہیں؟

ان سوالات کا جواب دینے کے لیے ہمارے پاس سائنسی تحقیق کا

وسیع ذخیرہ موجود ہے ۔ ان کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عمل تعلم ایک زنجیر کی مانند ہے جس میں کئی کڑیاں ایک دوسرے سے منسلک ہیں ۔ اس لیے تعلم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے مختلف اقدامات کا ذکر کریں ۔

۱ ۔ تحریک :

تحریک سے مراد ہے ایسی نفسیاتی کیفیت جو انسان کو خاص مقصد کے حصول کی خاطر عمل کے لیے ابھارے ۔ سیکھنے والے میں تحریک پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنے ماحول میں مہیج کی طرف رجوع کرتا ہے ۔ تحریک ہمیشہ اندرونی ہوتی ہے ۔ بیرونی عناصر جو توجہ کا مرکز بنتے ہیں مہیج کہلاتے ہیں ۔ انسانی حرکات اور افعال بامقصد ہوتے ہیں اور یہ حرکات اور افعال کسی محرک سے شروع ہوتے ہیں ۔

اگر ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ انسان نے فلاں کام کیوں کیا تو ہمیں چاہیے کہ اس کے محرکات کا پتا چلائیں ۔ کھانا کھانا انسان کا ایک عمل یا فعل ہے ۔ وہ کھانا اس لیے کھاتا ہے کہ زندہ رہے گویا زندہ رہنے کے لیے خوراک کی ضرورت ہے ۔ یہاں خوراک کی ضرورت محرک ہے ۔ بچہ محنت سے پڑھتا ہے (فعل یا عمل) کیونکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ علم حاصل کرے اور کامیاب انسان بنے (محرک) تعلم کے سلسلے کی ابتدا تحریک سے ہوتی ہے ۔

۲ ۔ مقصود :

انسان کی جسمانی اور نفسیاتی ضرورت اسے سرگرم عمل رکھتی ہیں ۔ اس عمل کا رخ کسی مقصد کی طرف ہوتا ہے ۔ کبھی یہ مقصد مادی ہوتا ہے اور کبھی مجرد ، کبھی واضح ہو جاتا ہے اور کبھی مبہم ۔ بہرحال جب تک مقصد حاصل نہیں ہوتا انسان پر اضطراب اور بے چینی طاری رہتی ہے ۔ سکون اور اطمینان کا مطلب ہے ضرورت پوری ہو جانا یعنی مقصد حاصل ہو جانا ۔ سیکھنے والے کے لیے کوئی شے اس وقت تک مقصود نہیں بن سکتی جب تک وہ کسی جسمانی یا نفسیاتی خواہش

کی تسکین نہ کرے مثلاً جو بچہ محبت اور شفقت چاہتا ہے وہ ایسے استاد کے سبق میں دلچسپی لے گا جو شفیق اور مہربان ہے۔ بد مزاج ، سخت دل استاد بچے کو تعلیم سے متنفر کر دے گا۔ ہر بچہ چاہتا ہے کہ اسے کامیابی حاصل ہو ، دوسرے اس کی تعریف کریں ، اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اگر مدرسے میں اس کو ان خواہشات کی تسلی کے مواقع نہیں ملتے تو اس کے لیے مدرسے میں کوئی مقصود موجود نہیں ہے اور اس کے لیے تعلیم بے معنی ہے۔ اس کی توجہ اور دلچسپی تعلیم میں اس وقت تک قائم رہے گی جب تک اسے اپنا مقصود نظر آئے گا۔ لہٰذا تحریک ، سیکھنے کی ابتدا ہے اور سیکھنے کے عمل کو جاری رکھنے کا انحصار مقصود پر ہے۔

۳ - رکاوٹ :

حصول مقصود آسان نہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ بچہ جو چاہتا ہے اسے فوراً مل جائے۔ مقصد کے حصول کی راہ میں کئی قسم کی رکاوٹیں آ سکتی ہیں اور انسان کئی طریقے آزماتا ہے تاکہ اپنی منزل تک پہنچ جائے۔ شریر بچے اس بات کا واضح ثبوت ہیں۔ وہ استاد کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے شرارت کا راستہ اختیار کرتے ہیں کیونکہ شاید استاد نے ان کو تعلّم کے دوران مناسب توجہ نہ دی ہو۔

رکاوٹیں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ رکاوٹ خود انسان میں ہوتی ہے۔ مثلاً ایک بچہ ڈاکٹر بننا چاہتا ہے لیکن اس کی ذہانت کم ہے یا اسے محنت کی عادت نہیں۔ رکاوٹ ماحول میں بھی ہوتی ہے مثلاً بچے کے اتنے وسائل نہ ہوں کہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکے۔ استاد اپنی تربیت اور تجربے کی روشنی میں ایسے مواقع فراہم کرتا ہے در بچے ان رکاوٹوں پر قابو پا سکیں۔ وہ بہتر تدریس اور رہنمائی کے ذریعے بچوں کی مدد کرتا ہے اور جب رکاوٹیں ایسی ہوں جن پر قابو نہیں پایا جا سکتا تو وہ بچوں میں یہ صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ وہ حقیقت پسندی سے کام لیں اور دل برداشتہ ہونے کی بجائے کامیابی کے لیے

نئی راہیں تلاش کریں ۔ اگر استاد ایسا نہیں کرتا تو تعلّم کا عمل جاری نہیں رہ سکے گا ۔

۴ - بے چینی :

رکاوٹ کی وجہ سے اضطراب پیدا ہوتا ہے مثلاً بھوک کے وقت کھانا نہ ملنے سے بے چینی پیدا ہوتی ہے ۔ اسی طرح ایک بچہ چاہتا ہے کہ اسے سائیکل مل جائے ۔ جب تک اس کو سائیکل نہیں ملتی وہ بے چین رہتا ہے ۔ اس کا دل کسی بات میں نہیں لگتا حتیٰ کہ اسے خواب میں بھی سائیکل نظر آئے گی ۔

اضطراب اور بے چینی ایک خاص حد تک ضروری ہے کیونکہ اس کی وجہ سے عمل کرنے کے لیے توانائی آ جاتی ہے اور انسان اپنی قوتوں کو مقصد کے حاصل کرنے کے لیے وقف کر دیتا ہے ۔ اگر ان قوتوں کی راہ میں رکاوٹ آ جائے تو بعض اوقات یہ ایک سیلاب کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہیں ۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تھوڑا بہت اضطراب تعلم کے عمل کے لیے ضروری ہے ۔ اس کی وجہ سے سیکھنے والا اپنی قوتوں کو یکجا کر کے مقصد کے حصول میں کوشاں رہتا ہے ۔ وہ مقصد حصول علم بھی ہو سکتا ہے اور شہرت بھی لیکن بے چینی کا ایک خاص حد سے گزرنا تعلّم پر برا اثر ڈالتا ہے ۔ سزا کا ڈر ، استاد کا غیر ہمدردانہ رویہ اور ناقص طریقۂ تدریس اضطراب کا باعث بنتے ہیں اور تعلّم کی راہ میں دشواریاں پیدا کرتے ہیں ۔

۵ - آزمائشی دور :

ایک مسئلے کو کئی طریقوں سے حل کیا جا سکتا ہے مثلاً ایک طالب علم کسی نئے لفظ کے معنی جاننا چاہتا ہے ۔ اب وہ کئی طریقے استعمال کر سکتا ہے ۔ وہ لغت میں اس لفظ کے معنی تلاش کر سکتا ہے ، اپنے والد سے معنی پوچھ سکتا ہے ، پورے جملے پر غور کر کے یہ دیکھ سکتا ہے کہ جملے میں لفظ کن معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ وہ انکل سے بھی معنی بتا سکتا ہے ۔

ایک تجربے کے لیے بلی کو پنجرے میں بند کر دیا گیا اور باہر گوشت رکھ دیا گیا۔ بلی نے گوشت حاصل کرنے کے لیے کئی طریقے استعمال کیے ۔ کبھی پنجرے کی دیواروں کو نوچا ، کبھی اس کے دروازے پر پیر مارے اور کبھی سلاخوں کو دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کی اور اسی تگ و دو میں اچانک اس کا پیر ایک بٹن پر پڑا اور دروازہ کھل گیا اور بلی نے گوشت حاصل کر لیا ۔ آپ نے دیکھا کہ آزمائشی کوشش سوچ سمجھ پر بھی مبنی ہو سکتی ہے اور قیافہ پر بھی ۔ مختلف طریقے اس وقت تک آزمائے جاتے ہیں جب تک مقصد حاصل نہیں ہوتا ۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے وہ طریقہ کار اپنا لیا جاتا ہے جو منزل مقصود تک لے جاتا ہے اور باقی طریقے رد ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ کارآمد ثابت نہیں ہوتے ۔ انسان وہی عمل دہراتا ہے جس سے اس کی خواہش کی تسکین ہوتی ہے اور اضطراب دور ہو جاتا ہے یعنی وہی طریقہ کامیاب سمجھا جاتا ہے جو حصول مقصد میں مددگار ہو سکتا ہے ۔ جس طرح بلی نے بٹن دبانا سیکھ لیا کیونکہ بٹن دبانے سے اسے گوشت حاصل ہوا ۔

تعلّم کے اصول

تعلّم کے مندرجہ بالا اقدامات کی روشنی میں ہم چند ایسے اصول اخذ کر سکتے ہیں جو تعلّم کو سمجھنے اور کسی نئی مہارت کے حاصل کرنے کے لیے مفید ہیں ۔ یہ اصول معلمین کے لیے خاص طور پر مددگار ثابت ہوں گے اور دوران تدریس ان کی رہنمائی کریں گے ۔

۱ - تعلّم ایک بامقصد عمل ہے ۔

۲ - سیکھنے والے کی خواہشات اور محرکات اس میں تعلّم کے لیے آمادگی پیدا کرتے ہیں ۔

۳ - احساس کامیابی سے تعلّم کو تقویت ملتی ہے ۔ کامیابی کا مطلب ہے مقصد کا حاصل ہونا اور اضطراب کا دور ہونا ۔

۴ - ہیجان اور اضطراب کی زیادتی تعلّم کی راہ میں دشواری پیدا کرتی ہے -

۵ - دوہرانے سے تعلم پختہ ہوتا ہے - کردار کی دیرپا تبدیلی کے لیے مشق لازمی ہے -

تعلّم کے اصولوں کی تعلیمی اہمیت

مندرجہ بالا اصولوں سے یہ ظاہر ہوا کہ تعلّم کے لیے چند شرائط ضروری ہیں - پہلے تو یہ کہ سیکھنے والے میں تحریک موجود ہو ۔ اس کی تشنہ خواہشات اور حاجتیں تشفی اور طمانیت کی متلاشی ہوں ۔ پھر اس کو ایسے حالات میسر ہوں جن میں وہ مختلف طریقہؑ کار آزما سکے اور خواہشات کی تشفی کر سکے لٰہذا استاد کو چاہیے کہ وہ بچوں کی ضروریات اور حاجتوں سے آگاہ ہو اور تدریس میں ان ضروریات کو اس طرح مدنظر رکھے کہ سیکھنے والے کو تشفی ہو سکے - اسی طرح تعلم کا عمل بامقصد بنتا ہے اور بچہ سیکھنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے - اگر نصاب اور تدریس میں بچوں کے محرکات کو نظر انداز کیا جائے تو بچے سبق میں دلچسپی نہیں لیتے - بچوں کو ایسے کام دیے جائیں ، جو ان کی استعداد کے مطابق ہوں ورنہ وہ مقصد کے حصول میں ناکام رہیں گے - بچوں کو یہ موقعہ دیا جائے کہ وہ اپنی کارکردگی سے باخبر ہوں - ان کو امتحان کے نتائج کے لیے فوراً آگاہ کر دیا جائے- کامیابی تعلم کو فروغ دیتی ہے اور ناکامی سیکھنے والے میں کم ہمتی اور فرار کا احساس پیدا کرتی ہے -

چونکہ اضطراب اور خوف بچوں کے ذہن پر ایک ایسا پردہ ڈال دیتے ہیں جو تعلّم کی راہ میں رکاوٹ ہوتا ہے لٰہذا دوران تدریس یہ کوشش کی جائے کہ بچوں کی خواہشات کو مناسب طریقوں سے طمانیت حاصل ہو - بے جا سزا اور دھمکی سے نہ صرف احتراز کرنا چاہیے بلکہ بچوں کے ساتھ مثبت طریقے اختیار کیے جائیں - یعنی ان کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اکثر و بیشتر تعریفی کلمات استعمال کیے جائیں - دہرانے سے سیکھا ہوا کام مستحکم ہوتا ہے لیکن دہرانے کا مطلب سبق کو

بغیر سمجھے رٹنا نہیں بلکہ دہرانے کا مطلب یہ ہے کہ سبق سمجھنے کے بعد مشق کی جائے۔

تعلّم پر اثر انداز ہونے والے عوامل

تعلم کو سمجھنے کے بعد استاد کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کون کون سے عوامل ہیں جو تعلّم پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ماہرین نفسیات نے مندرجہ ذیل عوامل پر زور دیا ہے ۔

۱ - آمادگی ۔

۲ - تحریک ۔

۳ - دلچسپی ۔

۴ - توجہ ۔

۵ - جذبات ۔

۶ - ذہانت ۔

۷ - پیشہ ورانہ رجحان ۔

۸ - مشق ۔

۹ - رویہ ۔

۱ - آمادگی :

بچہ جب تک ذہنی اور جسمانی طور پر کسی کام کو سیکھنے کے لیے تیار نہ ہو اسے کچھ سکھانا مشکل اور بے سود ہوگا کیونکہ استاد کی کوشش کے باوجود بچہ سیکھنے میں دقت محسوس کرے گا اور شاید سیکھ بھی نہ سکے ۔ آمادگی کا مطلب ہے جسمانی پختگی ، سیکھنے کی صلاحیت ، ماضی کے تجربات اور سیکھنے کی خواہش ۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آمادگی کئی خصوصیات کے یکجا ہونے پر پیدا ہوتی ہے ۔ اس میں جسمانی نشو و نما اولین شرط ہے ۔ آپ دو سالہ بچے کو لکھنا پڑھنا نہیں سکھا سکتے ۔ بچے کی ذہنی سطح آمادگی کا دوسرا اہم پہلو ہے چنانچہ جب تک کسی بچے کا ذہن مناسب نشو و نما نہیں پا لیتا اسے

مختلف ذہنی تصورات سے روشناس کرانا درست اقدام نہیں مثلاً جو بچہ ابھی ذہنی لحاظ سے صرف مقرون اور ٹھوس چیزوں کو سمجھتا ہے۔ اسے آپ مجرد نظریات کا سبق نہیں دے سکتے۔ مثلاً پہلی کلاس کے بچوں کو جمہوریت اور انصاف کا تصور نہیں دیا جاسکتا کیونکہ وہ ابھی ذہنی لحاظ سے مجرد نظریے کی سطح تک نہیں پہنچے۔ آمادگی کا تیسرا اہم پہلو بچے کے پچھلے تجربات ہیں۔ آپ بچے کو چھٹی کلاس میں اکائی کا طریقہ اس وقت تک نہیں شروع کرا سکتے جب تک اس نے کسور نہیں سیکھے۔ آمادگی کا چوتھا پہلو ہے تحریک کی موجودگی یعنی بچہ سیکھنا چاہتا ہے کہ نہیں۔

عام طور پر استاد نصاب کو بچوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ کورس ختم کرایا جائے حالانکہ تعلیم میں بچہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے لیکن استاد کہتے ہیں کہ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ بچوں کا انفرادی طور پر مطالعہ کریں اور ان کی آمادگی کا اندازہ لگا سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو بچے تعلیم نامکمل چھوڑ دیتے ہیں یا بار بار فیل ہو کر ناکامی کا شکار ہوتے ہیں۔ آپ ایسے جانور کو جو پانی پینا نہیں چاہتا زبردستی پانی نہیں پلا سکتے۔ خواہ آپ اس کو گھسیٹ کر پانی تک لا کھڑا کریں۔ استاد کو چاہیے کہ مشاہدے، معیاری آزمائشوں اور بچوں کی کارکردگی کے جائزے سے ان کی آمادگی کا پتا چلائے۔ ہر نیا کام شروع کرنے سے پہلے ایسا قدم تشخیص کے مترادف ہے اور پھر کام کو بھی اس طرح سے پیش کیا جائے کہ وہ بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق ہو، ان کی خواہشات کی تسلی ہوتی ہو اور وہ کام ان کے پچھلے تجربات سے تعلق رکھتا ہو۔

تشخیص سے یہ بھی پتا چل سکتا ہے کہ بچوں میں کن تجربات کی کمی عام ہے۔ مثلاً جو بچے اکائی کے سوال نہیں کر رہے اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ تو نہیں کہ انہیں ضرب میں مناسب مشق نہیں ملی ہے۔ لہٰذا استاد اکائی کا قاعدہ سکھانے سے پہلے انہیں ایسے سوال دے جس میں ضرب کی مزید مشق ہو سکے۔

استاد آمادگی کے لیے مناسب مواقع فراہم کر سکتا ہے مثلاً کھیل کے ذریعے - سمعی و بصری معاونات اور ذاتی تجربات پر مبنی تعلّم سے بچوں میں سیکھنے کی خواہش ابھرتی ہے۔ استاد کے لیے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ سیکھنے کا کام اس وقت ہی بخوبی انجام پا سکتا ہے جب سیکھنے والا اس کے لیے آمادہ ہو اور آمادگی جبر و تشدد سے پیدا نہیں کی جا سکتی اور ہر بچہ آمادگی کے لحاظ سے دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

۲ - تحریک :

تحریک ایک داخلی کیفیت ہے جو کسی ایسی فعالیت کو پیدا کرتی ہے جو اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے وقت تک جاری رہتی ہے - تحریک کی ابتدا احتیاجات سے ہوتی ہے اس لیے مدرس کو بچوں کی احتیاجات کی طرف توجہ دینا ضروری ہے۔ وہ ایسے مواقع پیدا کرے کہ بچوں کی حاجت پوری ہو - بچوں میں سیکھنے کی خواہش پیدا کرنے کا راز اسی میں ہے - کوئی طالب علم ریاضی میں اس لیے محنت کرتا ہے کہ اس طرح اس کی کسی بنیادی حاجت کی تسکین ہوتی ہے - مثلاً اس طرح اسے ذاتی وقار یا دوستوں کی نظروں میں عزت حاصل ہوتی ہے۔ ایسے بچے جن کی عمر دس سے چودہ سال کے درمیان ہوتی ہے، دور بلوغت میں داخل ہونے والے ہوتے ہیں - وہ بچپن کو خیر باد کہہ رہے ہوتے ہیں - ان کی نمایاں ضروریات درج ذیل ہو سکتی ہیں -

(الف) آزادی کی ضرورت

(ب) پسندیدگی اور استحسان کی ضرورت

(ج) توقیر ذات کی ضرورت

(الف) آزادی کی ضرورت : بچہ اپنی زندگی اس طرح شروع کرتا ہے کہ وہ اپنی ہر ضرورت کے پورا کرنے کے لیے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے لیکن نشو و نما کا تقاضا ہے کہ بچہ اس دور سے گزر کر آزادی اور خود مختاری کے لیے تیار ہو، تاکہ اپنی مدد آپ کر سکے، لہٰذا تدریس میں بچوں کی اس خواہش کو مدنظر

رکھا جائے۔ اگر انہیں آزادی فکر اور آزادی عمل ملے گی تو انہیں مدرسے کا کام اچھا لگے گا۔ یہاں آزادی سے یہ غلط مطلب نہیں اخذ کرنا چاہیے کہ بچوں کو کھلی چھٹی دے دی جائے خواہ وہ برا کریں یا اچھا۔ بلکہ آزادی سے یہ مراد ہے کہ بچوں کو کلاس میں کام سپرد کیے جائیں، انہیں ذمہ داری سونپی جائے، کلب یا سوسائٹی کے ممبر بنیں، کوئی اس کا صدر ہو کوئی سیکرٹری، باقی ممبر ہوں۔ وہ اکثر فیصلے باہمی مشورے سے کریں۔ استاد بھی ان کی رائے کی عزت کرے۔ انہیں جھڑک کر خاموش نہ کر دے کہ 'تم جھوٹے ہو'، 'تمہیں کیا معلوم'۔ اگر انہیں کوئی بات معلوم نہ ہو تو سکھانے کی ضرورت ہے اور وہ عمر کے مطابق آزادی ملنے سے سیکھیں گے۔

(م) پسندیدگی اور استحسان کی خواہش: یہ صرف اس عمر کے بچوں کی ہی ضرورت نہیں کہ لوگ انہیں پسند کریں بلکہ ہر عمر کے انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے۔ دوسروں کی ناپسندیدگی اور ناخوشی انسان کو پریشان کرتی ہے۔ اگر استاد یہ ظاہر کر دے کہ وہ کسی بچے کو پسند نہیں کرتا تو اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگے گا اور وہ مدرسے سے بھاگے گا، اس لیے استاد کو چاہیے کہ وہ ہر وقت باآواز بلند یہ اعلان نہ کرتا رہے کہ 'بچو تم نکمے اور نالائق ہو' بلکہ وہ بچوں کو ذمہ داری سونپے اور وہ اسے بجا لائیں تو ان کی تعریف کرے۔ ان کی اصلاح کرنے کے لیے انہیں سب کے سامنے تادیب نہ کرے بلکہ علیحدگی میں انہیں ان کی غلطی یا کمزوریوں سے آگاہ کرے اور اس طرح رہنمائی کرے کہ وہ اپنی کمزوریاں دور کر سکیں۔ بچے نہ صرف استاد بلکہ اپنے ہم عمر اور ہم جماعت بچوں کی پسندیدگی کے بھی خواہاں ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے بچے انہیں اپنے کاموں میں شریک کریں، انہیں دوست بنائیں۔ اگر دوسرے ہم عمر بچے کسی ایک بچے کا مذاق اڑائیں، اسے اپنے کھیلوں

میں شامل نہ کریں تو بچہ ناخوش رہتا ہے اور اس کے نتیجے میں پڑھائی سے بھاگنے لگتا ہے یا پھر اس پر سکول کا خوف طاری ہو جاتا ہے۔

استاد مشاہدے سے یہ پتا چلا سکتا ہے کہ کون سا بچہ نشانہ ہدف بنا ہوا ہے اور کیوں۔ اکثر اوقات استاد کسی بچے پر اتنی نکتہ چینی کرتے ہیں کہ دوسرے بچے بھی اس بچے سے دور رہنے لگتے ہیں۔ استاد کا رویہ بھی بچے کو مقبول یا نامقبول بناتا ہے لہٰذا وہ خود بھی محتاط رہے کہ ایسا نہ ہونے پائے۔ اس کے علاوہ بچوں کی بعض عادات مثلاً شیخی بگھارنا، رعب ڈالنا یا بات بات پر روٹھنا ان کو غیر ہر دلعزیز بنا دیتی ہیں۔ استاد بچوں میں یہ سمجھ بوجھ پیدا کرے کہ اپنی ان عادات کی اصلاح سے وہ مقبول ہو سکتے ہیں۔ استاد گروہی کام کروائے تاکہ بچوں کی اس خواہش کی تسکین ہو۔ اس کے علاوہ وہ انہیں باری باری ذمہ داریاں سپرد کرے۔ یہ نہیں کہ چند منظور نظر بچوں کو ہی ذمہ داریاں دے۔ اس طرح استاد کے منظور نظر بچے جماعت میں ناپسندیدہ نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔

(ج) **توقیر ذات کی ضرورت:** ذاتی وقار کا مطلب ہے کہ بچے کی نگاہوں میں اپنی قدر و منزلت ہو۔ توقیر ذات کا مطلب غرور یا خود پسندی نہیں۔ احساس کمتری کے شکار بچوں میں توقیر ذات کا فقدان ہوتا ہے۔ ایسے بچے کوشش سے پہلے ہی ہمت ہار دیتے ہیں۔ صحت مند شخصیت کی تشکیل کا تقاضا ہے کہ بچہ اپنی عزت کرے۔

تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ جو بچے اپنے بارے میں ایسی موافق رائے رکھتے ہیں جو حقیقت پر مبنی ہو تو وہ عام طور پر پڑھائی میں اچھے ہوتے ہیں۔

اچھی رائے اس وقت قائم ہوتی ہے جب بچے کو اپنی متعین کردہ منزلوں تک پہنچنے میں کامیابی ہوئی ہو مثلاً بچہ چاہتا ہے کہ وہ حساب

میں دس میں سے کم از کم پانچ نمبر لے تو یہ منزل اس نے خود متعین کی ہے ۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ استاد اس سے خوش ہو ۔ اگر وہ اپنی منزل تک پہنچنے میں ناکام رہا ہے تو اسے احساس ناکامی ہو گا جو کئی ایسے تجربات کے بعد احساس کمتری میں بدل جائے گا ۔

اس کے علاوہ بچہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کے بارے میں دوسرے کیا رائے رکھتے ہیں ۔ اگر اس کے والدین یا استاد اسے بدھو یا بےوقوف کہہ کر پکارتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو بدھو سمجھے گا اور پھر بدھوؤں کی طرح ہی کام کرے گا ۔ آپ کسی بچے کو بار بار شریر کہیں گے تو وہ یہ ضروری سمجھے گا کہ شرارت کر کے دکھائے اور اس طرح وہ واقعی شریر بن جائے گا ۔

استاد بچوں کو ایسے مواقع فراہم کرے کہ وہ کامیابی سے ہمکنار ہوں ۔ ان کی تعریف اور حوصلہ افزائی کرے، ان کی ہمت بندھائے اور یقین دلائے کہ وہ کوشش سے کامیاب ہو سکتے ہیں ۔ جو بچہ کامیابی کا مزہ چکھ لیتا ہے وہ مدرسے دوڑا دوڑا آتا ہے یعنی کامیابی کا احساس محرک کا کام دیتا ہے اور تعلّم کو تقویت ملتی ہے ۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مار پیٹ اور سزا سے بچوں میں تحریک پیدا کی جا سکتی ہے ۔ اسی لیے استاد یہ سمجھتے ہیں کہ سزا کے ذریعے پڑھائی کا شوق پیدا کیا جاتا ہے لیکن سزا تو اضطراب اور خوف پیدا کرتی ہے اور تعلّم کی راہ میں رخنہ ڈالتی ہے، اس لیے اس سے احتراز کرنا ضروری ہے ۔

انعام، گروہی مقابلے، نتائج کا علم، مناسب رہنمائی، خوشگوار ماحول ایسے طریقے ہیں جن سے بچوں کی سیکھنے کی خواہش کو متحرک کیا جا سکتا ہے ۔

۴ ۔ دلچسپی :

کوئی کام اس وقت شوق اور انہماک سے کیا جاتا ہے جب اس سے کرنے والے کو خوشی ہو ۔ اس کے برعکس اگر کسی کام کے ساتھ

تکلیف کے ناگوار احساسات وابستہ ہوں تو سیکھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ دلچسپی اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کسی شخص کی احتیاجات تسکین پاتی رہیں۔

تعلم اور دلچسپی کا آپس میں گہرا تعلق ہے کیونکہ دلچسپی کے باعث بچوں کی قوتیں یک جا ہو کر ایک مرکز پر دیر تک قائم رہتی ہیں۔ عدم دلچسپی کی حالت میں یہ قوتیں بکھر جاتی ہیں اور بچے کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ چونکہ دلچسپی فرد کی احتیاجات سے وابستہ ہے لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دلچسپی قائم رکھنے کے لیے احتیاجات کی تکمیل یعنی کامیابی ضروری ہے۔ جن کاموں میں بچے کو کامیابی ہو گی لازمی طور پر وہ اس میں دلچسپی لے گا۔ یہ بات تحقیق سے ثابت ہے کہ بچے جن مضامین میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتے ہیں وہ ان مضامین کو پسند کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ بچوں کی مدرسے سے باہر بھی دلچسپیاں ہوتی ہیں۔ بچوں میں سبق کے لیے شوق پیدا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کی دلچسپیوں کے ذریعے انھیں پڑھایا جائے۔ دس سے چودہ سال کے بچے چیزیں جمع کرتے ہیں۔ گروہی کھیل پسند کرتے ہیں جانور پالتے ہیں۔ جاسوسی کہانیاں، بڑے لوگوں کے کارنامے، سائنس اور ناول اس عمر کے لڑکوں کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ لڑکیاں پریوں میں اور ایسی کہانیوں میں دلچسپی لیتی ہیں جن میں بہادر یا نامور لڑکیوں کا ذکر ہو۔

جغرافیہ، اردو اور حساب پڑھاتے وقت بچوں کے شوق کو سامنے رکھا جا سکتا ہے مثلاً ٹکٹ جمع کرنے کا شوقین بچہ مختلف ملکوں کے نام جان جائے گا۔ اس کو یہ کام دیا جائے کہ وہ ان ملکوں کے بارے میں پڑھے، ایک البم بنائے، اس کے بارے میں مزید معلومات جمع کر کے لکھے، پیسوں کا حساب رکھے کہ کتنے ٹکٹ خریدے، کیا خرچ آیا۔

کمرۂ جماعت میں بچوں کی مدد سے لائبریری بنائی جا سکتی ہے۔ وہ اپنی اپنی کتابیں لے آئیں۔ بچے جب اپنے شوق کی کتابیں پڑھتے ہیں تو ان کی اردو بہتر ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ مدرسے میں نئی دلچسپیوں کے پیدا کرنے کا انتظام بھی ہو اور اس کے لیے یہ اصول یاد رکھنا چاہیے کہ دلچسپی وہی ہے جس سے تسکین حاصل ہو۔ دلچسپیاں بچوں کی معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کے صحت مند مشاغل انھیں خالی وقت میں مصروف رکھتے ہیں اور اس طرح وہ بے راہ روی سے بچ جاتے ہیں اس لیے سکولوں میں اس بات کا بندوبست بھی کیا جائے کہ بچے تعمیری اور صحت مند مشاغل میں دلچسپی لیں اور نئی دلچسپیاں پیدا کی جائیں۔

۴۔ توجہ:

جب بچہ کسی کام کو زیادہ دیر تک انہماک اور شوق سے کرے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ توجہ دے رہا ہے اور اگر وہ استاد کی بات نہ سنے اور ادھر ادھر دیکھے۔ سوال پوچھنے پر اسے یہ نہ معلوم ہو کہ کیا پوچھا گیا ہے تو یہ ظاہر ہے کہ وہ متوجہ نہیں۔ اگر توجہ بھٹک رہی ہے تو وہ سبق سیکھنے سے قاصر رہے گا لہٰذا تعلّم اور توجہ کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور توجہ ان کاموں میں قائم رہتی ہے جن میں دلچسپی تنوع اور معنی موجود ہوں۔ مشاہدے اور تجربے سے پتا چلا ہے کہ جو کام بچوں کی دلچسپی کے مطابق ہوتا ہے وہ اس میں دیر تک مصروف رہتے ہیں۔ بچوں کی توجہ قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ سبق کے دوران ایسی مثالیں دی جائیں جو بچوں کی دلچسپی کے مطابق ہوں۔

ایک ہی نوعیت کا کام اور یکسانیت بے زاری اور تھکن کا باعث ہوتی ہے۔ استاد ایک سی آواز سے اور مسلسل ایک ہی طریقے سے پڑھاتا ہے تو بچوں کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ کام میں دلچسپی اور نیا پن تدریس کے نئے طریقوں سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی بچوں سے پڑھوایا جائے، کبھی انھیں گروہی کام دیا جائے، کبھی انھیں کلاس سے لے جا کر

پودوں اور جانوروں کا مشاہدہ کرایا جائے تو اس طرح بچوں کی توجہ نہیں بھٹکتی ۔

پڑھانے کے دوران استاد کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بھی توجہ پر اثر ڈالتے ہیں ۔ ہنس مکھ اور خوش مزاج استاد جلد بچوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے ۔ اگر استاد اس طرح پڑھاتا ہے کہ اس کی مثالوں یا سبق کا بچے کی زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو تو بچے توجہ نہیں دیتے ۔ مثلاً اگر بچوں کو انگریزی نظم سکھائی جائے اور اس کا مطلب ذہن نشین نہ کرایا جائے تو وہ اسے یاد کرنے پر زیادہ توجہ نہیں دیں گے ۔

سمعی بصری معاونات کے ذریعے بھی توجہ کو قائم رکھا جاتا ہے اس لیے ان کی تیاری اور استعمال پر زور دیا جاتا ہے ۔

۵ ۔ جذبات :

جذبے سے مراد ہے کسی جاندار کی ایسی ہیجانی کیفیت جس میں کسی خاص فعالیت کے متعلق تحریک اور شعوری رجحان پائے جائیں اور جس میں جسمانی اور عضویاتی تبدیلیاں واقع ہوں۔ جذبہ ایک پیچیدہ کیفیت ہے جو صرف ایک مہیج کا رد عمل نہیں بلکہ ایک مہیج کا خاص حالات میں موجود ہونا ہیجانی کیفیت پیدا کرتا ہے ۔ مثلاً باغ میں اچانک سانپ کا نظر آنا خوف پیدا کرے گا لیکن ایک سپیرا سانپ کا تماشا دکھاتا ہے تو لوگ بھاگتے نہیں ، کھڑے ہو کر تماشہ دیکھتے ہیں ۔ جذبے کی ہیجانی کیفیت میں ایک دم تیزی آتی ہے لیکن اس کا اثر آہستہ آہستہ زائل ہوتا ہے جیسے کہ غصے کی کیفیت میں ہوتا ہے ۔ ہر جذبے کا خوشگوار یا ناخوشگوار پہلو ہوتا ہے ۔ مثلاً خوف ناخوشگوار ہے ۔ ہر جذبے میں جسمانی تغیرات خاص اہمیت رکھتے ہیں بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ جذبہ ان ہی تغیرات کا نام ہے ۔ جیسے غصے میں منہ سرخ ہو جانا، خوف سے کانپنے لگنا ، خوشی کے مارے آنکھوں سے آنسو نکل آنا اور مارے شرم کے پسینہ آ جانا ۔ ہر جاندار میں

جذبات پائے جاتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اساسی جذبات صرف خوف، غصہ اور محبت ہیں۔

چونکہ جذبات ایک ہیجانی کیفیت کا نام ہے لہٰذا خوف اور غصے کے جذبے انسان کی جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے سخت مضر ہیں۔ ان سے ذہنی استعداد پر برا اثر پڑتا ہے۔ اسی لیے مدرسین کو چاہیے کہ تعلیم کے دوران بچے کو سزا کا خوف نہ دلائیں۔ پرسکون اور خوشگوار ماحول مین بچہ اچھی طرح سیکھتا ہے اور تعلم دیرپا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس خوف کی حالت میں یاد کیا ہوا مواد بچہ جلد بھول جاتا ہے۔

دس سے چودہ سال کے بچے امتحان میں ناکامی سے ڈرتے ہیں۔ وہ استاد اور والدین کی ناراضگی سے خائف ہوتے ہیں۔ فیل ہونے کی صورت میں ہم جماعت چھوٹ جانے کا خوف اور ذاتی تضحیک کا خوف اس عمر کے بچوں میں شدید ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ بچوں میں خود اعتمادی پیدا کی جائے۔ انہیں ایسے کام کرنے کے لیے مجبور نہ کیا جائے جو ان کی استعداد سے باہر ہوں۔ استعداد کے مطابق کام دیے جانے کی صورت میں ان کی کامیابی کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔

غصہ بھی ایک ناخوشگوار جذبہ ہے جو بچوں کی دلچسپیوں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے، ان کا دوسروں سے مقابلہ کرنے، طعن و تشنیع کرنے اور انہیں برے ناموں سے پکارنے سے پیدا ہوتا ہے۔ بچے کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی تعریف اور حوصلہ افزائی کی جائے اور اس کی عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچے گویا یہ اس کی نفسیاتی ضروریات ہیں۔ جب بچے کی یہ ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو وہ غصے میں آ جاتا ہے اور طرح طرح سے اس کا اظہار کرتا ہے۔ کبھی چیختا ہے کبھی روتا ہے، کبھی دوسروں کو مارتا ہے اور گالیاں بھی دیتا ہے۔

استاد کو ایسے تمام حالات سے احتراز کرنا چاہیے جن سے بچے میں غصے کا جذبہ پیدا ہو مثلاً سزا کے طور پر لمبی لمبی مشقیں کرنے

کو دینا ، بے جا پابندیاں عاید کرنا ، گالی گلوچ اور طعنے تشنیع سے کام لینا ۔ اس کے علاوہ بچوں کو جذبات کے اظہار کے مناسب طریقے بھی سکھائے جا سکتے ہیں ۔ تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ جذبات ی تربیت کی جائے کیونکہ معاشرہ ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ اپنے جذبات کا اظہار کسی دوسرے کو نقصان پہنچا کر کیا جائے ۔ جذبے میں ایک قوت ہوتی ہے اور اس قوت کا رخ بلند مقاصد کے حصول کی طرف بھی کیا جا سکتا ہے ۔ کھیل اور مشاغل کے ذریعے اس قوت کا اخراج بھی ہو گا اور کسی کو نقصان بھی نہیں پہنچے گا ۔ جذبے ملکی اور ذاتی حفاظت کے لیے ضروری ہیں اس لیے جذبوں کو اظہار سے محروم رکھنا ذہنی صحت کے لیے مضر ہے ۔ استاد بچوں میں جذباتی پختگی پیدا کرے اور خود بھی جذباتی پختگی کا نمونہ ہو ۔

محبت ایک خوشگوار جذبہ ہے ۔ پیدائش کے بعد بچہ نہ صرف دودھ کے لیے بھوک محسوس کرتا ہے بلکہ وہ محبت کی بھوک بھی محسوس کرتا ہے اور بڑے ہو کر بھی محبت کا جذبہ قائم رہتا ہے اس لیے مدرسین اور طلبا کے باہمی تعلقات کا خوشگوار ہونا ضروری ہے ۔ باغی اور گستاخ بچے فی الحقیقت محبت کے طالب ہوتے ہیں ۔ بعض بچوں کو گھر پر بھی محبت میسر نہیں آتی جو قدرتی طور پر اپنے استادوں سے محبت کے خواہاں ہوتے ہیں ۔ بچے ان مضامین کو شوق سے پڑھتے ہیں جن کے استاد شفیق اور مہربان ہوں اور ان مضامین سے دور بھاگتے ہیں جن کے پڑھانے والے جابر اور سخت گیر ہوں ۔

۹ ۔ ذہانت

آپ نے پچھلے باب میں ذہانت کے بارے میں پڑھا ہے ۔ اس سے اگلے باب میں بھی اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے ۔ یہاں یہ بتانا کافی ہو گا کہ ذہانت کے لحاظ سے ہر بچہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے ۔ ہر جماعت میں مختلف ذہنی سطح کے بچے ہوتے ہیں ۔ ذہانت کا تعلیمی کارکردگی سے گہرا تعلق ہے ۔ عام طور پر ذہین بچے پڑھائی میں اچھے ہوتے ہیں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ذہین بچے تحریک اور خواہش کی

عدم موجودگی کی وجہ سے پڑھائی میں نمایاں کامیابی نہ حاصل کر سکیں۔ استاد اپنے مشاہدے کے ذریعے بچے کی کارکردگی سے اس کی ذہنی سطح کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ آیا یہ بچہ اوسط درجے کی ذہانت رکھتا ہے یا ذہین ہے یا ذہنی طور پر پسماندہ۔ موخرالذکر بچے ہر کام کو سیکھنے میں زیادہ وقت لیتے ہیں اور اعلیٰ ذہانت کے بچے جلد سیکھ جاتے ہیں۔ ان کو ایک ہی رفتار سے پڑھانا تعلّم کے اصولوں کے خلاف ہے۔ سست رفتار بچوں کو تعلّم میں ناکامی ہوگی اور ذہین بچے کام جلد ختم کر کے یا تو بے زار ہوں گے یا شرارتیں کریں گے۔ ایک جمہوری ملک میں تعلیم کے لیے ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق یکساں مواقع ملنے چاہییں۔ کم ذہانت کے بچوں کو مقرون اشیا اور ٹھوس چیزوں کے ذریعے تعلیم دینی چاہیے۔ ان کے ساتھ صبر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ یہ ان کا قصور نہیں کہ وہ دوسروں کی طرح ذہین نہیں ہیں۔ ان کا بار بار دوسروں سے مقابلہ نہ کیا جائے۔ اس کے برعکس زیادہ ذہین بچے بھی زیادہ تعریفیں سن کر مغرور ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے اس سلسلے میں محتاط رہنا ضروری ہے۔ ان کے تجسس کو ابھارنے کے لیے انہیں نئے کام دیے جائیں تو مناسب ہو گا۔

۶۔ پیشہ ورانہ رجحان

ابتدائی مدارس میں بچوں کے پیشہ ورانہ رجحان کا پتا لگانا مشکل ہے کیونکہ ان سے پوچھنے پر یہی معلوم ہوگا کہ وہ عمر کے مطابق خیالی پلاؤ پکا رہے ہیں۔ کوئی پائلٹ بننا چاہتا ہے تو کوئی پولیس کا سپاہی، لیکن ثانوی مدارس میں بچے اپنے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سطح پر انہیں مختلف مضامین کے انتخاب کے لیے کہا جاتا ہے۔ عام طور پر والدین یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ بچے کو آیندہ زندگی میں کیا بننا ہے۔ لیکن یہ طریقہ غلط ہے کیونکہ والدین بچے کے رجحانات کو نظر انداز کر کے اپنی خواہشات اس پر ٹھونس دیتے ہیں۔ جو بچہ سائنس کے مضامین کی استعداد نہیں رکھتا اور اس کا رجحان ادبی ہے تو وہ مشکل میں پھنس جاتا ہے اور نہ صرف یہ

کہ دلچسپی کھو بیٹھتا ہے بلکہ وہ ناکامی کا بھی شکار ہوتا ہے۔ لیکن اگر معیاری آزمائشوں میں بچوں سے گفتگو کر کے اور ان کی تعلیمی کارکردگی کے ذریعے ان کے پیشہ ورانہ رجحان کا اندازہ لگا کر انھیں مضامین کا انتخاب کرنے میں مدد دی جائے تو وہ صحیح راہ پر گامزن ہوں گے اور مضامین کو اس نقطۂ نگاہ سے پڑھیں گے کہ یہ ان کے پیشے میں کام آئیں گے۔ پیشے کے انتخاب میں رہنمائی کے لیے مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص کو مدرسے میں مدعو کیا جائے تاکہ وہ بچوں کو پیشوں کے بارے میں معلومات فراہم کریں۔

ہمارے ملک میں ہوائی فوج میں بھرتی کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ ہوائی فوج کے ماہرین مدارس میں جا کر بچوں سے ان کے مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس میں بھرتی کے لیے کس طرح کی تعلیم حاصل کی جائے۔ وہ اس پیشے کی تربیت، تنخواہ، ترقی اور ملازمت کی شرائط کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتے ہیں اور ہوائی فوج کے مختلف شعبوں میں ہونے والے کاموں کی تفصیل بھی بیان کرتے ہیں کہ وہاں کس کس قسم کا کام ہوتا ہے تاکہ بچے اپنے رجحان اور دلچسپی کے مطابق پیشے اختیار کرنے کے لیے اسی قسم کے مضامین پڑھیں۔

۸۔ مشق:

آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی کام کو بار بار کرنے سے اس پر عبور حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ بات مہارتوں کے سلسلے میں خاص طور پر یاد رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً سائیکل چلانے کے لیے مشق لازمی ہے کیونکہ سائیکل چلانے میں جسم کے کئی اعضا بیک وقت کام کرتے ہیں اور ان میں ربط پیدا کرنے کے لیے مشق ضروری ہے۔

اس کے برعکس عدم اعادہ سے یعنی جب کسی اکتسابی فعالیت کو دہرایا نہ جائے تو وہ کمزور ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حساب میں ہر نیا قاعدہ سکھانے کے بعد اس میں مشق کروائی جاتی ہے۔

لیکن بغیر سمجھے مشق بے معنی اور بے سود ہے ۔ اس طرح تھکن اور بیزاری پیدا ہوتی ہے اور غلطیوں کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے مثلاً ایک بچہ $2 \times 2 = 4$ متواتر رٹے جاتا ہے ۔ اس بات کا امکان ہے کہ اگر وہ بغیر سمجھے رٹتا رہے تو دس پندرہ دفعہ رٹنے کے بعد لاپرواہی سے $2 \times 2 = 5$ کہنے لگے اور یہی دہراتا رہے اور نتیجہ یہ ہو کہ اس کے ذہن نشین ہو جائے کہ دو کو دو سے ضرب دیں تو جواب پانچ ہوتا ہے ۔

عادت پختہ کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ تکرار کا نتیجہ خوشگوار ہو کیونکہ ہر وہ کام پختہ ہوتا ہے جس کے ساتھ خوشگوار احساسات وابستہ ہوں اس لیے بعض اوقات مشق برا اثر ڈالتی ہے اور بجائے اس کے کہ تعلّم مستحکم ہو ، سیکھے ہوئے کام سے دل بھر جاتا ہے اور اس سے نفرت ہو جاتی ہے ۔

۹ - رویہ :

ذہنی طرز عمل ، نقطہ نگاہ یا کسی چیز کو پسند یا ناپسند کرنے کا نام رویہ ہے ۔ کسی خاص شخص یا خیال سے آپ کا خاص طرز سے پیش آنا آپ کے رویے کی نشاندہی کرتا ہے مثلاً بچہ اپنے بڑے بھائی کو دیکھ کر اس کی تقلید کرتا ہے اور چونکہ بڑا بھائی سکول کو ناپسند کرتا ہے اس لیے چھوٹا بھائی بھی سکول اور استادوں کو برا سمجھنے لگتا ہے ۔ لہٰذا اس کے اور مدرسے کے درمیان ناپسندیدہ رویے کی دیوار حائل ہو گئی ہے ۔ اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ غلط پروپیگنڈے سے کسی خاص شخص یا گروہ کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں نفرت بٹھا دی جائے جیسا کہ مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہونے سے پہلے ہوا ۔

ظاہر ہے کہ رویے موروثی نہیں بلکہ اکتسابی ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ دلچسپیوں اور عادتوں سے مختلف نہیں ہوتے ۔ یہ تقلید کا بھی نتیجہ ہیں تعلّم کا بھی اور بعض اوقات تلازم کا ، مثلاً کوئی بچہ کسی استاد کو پسند کرتا ہے تو وہ اس مضمون کو بھی پسند کرنے لگتا ہے جو

وہ استاد پڑھاتا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ہم اپنے ماحول کو اپنے رویوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں ۔ اگر کوئی آپ کے بارے میں منفی رویہ رکھتا ہے تو آپ کی سیدھی بات بھی اسے بری لگے گی اور آپ کی معقول بات میں بھی اسے جانب داری نظر آئے گی ۔

مدرسے میں موافق رویے پیدا کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے ۔ استاد تدریس سے بعض مضامین سے نفرت بھی پیدا کر سکتا ہے اور محبت بھی ۔ اس ہی طرح وہ دوسرے لوگوں ، قوموں اور گروہوں کے لیے تعصبات بھی پھیلا سکتا ہے اور اچھے رویے بھی ۔ اس کی اپنی شخصیت اس کے مضامین پر اثر ڈالتی ہے۔ اس کی پسند ناپسند بچوں کی پسند ناپسند کا باعث بنتی ہے ۔

سخت گیر متعصب اور سست استاد بچوں میں غلط رویے پیدا کرتا ہے جو تعلم کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں ۔ تعلیم کا مقصد یہ بھی ہے کہ علم اور حصول علم کے لیے صحیح رویے پیدا کیے جائیں ۔

سوالات

١ - تعلّم سے کیا مرادہے؟ مثالیں دے کر سمجھائیے ۔

٢ - تعلّم کے اصولوں کو دوران تدریس کس طرح رہنما بنایا جا سکتا ہے؟

٣ - جو بچے پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتے ان کو پڑھائی کی طرف راغب کرنے کے لیے کیا اقدامات ضروری ہیں ؟

٤ - رویہ ، پیشہ ورانہ رجحان اور جذبات کا تعلم سے کیا تعلق ہے؟

٥ - اردو پڑھاتے وقت آمادگی اور تحریک کے لیے کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟

٦ - تربیت جذبات سے کیا مراد ہے ؟ جذبات کی تعلیمی اہمیت پر روشنی ڈالیے ۔

آٹھواں باب

انفرادی اختلافات

انفرادی اختلافات کا مفہوم

اس حقیقت کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ ہر شخص دوسرے سے مختلف ہے ۔ ایک کمرۂ جماعت کے بچوں پر نظر ڈالی جائے تو سب سے پہلے ان کے جسمانی اختلافات سامنے آتے ہیں ۔ ہر بچہ شکل و شباہت ، قد ، وزن اور دیگر جسمانی صفات میں دوسرے سے مختلف نظر آئے گا ۔ اگر آپ استاد سے پوچھیں گے تو معلوم ہوگا کہ ذہنی صلاحیت اور شخصیت کے لحاظ سے بھی بچے ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ یہ اختلافات صرف کمرۂ جماعت تک محدود نہیں بلکہ ایک ہی گھر کے بچوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقی بہن بھائی بھی عادات و اطوار ، ذہانت اور شخصیت میں یکساں نہیں ہوتے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر بچہ چند موروثی خواص لے کر اس دنیا میں آتا ہے اور اس کی موروثی خصوصیتیں اس کے سگے بہن بھائیوں سے بھی مختلف ہوتی ہیں ۔ ہر بچے کی انفرادیت کی دوسری وجہ ہے اس کا ماحول ۔ کہنے کو تو بہن بھائیوں کا ماحول یکساں ہوتا ہے لیکن بغور مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ بچے کے موروثی عوامل اس کے ماحول میں بھی اختلاف کا باعث بن جاتے ہیں ۔ بعض دفعہ پہلے بچے کو وہ ماحول نہیں ملتا جو منجھلے یعنی درمیان والے بچہ کو میسر آتا ہے ۔ ممکن ہے کہ پہلے بچے کی پیدائش کے وقت والد برسرروزگار نہ ہو اور دوسرے یا تیسرے بچے کی آمد پر اچھے عہدے پر فائز ہو چکا ہو ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلا بچہ لڑکی ہو اور دوسرا لڑکا اور ہمارے ملک میں لڑکے لڑکیوں کی پرورش مختلف ہوتی ہے ۔ پہلے بچے کی دفعہ ماں باپ ناتجربہ‌کار ہوتے ہیں اس لیے بچے کی پرورش میں ان سے کئی قسم کی غلطیاں سرزد ہونے کا امکان ہوتا ہے اور دوسرے یا آخری بچے تک وہ تجربے کی وجہ سے ان

غلطیوں سے احتراز کرنے لگتے ہیں۔ ایک ہی گھر میں بچے شکل و صورت کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات گھر والے اور عزیز و اقارب خوش شکل بچے پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور اس طرح دوسرے بچے محرومیت کا شکار ہو کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس ہی طرح ذہین بچہ دوسروں کو اپنی طرف جلد متوجہ کر لیتا ہے اور ایک اوسط درجے کی ذہانت رکھنے والا بچہ بدھو سمجھا جاتا ہے۔ کہنے کو تو یہ سگے بہن بھائی ہوتے ہیں لیکن دراصل ہر ایک کا نفسیاتی پس منظر مختلف ہوتا ہے۔ لہٰذا وراثت اور ماحول کے تعامل (Interaction) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی دو فرد بھی یکساں نہیں ہوتے۔

انفرادی اختلافات کی اقسام

تعلیمی نقطۂ نظر سے انفرادی اختلافات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کی نوعیت سے آگاہ ہو اور اس کو ان کے مطالعے کے طریقوں کا بھی علم ہو۔ ذیل میں چند ایسے اختلافات درج کیے جاتے ہیں جو تعلیمی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔

۱۔ جسمانی صحت

موروثی عوامل، بیماری، خوراک اور صحت مندانہ ماحول ایسے عناصر ہیں جن کی وجہ سے چند بچے تو طاقت سے بھرپور نظر آتے ہیں لیکن کچھ بچے ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ تھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کچھ بچے بیماری کی وجہ سے اکثر سکول سے غیر حاضر رہتے ہیں۔ بعض بچوں میں جسمانی نقائص بھی ہوتے ہیں جو مدرسے کے کام میں رکاوٹ کا باعث بن جاتے ہیں۔ استاد بچوں کی صحت کا ریکارڈ رکھے والدین کو علاج کی اہمیت بتائے تاکہ وہ ڈاکٹری علاج کی طرف رجوع کریں۔ ہمارے ملک میں والدین ناخواندگی کی وجہ سے بیماری کا صحیح علاج نہیں کرتے اور اس طرح بیماری شدت اختیار کر جاتی ہے۔

۲ - ذہانت اور ذہنی استعداد

بچوں کی کارکردگی کا سرسری جائزہ ظاہر کرتا ہے کہ ایک ہی جماعت میں بعض بچے ہر چیز جلد سیکھ جاتے ہیں لیکن کچھ بچے سست رفتار ہوتے ہیں اور اگر ذہانت کی آزمائش کے بعد بچوں کو تقسیم کیا جائے تو مندرجہ ذیل درجہ بندی ہو گی -

درجہ بندی	مقیاس ذہانت یعنی ذہنی سطح سے زیادہ	شرح فی صد
فطین	130 سے زیادہ	7،25
بہت ذہین	130 – 120	6،75
ذہین	120 – 110	6،00
متوسط	110 – 90	60،00
غبی	90 – 80	13،00
احمق	80 – 70	1،00
ضعیف العقل	70 – 00	

مقیاس ذہانت سے مراد ہے کسی شخص کی طبعی عمر اور ذہنی عمر کا تناسب۔ ذہانت کی آزمائش کے بعد کسی شخص کے حاصل کردہ نمبروں کو ذہنی عمر میں تبدیل کر دیا جاتا ہے اور یہ پتا لگانے کے لیے کہ آیا وہ ذہین ہے یا غبی اس کی ذہنی عمر کو اصلی عمر سے تقسیم کر دیتے ہیں اور اعشاریہ ہٹانے کے لیے 100 سے ضرب دیتے ہیں - مثلاً ایک بچے کی طبعی عمر آٹھ سال ہے اور اس کی ذہنی عمر دس سال ہے تو اس کا مقیاس ذہانت معلوم کرنے کے لیے مندرجہ ذیل طریقہ استعمال کیا جائے گا -

$$\text{م - ذ} = \frac{120 \text{ ماہ}}{96 \text{ ماہ}} \times 100 = 125$$

تحقیق سے پتا چلا ہے کہ اگر ایک اوسط درجے کی ذہانت والے بچے کو ایسا ماحول میسر آئے جہاں رسالے اور کتابیں وافر ہوں، لوگوں

سے ملنے کے مواقع ملیں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن ہو، والدین توجہ دیں اور وہ کئی مقامات کی سیر کر چکا ہو تو اس کی ذہانت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ ممکن ہے کہ اس کا مقیاس ذہانت 100 سے 112 ہو جائے۔ اسی طرح ناسماعد حالات کی وجہ سے ذہانت میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔ اس تحقیق سے یہ ظاہر ہوا کہ ذہنی نشو و نما کے لیے حالات کا سازگار ہونا ضروری ہے۔ م، ذ میں کمی بیشی خاص حد تک واقع ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں ذہانت کی ایسی پیمائش تیار کی جا چکی ہیں۔ جن کی مدد سے ہمیں ذہنی اختلافات کا پتا چل سکتا ہے۔

انفرادی اختلافات اور عمل تدریس

صحیح تعلیم وہی ہے جس میں انفرادی اختلافات کو ملحوظ رکھا جائے۔ ان اختلافات کو مدنظر رکھ کر مندرجہ ذیل طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ خاص مدرسے:

بعض بچے ذہنی پسماندگی کی وجہ سے عام طلبہ کے ساتھ نہیں پڑھ سکتے۔ ان کے لیے علیحدہ مدرسوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ان کا نصاب ایسا ہونا چاہیے جو ان کی قابلیت کے مطابق ہو۔ ان کی تدریس کے طریقے بھی خصوصی ہوتے ہیں اور ان کے اساتذہ کی تربیت بھی خاص نہج سے کی جاتی ہے تا کہ وہ کند ذہن بچوں کو زندگی گزارنے کے قابل بنا سکیں۔ اس ہی طرح فطین بچوں کے لیے بھی مدرسے ہوتے ہیں۔

۲۔ گروہ بندی:

ہمارے ملک کے محدود وسائل کی وجہ سے علیحدہ مدارس کا قیام ممکن نہیں۔ اس کا متبادل انتظام کلاس میں گروہ بندی کے ذریعے کیا جا سکتا ہے یا پھر ان کے مختلف سیکشن بنائے جا سکتے ہیں لیکن عام طور پر سیکشن بنانے کا یہ نقصان ہے کہ پھسڈی بچوں پر بدھو ہونے کا ٹھپا لگ جاتا ہے اور دوسرے بچے یہ کہتے ہیں کہ یہ بدھوؤں کا

میکشن ہے - یہ بات والدین اور بچوں کے لیے باعث پریشانی بن جاتی ہے اس لیے جماعت میں گروہ بندی زیادہ مناسب ہے - گروہ بندی کی وجہ سے طریقہ ہائے تدریس میں لچک پیدا ہوتی ہے اور ان کو بچوں کی ذہانت کے مطابق ڈھالا جاتا ہے - مزید برآں ذہین بچے سست رفتار بچوں کے ساتھ پڑھ کر دلچسپی کھو بیٹھتے ہیں - گروہ بندی سے وہ اپنی سطح کے بچوں کے ساتھ رہ کر خوشی سے کام کرتے ہیں اور کند ذہن بچے احساس ناکامی کا شکار نہیں ہوتے -

۳ - کند ذہن بچوں کی اصلاحی تعلیم :

سکول کے اوقات میں یا مدرسے کے اوقات کے بعد خصوصی اساتذہ بچوں کو اصلاحی تعلیم دے سکتے ہیں جس میں وہ انفرادی توجہ دے کر اور سمعی بصری معاونات کی مدد سے سبق کو آسان بنا سکتے ہیں اور بچوں کی تعلیمی کمزوریوں کا پتا چلا کر ان کا تدارک کر سکتے ہیں - کھیل اور ڈرامے کے ذریعے بھی تعلیم کند ذہن بچوں کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے -

۴ - ذہین بچوں کے لیے نصاب وسیع کیا جا سکتا ہے :

نصاب میں توسیع سے ان کی دلچسپی قائم رہتی ہے اور ان کی ذہانت کو ابھرنے اور نکھرنے کا موقعہ ملتا ہے -

مندرجہ بالا طریقہ ہائے تعلیم کے لیے اساتذہ کی خصوصی تربیت ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ اساتذہ مخلص اور فرض شناس ہوں -

۳ - تحریک

ایک جماعت میں ایسے بچے بھی ہوتے ہیں جو سبق کے دوران پوری توجہ نہیں دیتے - ان میں سستی اور کاہلی کی خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں - اس کے مقابلے میں کچھ بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں سیکھنے کی خواہش تیز ہوتی ہے، تجسس اور تلاش کا جذبہ ہوتا ہے اور وہ نئے نئے تجربے کر کے اپنے تجسس کے جذبے کی تشفی کرتے ہیں -

ایک سست اور لاپرواہ بچے میں سیکھنے کی خواہش پیدا کرنا بھی استاد کے کاموں میں سے ایک ہے - استاد کو اپنی تدریس میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کرنے چاہییں مثلاً کھیل کے ذریعے تعلیم دے - جو سبق پڑھائے وہ بچوں کے ذاتی تجربوں سے مربوط ہو -

اگر ہم بچوں سے کہیں کہ وہ گم سم بیٹھ کر صرف سبق سنیں اور پڑھیں تو بچوں کی توجہ ایک جگہ قائم نہیں رہ سکتی - سبق عملی نوعیت کے ہونے چاہییں - اس طرح بچے کام کر کے خوش بھی ہوتے ہیں اور ان کی دلچسپی بھی قائم رہتی ہے -

سبق لمبے نہیں ہونے چاہییں اور استاد سمعی بصری معاونات کے ذریعے تعلیم دے -

۴ - دلچسپیاں :

بچے کچھ کام کر کے خوش ہوتے ہیں اور کچھ کاموں میں بیزاری کا اظہار کرتے ہیں - سب جانتے ہیں کہ ایک کام کسی خاص بچے کے لیے دلچسپی کا باعث ہوتا ہے لیکن دوسرا بچہ اسی کام میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا - دلچسپیاں اکتسابی ہوتی ہیں یعنی بچے اپنے ماحول سے چیزوں کو پسند یا ناپسند کرنا سیکھتے ہیں -

بچوں کی دلچسپیوں کا نصاب ، طریقۂ تدریس اور نصابی کتابوں سے گہرا تعلق ہے - عام مشاہدہ ہے کہ بچے جن کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں ان پر کافی وقت صرف کرتے ہیں - ان کاموں کو کرتے ہوئے تھکن اور بیزاری ان کے پاس نہیں پھٹکتی - اس کے برعکس دلچسپی کی عدم موجودگی ان کو جلد تھکا دیتی ہے -

اس کے علاوہ تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ بچے صحت مندانہ سرگرمیوں میں مصروف ہوں اور ان کی دلچسپیاں ان کی شخصیت کی تشکیل میں مدد دیں - معاشرہ دشمن مشاغل اور دلچسپیوں کا فقدان بچوں کو جرائم کی طرف راغب کرتے ہیں - مدرسہ ایسی جگہ ہے جہاں

بچہ ایسے مشاغل میں مصروف رہنا سیکھتا ہے جو اس میں خود اعتمادی اور قیادت کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں اور اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں - سکے یا ٹکٹ جمع کرنا ، قلمی دوست بنانا ، کہانیاں لکھنا، ڈراموں میں حصہ لینا ، سائنسی کلب بنانا ، فوٹو گرافی ، مصوری یا کوئی اور ہنر سیکھنا چند ایسے مشاغل ہیں جن کا انتظام مدارس میں ضروری ہے -

دلچسپیوں کو مد نظر رکھ کے بچوں کی گروہ بندی کی جا سکتی ہے - ایسی جماعتیں جہاں بچوں کی تعداد ساٹھ ستر کے قریب ہوتی ہے استاد کے لیے کئی قسم کے مسائل پیدا کرتی ہیں - اس کا حل یہ ہے بچوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے ان کی دلچسپیوں کے مطابق پڑھنے لکھنے کا کام دیا جائے - اس طرح بچے مصروف رہتے ہیں - استاد اس دوران اپنا کام کرتا ہے اور نظم و ضبط برقرار رہتا ہے -

۵ - صلاحیت :

بچوں کی صلاحیتیں بھی مختلف ہوتی ہیں مثلاً اگر دو بچے ایک ہی ذہنی سطح کے ہوں تو ضروری نہیں کہ ان کی صلاحیتیں بھی یکساں ہوں - ممکن ہے کہ ایک بچے میں مصنف بننے کی صلاحیت ہو تو دوسرے میں ڈاکٹر بننے کی -

تحریری اور تقریری کام کرنے کی صلاحیت ، عددی یا حساب سے تعلق رکھنے والے کاموں کی صلاحیت ، تصویر کشی کی صلاحیت ، ٹائپ کرنے اور دفتر کا کام کرنے کی صلاحیت ، موسیقی کی صلاحیت وغیرہ چند قابل ذکر صلاحیتیں ہیں -

یہ صلاحیتیں موروثی ہوتی ہیں - ماحول کا صرف اتنا دخل ہے کہ ان صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ملتا ہے - اگر صلاحیت کے مطابق کام نہ ملے تو انسان اطمینان قلب سے محروم ہو جاتا ہے - مضامین اور پیشے کا انتخاب صلاحیتوں کی روشنی میں کرنا چاہیے - اگر انتخاب کے

وقت والدین کی مرضی کو ٹھونسا جائے اور صلاحیتیں نظر انداز کر دی جائیں تو اکثر بچے کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا اور عمر بھر پچھتانا پڑتا ہے۔ استاد کا کام ہے کہ وہ بچوں کی صلاحیتوں کا پتا چلانے اور مضامین کے انتخاب میں ان کی صحیح رہنمائی کرے۔

۶۔ ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی اہمیت:

بچوں کے مسائل کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ چند بچے ان مسائل کا حل ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بعض بچے اپنے مسائل اس طرح حل کرتے ہیں کہ یا تو دوسروں کو نقصان پہنچتا ہے یا ان کی اپنی ذات کو۔ جرائم پیشہ یا مضطرب بچہ ایسی مثالیں ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ بچہ اپنے مسائل کا مناسب حل ڈھونڈھنے میں ناکام رہا ہے۔

شرارتیں، گستاخی، غیر حاضر دماغی، جھگڑالو پن اور چوری، چند ایسی علامتیں ہیں جو عدم مطابقت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ استاد رسمی اور غیر رسمی طریقوں سے پتا چلا سکتا ہے کہ کون سے بچے اضطراب میں مبتلا ہیں۔ وہ ان کی صحیح رہنمائی کر کے ان کو اس قابل بنا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسائل اس طرح سے حل کریں کہ معاشرے کو ان سے نقصان نہ پہنچے اور ان کی اپنی ذات بھی مجروح نہ ہو۔

یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ مدرسے کے بگڑے ہوئے بچے بڑے ہو کر معاشرے میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا کرتے ہیں اور نتیجتاً جیل خانہ اور پاگل خانہ ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

مدرسے میں بھی ایسے بچے دوران تدریسی رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں، نظم و ضبط میں خلل ڈالتے ہیں اور استاد کے لیے نہایت صبر آزما ثابت ہوتے ہیں۔

۶۔ بچوں کے مطالعے کے طریقے

استاد کے لیے صرف یہ کافی نہیں کہ وہ انفرادی اختلافات کی حقیقت کو تسلیم کرے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسے ان تمام

رسمی اور غیر رسمی طریقوں کا علم ہو جو ان اختلافات کے سمجھنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں - ہر جماعت میں عام طور پر بچوں کی تعداد تقریباً تیس چالیس کے قریب ہوتی ہے - اگر استاد ان سب کو کچھ سکھانا چاہتا ہے تو اسے ان کی خصوصیات کا بھی پتا ہونا چاہیے - ذیل میں ایسے طریقوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ان خصوصیات کا پتا لگایا جا سکتا ہے -

سکول کا ریکارڈ

سکول میں بچے کی کارکردگی کا ریکارڈ بچے کی نشو و نما کے بارے میں بہت مفید معلومات فراہم کرتا ہے - اس کے مطالعے سے بچے کی کمزوریوں اور صلاحیتوں کا علم ہوتا ہے - سکول ریکارڈ کا خاکہ ذیل میں درج ہے -

ذاتی کوائف

(الف) نام

(ب) تاریخ پیدائش

(ج) جماعت ، سیکشن

۲ - خاندانی کوائف

(الف) والدین یا سرپرست کا نام

(ب) والدین کی تعلیم

(ج) والدین کا پیشہ

(د) بہن بھائیوں کی تعداد

(ہ) والدین حیات ہیں ؟ ساتھ رہ رہے ہیں ؟ طلاق ہو چکی ہے ؟

۳ - تعلیمی ریکارڈ

(الف) کون کون سے مدرسوں میں پڑھا -

(ب) مضامین میں کتنے نمبر حاصل کیے (تمام پچھلا ریکارڈ)

(ج) حاضریاں

(د) استاد کی رائے

(ہ) معیاری آزمائشوں کے نتائج

(و) کتنی مرتبہ اور کس کس کلاس میں فیل ہوا۔

(ز) کوئی تادیبی اور انضباطی کارروائی

۴ - جسمانی صحت

(الف) بیماریاں ، کون کون سی اور کب ہوئیں

(ب) جسمانی نقائص

(ج) بینائی ، سماعت

(د) قد ، وزن

۵ - غیر نصابی سرگرمیاں :

(الف) کھیل

(ب) کلب ، انجمن ۔

(ج) خصوصی صلاحیت

ظاہر ہے کہ اس قسم کے ریکارڈ کی تیاری میں کئی طریقوں سے معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ اساتذہ کی رپورٹ ، ڈاکٹری معائنہ ، معیاری آزمائشیں ، کلاس ٹیسٹ اور والدین سے رابطے کے بغیر یہ ریکارڈ مکمل نہیں ہو سکتا۔ ریکارڈ بچے کی زندگی کا مختصر سا خاکہ ہے۔ اس کی تیاری میں کچھ وقت ضرور صرف ہوتا ہے لیکن اسے وقت کا نقصان نہیں کہا جا سکتا۔ سکول کے سربراہ کا فرض ہے کہ وہ اس ریکارڈ کی تیاری کے لیے ڈائری یا فائل مہیا کرے۔ مہینے کا آخری دن اس کام کے لیے وقف کیا جائے اور سربراہ وقتاً فوقتاً اس بات کا جائیزہ لے کہ آیا بچوں کے ریکارڈ مکمل ہیں کہ نہیں۔

استاد کی ڈائری

بعض اساتذہ ایسی ڈائری رکھتے ہیں جن میں وہ بچوں کے بارے میں نوٹس لکھتے ہیں۔ کچھ اساتذہ ہر بچے کے کام کے نمونے رکھتے ہیں۔ ان کی کامیابی اور کمزوریوں کے بارے میں چند جملے درج کر لیتے ہیں۔ وہ اس ڈائری میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ کون سا بچہ گھر سے کام کر کے لاتا ہے۔ کون سا بچہ دیر میں آیا ہے۔ کون گندے لباس میں آتا ہے۔ اس قسم کی ڈائری سے استاد یہ یاد رکھ سکتا ہے کہ کون کون سے بچے ایسے ہیں جن کو مسائل در پیش ہیں اور جنھیں مدد کی ضرورت ہے۔

انٹرویو

یوں تو استاد بچوں سے مخاطب ہوتا رہتا ہے لیکن باضابطہ انٹرویو کے دو خاص مقاصد ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ بچے کے رویے اور کردار کو سمجھے، دوسرے یہ کہ بچہ اپنے آپ کو پہچانے اور سمجھے۔ انٹرویو کا فائدہ یہ ہے کہ بچے کو انفرادی توجہ ملتی ہے۔ اس کے دوران وہ یہ جان جاتا ہے کہ استاد اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔

انٹرویو سے بچے کے گھر کے بارے میں پتا چلتا ہے۔ اس کی آرزوؤں کا علم ہوتا ہے اس کی عادات سے آگاہی ہوتی ہے۔

انٹرویو کی مدد سے بچے میں اپنے مسائل کے بارے میں سوچنے کی عادت ڈالی جا سکتی ہے۔ اس ہی دوران وہ غلط اور صحیح سوچ میں امتیاز کرنا سیکھتا ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو ہر بچے کا انٹرویو کیا جائے اور یہ بھی کوشش کی جائے کہ والدین سے بھی رابطہ قائم ہو۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں استاد پر کام کا اتنا بوجھ ہوتا ہے کہ ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے استاد صرف ان بچوں کا انٹرویو لے جن کو مدد کی خاص ضرورت ہے یعنی جنھیں تعلیمی یا ذاتی مسائل درپیش ہیں یا وہ جو جماعت کے ماحول سے مانوس نہیں ہو سکے۔ اساتذہ انٹرویو کے نوٹس بچے کے فائل میں رکھیں۔

مشاہدہ

عام طور پر دوسروں سے حاصل کی ہوئی معلومات قابل اعتماد نہیں ہوتی ہیں۔ اس لیے حقیقت جاننے کے لیے ذاتی مشاہدہ ضروری ہے۔ بچے مدرسے میں تقریباً چھ گھنٹے گزارتے ہیں۔ کمرہ جماعت اور کھیل کے میدان میں وہ اپنے کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کردار کا مشاہدہ بچے کے بارے میں بہت کچھ بتاتا ہے۔ مشاہدہ کرتے وقت درج ذیل قسم کے سوالوں کا جواب ڈھونڈا جائے۔

بچہ اکیلا ہوتا ہے تو اس کا رویہ کیا ہوتا ہے ؟

ہم عمروں کے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہے ؟

اپنے بڑوں سے کیسے پیش آتا ہے ؟

اسے کچھ سمجھایا جاتا ہے تو اس کا رد عمل کیا ہوتا ہے ؟

ناکامی اور شکست کے وقت وہ کیا کرتا ہے ؟

اس کے دوست کتنے ہیں ؟

وہ عام طور پر خوش نظر آتا ہے یا بسورتا رہتا ہے ؟

کیا وہ جلد تھک جاتا ہے ؟

وہ کتنی دیر تک متوجہ رہ سکتا ہے ؟

جانچ فہرست

اس فہرست میں چند صفات مختصراً درج ہوتی ہیں اور بجائے اس کے کہ استاد نوٹس لے وہ ان صفات پر نشان لگاتا جاتا ہے اور اس طرح بچے کے بارے میں کم وقت میں کافی معلومات جمع ہو جاتی ہیں۔

ذیل میں ایک ایسی فہرست درج ہے۔

اسکول سے بیزار۔

اسکول سے خوش۔

کام کرنے کی اچھی عادات۔

مضطرب -

معاشرتی طور پر کم عمر -

ذہنی طور پر پس ماندہ -

محدود ذخیرۂ الفاظ -

سننے میں نقص -

کمزور بینائی -

لڑتا ہے -

بات بات پر روتا ہے -

بہت مقبول ہے -

ناپسند کیا جاتا ہے -

گندہ لباس -

چست -

استاد اس قسم کی فہرست تیار کر کے ہر بچے کے فائل میں رکھے -

سوانح عمری

بچوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے حالات مختصراً لکھیں۔ وضاحت کے لیے انہیں ایک خاکہ دے دیا جائے تو صحیح معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔ اس میں بچے اپنے مسائل اور دلچسپیاں بیان کرتے ہیں اور اس طرح ان کی زندگی کے ایسے پہلو سامنے آ جاتے ہیں جو کسی اور طرح معلوم نہیں کیے جا سکتے -

معاشرتی تعلقات کی پیمائش

اس پیمائش سے یہ پتا چلتا ہے کہ کون سا بچہ مقبول اور ہر دلعزیز ہے ۔ کون سا بچہ ایسا ہے جسے دوسرے بچے ناپسند کرتے ہیں -

اس پیمائش سے مراد کوئی معیاری پیمائش نہیں بلکہ اس میں بچوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی جماعت کے ایسے بچے کا نام لکھیں جسے وہ دوست بنانا پسند کریں گے یا جس کے ساتھ کھیلنا یا بیٹھنا پسند کریں گے - انھیں ایسے بچے کا نام لکھنے کے لیے بھی کہا جائے جس کے ساتھ وہ دوستی نہیں کرنا چاہتے یا جس سے دور بیٹھنا چاہتے ہیں - اس طرح استاد کو پتا چلتا ہے کہ بچے ایک دوسرے کے بارے میں کیسے احساسات رکھتے ہیں - بچوں سے مندرجہ ذیل قسم کے سوالات بھی پوچھے جا سکتے ہیں -

بھلا بوجھو تو ———— وہ کون سا بچہ ہے جو ہر وقت لڑتا ہے؟

بھلا بوجھو تو ———— وہ کون ہے جو سب پر رعب ڈالتا ہے؟

بھلا بوجھو تو ———— کون سب سے زیادہ چپ رہتا ہے؟

سوال نامے

بچوں کی دلچسپیوں، خواہشات، تفکرات اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے سوال نامے استعمال ہوتے ہیں - اکثر ممالک میں ماہرین کی نگرانی میں تیار شدہ سوال نامے استعمال ہوتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں ابھی اس قسم کے سوال نامے تیار نہیں کیے گئے - استاد آسان زبان میں مختصر سوال نامے تیار کر سکتا ہے - سوال صرف ایسے ہوں جن کا جواب ہاں یا نہیں میں دیا جا سکے مثلاً

کیا آپ کو کتابیں پڑھنا پسند ہے؟ ہاں/نہیں -

کیا آپ کو جلد رونا آ جاتا ہے؟ ہاں/نہیں -

کیا آپ کو نئے لوگوں سے بات کرنا اچھا لگتا ہے؟ ہاں/نہیں -

معیاری آزمائش

بچوں کی ذہنی سطح اور صلاحیت کے لیے ایسی آزمائشیں استعمال

دی جاتی ہیں، جنھیں ماہرین نے تیار کیا ہے۔ پاکستان میں چند ایسی معیاری آزمائشیں تیار کی گئی ہیں جن کے استعمال کرنے کے لیے تربیت کی ضرورت ہے کیونکہ ان کے بے جا اور غلط استعمال سے بچوں کے بارے میں غلط معلومات ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ مدرسے میں اس بات کا انتظام کیا جائے کہ وقتاً فوقتاً ماہرین نفسیات ان معیاری آزمائشوں کی مدد سے بچوں کی ذہانت کا پتا چلائیں تاکہ بچوں کا صحیح ریکارڈ رکھا جا سکے اور تدریس میں مناسب تبدیلیاں لائی جا سکیں۔

مطالعۂ احوال

کسی فرد یا طالب علم کی شخصیت اور زندگی کے متعلق معلومات مطالعۂ احوال کے ذریعے حاصل کی جاتی ہیں۔ اس منظم اور مسلسل مشاہدے میں بہت سے پہلو شامل ہیں۔ یعنی اس بچے کے گھر کے حالات معلوم کرنا اور یہ جاننا کہ وہ کس قسم کے ماحول میں زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی دلچسپیاں کیا ہیں۔ ماضی میں کون کون سے اہم واقعات ہو چکے ہیں۔ ممکن ہے انھی واقعات میں سے کسی واقعے نے اس کی موجودہ زندگی پر گہرا اثر چھوڑا ہو۔ اس قسم کی معلومات صرف اس بچے سے بالمشافہ گفتگو کر کے حاصل کرنے تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ اس کے ملنے جلنے والوں، عزیز رشتے داروں اور دوستوں سے بھی استفسار کیا جاتا ہے تاکہ اس طالب علم کی صحیح سوانح عمری تیار کی جا سکے۔ مطالعۂ احوال میں اس شخص کی ذہانت، جذباتی کیفیت اور سیرت کا تفصیلی طور پر مطالعہ کیا جاتا ہے اور ان تمام کوائف کو اس رپورٹ میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ ذاتی انٹرویو، دوست اور احباب سے اس کے متعلق معلومات، اس کے ماضی اور حال کے واقعات، موجودہ طرز زندگی اور دلچسپیوں کی تمام تفصیلات اس رپورٹ میں درج ہو چکی ہیں تو ماہر نفسیات کے لیے نہایت آسان ہو جاتا ہے کہ اس شخص کی رہنمائی کر سکے۔ بعض اوقات معلم کو ایسے طالب علم سے واسطہ پڑتا ہے جو ذہنی یا عصبی پریشانی کی وجہ سے گھر اور سکول دونوں میں ایک مسئلہ بن چکا ہے۔ اپنے ماحول سے

مطابقت کرنے سے قاصر ہے۔ ممکن ہے معلم کے پاس اتنا وقت نہ ہو کہ مطالعۂ احوال کے ذریعے طالب علم کو ایسی پریشانی سے نجات دلائے۔ ایسی صورت میں ماہر نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے جو اس طریقے کے ذریعے طالب علم کی زندگی کی مکمل رپورٹ حاصل کرتا ہے اور اس کے مسائل حل کرنے میں صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔

(ا) مطالعۂ احوال کے اقدام

مطالعہ احوال کے مندرجہ ذیل اقدام ہوتے ہیں

۱ - **تشخیص مسئلہ :** سب سے پہلے یہ تعین کرنا چاہیے کہ اصل مسئلہ کیا ہے جو بچے کو پریشان کر رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے بچے کے متعلق تمام ضروری معلومات جمع کی جاتی ہیں۔

۲ - **علاج :** تشخیص کے بعد علاج کے لیے ایک باقاعدہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ بعض اوقات علاج کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ تشخیص درست نہیں تھی۔ ایسی حالت میں مزید معلومات حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

۳ - **مطالعہ مابعد :** علاج کے نتائج معلوم کرنا اس لیے ضروری ہے کہ پتا چل سکے کہ تشخیص کہاں تک درست تھی۔ ایسی معلومات مطالعہ مابعد سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تشخیص اور علاج نے بچے کے رویے میں کیا مثبت تبدیلی پیدا کی ہے۔

(ب) مطالعۂ احوال کا خاکہ

مطالعہ احوال میں بچے کے حسب ذیل کوائف شامل ہونے چاہییں ۔

۱ - **شناختی معلومات :** بچے کا نام ، جنس ، عمر ، جماعت ، نمبر داخلہ ، والدین کا نام اور گھر کا پتہ ۔

۲ - **زیر غور مسائل :** بچے کے وہ مسئلے جن کی وجہ سے مطالعۂ احوال کی ضرورت پڑی اور جن کا حل یا علاج مطلوب ہے ۔

۳ - **بچے کی تعلیم :** سابقہ مدارس ۔ زیر مطالعۂ مضامین ۔ امتحانات کے نتائج ۔ تعلیمی کمزوریاں اور کامرانیاں ۔

۴ - **بچے کی ذہانت :** معیاری ذہنی امتحانات کے نتائج ۔ بچے کا ذہنی معیار ۔

۵ - **بچے کی نشوونما :** بچے کی نشوونما کی تاریخ ۔ نشوونما میں موجود نقائص ۔ نشوونما پر اثر انداز عوامل ۔

۶ - **بچے کی موجودہ شخصیت :** بچے کی صحت اور جسمانی حالت ، غصہ ، خوف ، جرأت ، خوشی غمی ، پسند نا پسند ، لڑاکا پن ، شرمیلا پن ، خیال آرائی ، خواہشات ، عزائم ، نظریات ، اقدار اور کردار ۔

(ج) بچے کے متعلق معلومات کے مآخذ

مطالعۂ احوال تیار کرنے کے لیے بچے کے بارے میں مطلوبہ معلومات کے مآخذ حسب ذیل ہو سکتے ہیں ۔

۱ - بچے کے موجودہ سکول کا ریکارڈ ۔

۲ - بچے کے سابقہ مدارس سے حاصل شدہ ریکارڈ۔

۳ - بچے کے اساتذہ سے انٹرویو۔

۴ - بچے کے ہم جماعت طلباء سے انٹرویو۔

۵ - بچے کے والدین، بہنوں، بھائیوں، رشتہ داروں اور دوستوں سے انٹرویو۔

۶ - گھر، گلی، مسجد، سکول، کھیل اور سماجی سرگرمیوں میں بچے کا مشاہدہ۔

۷ - بچے کی ذہانت، میلانات، جذبات، دلچسپیوں اور تحصیل علم کے متعلق معیاری جائزوں کے نتائج۔

۸ - بچے کا خود نوشت روز نامچہ۔

۹ - شخصیات کے بارے میں بچے کی تحریر کردہ کہانیاں۔

۱۰ - بچے سے بالمشافہ گفتگو۔

(د) مطالعۂ احوال کی تیاری کے لیے رہنما اصول

مطالعۂ احوال تیار کرتے وقت حسب ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

۱ - معلومات غیر جانبدارانہ اور مبالغہ آرائی سے مبرا ہوں۔

۲ - تمام معلومات تدریجی انداز میں ترتیب دی جائیں۔ یہ معلومات ماضی میں بچے پر اثر انداز ہونے والے واقعات، موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات ہوں۔

۳ - مطالعۂ احوال کی رپورٹ حتی الوسع مختصر ، سادہ ، واضح اور قابل فہم ہو -

۴ - متعلقہ حقائق کا بھرپور تجزیہ کیا جائے - اس تجزیہ میں بالغ نظری ، بصیرت اور سابقہ تجزیہ سے کام لیا جائے -

۵ - ہر علامت اور اسباب علامات کو بخوبی سمجھا جائے -

۶ - بچے کے ہر مسئلے کی نشاندھی نہایت احتیاط سے کی جائے - ہر مسئلے کی تاریخ ، موجودہ صورت حال اور اس کی آئندہ سمت کو واضح کیا جائے -

۷ - ہر مسئلے کی تشخیص اور علاج کو حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہونا چاہیے -

۸ - **بچے کی سماجی مطابقت :** دوستوں کی تعداد یا دوستوں کے ساتھ رویہ - گروہی اقدار اور تعلقات -

۹ - **بچے کا خاندان :** خاندان کی تدریجی تاریخ - خاندان کا معاشرتی معیار و وقار ، خاندان کے افراد کی تفصیل ، والدین کی شخصیات ، تعلیم اور پیشے ، بچے کے والدین سے تعلقات ، بہن ، بھائیوں اور رشتہ داروں سے بچے کے تعلقات - خاندان کے پڑوسی خاندانوں سے مراسم -

سوالات

۱ - انفرادی اختلافات کی بنیادی وجہ ماحول ہے یا وراثت ؟

۲ - جماعت میں کون سی گروہ بندی مناسب ہے اور کیوں ؟ ذہنی سطح کے مطابق گروہ بندی یا دلچسپیوں کے مطابق گروہ بندی ؟

۳ - کیا مناسب اور یکساں ماحول مہیا کر کے انفرادی اختلافات دور کیے جا سکتے ہیں ؟

۴ - بچوں کی ذہنی سطح کیوں مختلف ہوتی ہے ؟

۵ - مختلف ذہانت کے بچوں کو کس طرح پڑھایا جائے ؟

۶ - مطالعہ احوال سے کیا مراد ہے ؟ ایک بچے کا مطالعۂ احوال تیار کیجیے -

نواں باب

رہنمائی

رہنمائی کا مفہوم

رہنمائی یا راہ نمائی کے لفظی معنی ہیں راہ دکھانا ۔ زندگی کے سفر میں ہر نووارد کو کئی ایسے مقامات سے واسطہ پڑتا ہے ۔ جہاں سے کئی راستے نکلتے ہیں اور جہاں کا راستہ وہ کسی کی مدد کے بغیر تلاش نہیں کرسکتا ۔ چنانچہ بھٹکنے اور پریشانی سے بچنے کے لئے اسے کسی باشعور اور تجربہ کار شخص سے راستہ دریافت کرنا پڑتا ہے ۔ ایک نوزائیدہ بچہ اس دنیا کے ہنگاموں میں ایک اجنبی کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے ۔ اس کو قدم قدم پر اپنے والدین کی مدد اور رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ صرف بچپن میں ہی نہیں بلکہ زندگی کی نشو و نما کے ہر دور اور ہر مرحلے پر ایک انسان کو دوسرے انسان کے صلاح مشورے اور اعانت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔

رہنمائی کی ضرورت تو ہمیشہ سے محسوس ہوتی رہی ہے ۔ اوائل میں رہنمائی کے طریقے فرسودہ اور غیر سائنسی تھے جن کی بنیاد رسم و رواج ، روایات اور توہمات پر تھی ۔ گھر میں والدین اور سکول میں استاد کا ہر جائز و ناجائز حکم ماننا بچے کے لیے فلاح دارین کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا ۔ لوگ مسائل کے حل کے لیے پیر ، فقیر، جوتشیوں اور نجومیوں سے بھی راہنمائی حاصل کرتے تھے ۔ موجودہ سائنسی دور میں جہاں دیگر انسانی مسائل کے حل کے لیے سائنسی طریقے استعمال کیے گئے وہاں رہنمائی کے سلسلے میں بھی سائنسی انداز فکر اختیار کیا جائے گا ۔ جدید ماہرین کی رائے میں رہنمائی کا مقصد بچوں کی شخصیت کی مکمل اور بھرپور نشو و نما ہے ۔ والدین اور اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ ملکی و ملی امنگوں ، نظریات اور نصب العین کو مد نظر رکھتے ہوئے بچوں کے لیے ایسا ماحول پیدا کریں

کہ وہ نیک و بد، صحیح و غلط میں بآسانی تمیز کر سکیں۔ مثل مشہور ہے - خشت اول چوں نہد معمار کج - تا ثریا میردد دیوار کج - فرد کی صحیح نشو و نما کے لیے اس کی ابتدائی زندگی کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ایک عمارت میں بنیادی اینٹ کو حاصل ہوتی ہے - لہٰذا افراد کی رہنمائی اور دیکھ بھال بچپن سے ہی ہونا چاہیے - جس طرح سے ایک پودے کی نگہداشت کے لیے کھاد، زمین اور آب و ہوا کی موزونیت اور کاشت کاری کے تمام اصولوں سے واقفیت ضروری ہے، اسی طرح بچوں کی رہنمائی کے لیے والدین اور اساتذہ کو بچوں کے فطری تقاضوں اور تعلیمی مقاصد اور اس کے متعلق مسائل کی پوری پوری واقفیت ہونی چاہیے - اس کے لیے اطلاقی نفسیات اور شماریات کا تھوڑا بہت علم ہونا اشد ضروری ہے -

بچوں کی بنیادی ضروریات

چونکہ [illegible] کا مقصد بچوں کی شخصیت کی بھرپور نشو و نما ہے صرف بچے کی [illegible] نشو و نما ہی پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کی ذہنی، جذباتی [illegible] معاشرتی نشو و نما کے تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا جائے - اس مقصد کے لیے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ بچے کی بنیادی ضروریات کیا ہیں - جس طرح پودے کی بنیادی ضرورت ہوا، روشنی اور پانی ہے اور اس کے بغیر پودا سوکھ جاتا ہے اسی طرح بچے کی بھی کچھ بنیادی ضروریات ہوتی ہیں - جن کی ماہرین نفسیات نے نشاندہی کی ہے - ان ضروریات کی عدم تسکین بچے کی شخصیت کی نشو و نما اور ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہے -

آئیے دیکھیں کہ ماہرین نفسیات کی نظر میں بچوں کی بنیادی ضروریات کیا ہیں؟ جب تک استاد کو یہ معلوم نہ ہو کہ بچے

کی نشو و نما کے کس مرحلے میں کس چیز کی احتیاج یا ضرورت ہے ، وہ اس ضرورت کے پورا کرنے کا بندوبست نہیں کر سکتا ۔ چونکہ ضروریات کی تسکین اور تعلیمی پروگرام کی بنیادی ضروریات سے ہم آہنگی بچوں کی ذہنی صحت کے لیے لازم و ملزوم ہیں ، للہذا ضروری ہے کہ استاد بچوں کی بنیادی ضروریات معلوم کرے اور ان کے مطابق تعلیمی پروگرام مرتب کرے ۔

۱ ۔ جسمانی یا طبیعی ضروریات

جسم کی نشو و نما کے لیے تازہ ہوا ، روشنی صاف اور متوازن غذا کی ضرورت ہے ۔ تنگ و تاریک مقامات میں رہنے والے بچے کی شخصیت کی مثال بالکل اس پودے کی مانند ہے جس کو باغ کی کھلی اور روشن فضا سے اٹھا کر کمرے میں بند کر دیا جائے ۔ اس صورت میں وہ پودا چند دن میں مرجھا جائے گا ۔ اسی طرح اگر بچے کو نشو و نما کا مناسب ماحول اور بنیادی ضروریات فراہم نہ کی جائیں تو اس کا جسم لاغر ، چہرہ زرد اور آنکھیں بے رونق نظر آئیں گی ۔ وہ ہر وقت سست اور تھکا تھکا نظر آئے گا ۔ گھر کے یا سکول کے کسی کام میں مستعدی سے حصہ نہ لے سکے گا ۔ کیونکہ وہ اپنی بنیادی ضرورتوں سے محرومی کی وجہ سے ناکارہ ہو چکا ہوگا ۔ اگر والدین اور اساتذہ اسے تازہ ہوا ، روشن فضا ، صاف پانی اور متوازن غذا مستقل طور پر مہیا کر سکیں تو یہی بچہ گھر کا روشن چراغ اور سکول کا درخشندہ ستارا بن سکتا ہے ۔ جس طرح تیل کے بغیر دیا بجھ جاتا ہے اسی طرح بنیادی ضروریات کی تسکین کے بغیر بچے کی صحیح اور معیاری نشو و نما رک جاتی ہے ۔

جسم کو مستقل حرکت میں رکھنے سے طاقت خرچ ہوتی ہے اور کچھ عرصے کے بعد کام کی رفتار سست پڑ جاتی ہے ۔ ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے ہیں اور کام کرنے کی سکت باقی نہیں رہتی ۔ یہ بات بالکل اسی طرح ہے کہ موٹر کار چلتی ہے تو پٹرول صرف ہوتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ پٹرول ختم ہو جانے کے باعث موٹر کھڑی ہو جاتی ہے اور

اس وقت تک نہیں چلتی جب تک مزید پٹرول نہ ڈالا جائے۔ یہی عالم انسان کا ہے۔ طاقت بحال کرنے کے لیے خوراک، پانی، ہوا اور روشنی کے علاوہ تھکے ہوئے اعضاء کے لیے آرام اور نیند بھی بنیادی ضروریات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں بچوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے درسگاہوں میں کشادہ، ہوا دار اور روشن کمرے، کھیل کے وسیع میدان اور آرام کے لیے پر سکون مقام، آرام دہ فرنیچر، ٹائم ٹیبل میں آرام اور تفریح کے لیے موزوں وقفے، پینے کے لیے صاف پانی اور کھانے کے لیے متوازن خوراک کا بندوبست اساتذہ کی رہنمائی کے پروگرام کا جزو لاینفک ہے۔

بھوکے، پیاسے اور تھکاوٹ کا شکار بچے بے اطمینانی، بے چینی اور اضطراب میں مبتلا ہونے کے باعث ہر وقت تنگ آمد بہ جنگ آمد کی صحیح تصویر ہوتے ہیں۔ بات بات پر لڑائی جھگڑا اور فساد برپا کرتے ہیں اور اساتذہ کے لیے شدید درد سر اور بد نظمی کا مسئلہ پیدا کرتے ہیں۔ اس مسئلے کا حل ایک ذی شعور استاد بچے کی طبعی ضروریات کو مد نظر رکھ کر کرسکتا ہے۔

جسم کی ایک ضرورت موزوں درجہ حرارت بھی ہے مثلاً جون جولائی کی گرمی میں جسمانی حرارت کو حدت سے بچانے کے لیے مدرسوں میں ٹھنڈے پانی اور پنکھوں کا معقول انتظام اور موسم سرما کی یخ بستہ ہواؤں سے بچنے کے لیے ایسے کمرے ہوں جن میں خوب دھوپ آتی ہو اور شدید سرد ہواؤں سے بچاؤ کا بندوبست ہو۔ بد قسمتی سے ہمارے اکثر سکول موسم کی شدت سے بچوں کو بچانے کے لیے کوئی اہتمام نہیں کرتے، جس کے باعث بچے اضطراب اور پریشانی کا شکار ہو کر استادوں کے لیے نظم و ضبط کا بہت بڑا مسئلہ پیدا کرتے ہیں۔ لو سے جھلستے چہرے اور سردی سے کپکپاتے جسم، سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں کھو بیٹھتے ہیں گویا ذہنی سکون اور جسمانی سکون لازم و ملزوم ہیں۔

جذباتی ضروریات

آپ نے گزشتہ باب میں پڑھا ہے کہ جذبات آندھی کی طرح یکایک نمودار ہوتے ہیں اور بگولے کی مانند غائب ہو جاتے ہیں لیکن جس طرح شدید طوفان گزر جانے کے بعد اس کی تباہی کے نشانات دیر تک قائم رہتے ہیں ، اسی طرح شدید غصے ، شدید خوف ، محبت ، رنج و غم کے جذبات اور حادثات آ کر گزر تو جاتے ہیں لیکن گہرے زخم چھوڑ جاتے ہیں - ماہرین نفسیات کی تحقیقات کے مطابق خصوصاً ان واقعات اور حوادث کے اثرات پوری زندگی کو متاثر کرتے ہیں ، جو بچے کی اوائل عمری میں پیش آتے ہیں - دیکھنا یہ ہے کہ بچے کی جذباتی ضروریات کیا ہیں اور ان کی عدم تسکین کیا کیا مسائل پیدا کرتی ہے اور ایک معلم بطور نگران رہنمائی ان مسائل کا تدارک کس طرح کر سکتا ہے -

احساس تحفظ

عزیز و اقربا اور بہی خواہوں کی ہمدردی ، محبت اور وفاداری فرد کے لیے باعث تقویت و حوصلہ ہوتی ہے - ایک فرد اپنے ملک ، شہر ، گلی ، محلے ، گھر ، سکول اور جماعت میں اپنے تئیں زیادہ محفوظ محسوس کرتا ہے - اس کے برعکس نئے اور اجنبی ماحول میں وہ خود کو تنہا اور غیر سا محسوس کرتا ہے اور اسے عدم تحفظ کا احساس ہوتا ہے - اس میں خود اعتمادی کم اور خوف و ہراس ، گھبراہٹ اور بے چینی کے نمایاں آثار نظر آئیں گے - چنانچہ مضبوط اور پُروقار شخصیت کی نشو و نما کے لیے ہمدردی اور محبت کی فراوانی لازم ہے - اس کے برعکس اجنبیت ، بے تعلقی اور غیر مانوس احباب اور ماحول بچے کو بزدل کمزور ، مضطرب ، بے چین ، ناقابل اعتماد اور چڑچڑا بنا دیں گے جو گھر میں والدین کے لیے اور سکول میں ہم جماعتوں اور اساتذہ کے لیے ایک مسئلہ لاینحل بن جائے گا -

گھر میں محبت و تحفظ

بچپن میں انسان کو سیر و تفریح اور گھر سے باہر دوسرے مقامات پر جانے کا فطری شوق ہوتا ہے اور کچھ عرصہ کے لیے گھر سے باہر سیر و تفریح ذہنی صحت کے لیے مفید بھی ہے اور ضروری بھی۔ مثل مشہور ہے کہ جو سکھ چھجو کے چوبارے۔ نہ بلخ نہ بخارے۔ گویا اصل راحت و آرام اور سکون و اطمینان کسی بھی شخص کو اپنے گھر اور مانوس ماحول میں ہی نصیب ہوتا ہے۔ کسی غیر جگہ اگر تھکا ماندہ شخص بے تکلفی سے لیٹنا، بیٹھنا، سونا اور کھانا چاہے تو غیریت محسوس کرتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اپنا گھر گوشۂ جنت ہوتا ہے، خواہ دوسرے مقامات کی نسبت اس میں آرام و آسائش کے سامان کم ہی ہوں۔ اس گھر میں بسنے والے افراد کا آپس میں خونی رشتہ ہوتا ہے۔ ماں باپ، بہن اور بھائی اور دیگر رشتہ دار ان کی خوشیاں اور غم ایک ہوتے ہیں۔ سونا، اوڑھنا بچھونا اور کھانا پینا ایک سا اور اکثر خیالات، امنگیں، نظریات اور اقدار بھی یکساں ہوتے ہیں۔

اکثر و بیشتر گھرانے اپنے مکینوں کے لیے گوشۂ عافیت ہوتے ہیں لیکن چند بدقسمت گھر ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ والدین کی آپس میں ناچاقی، لڑائی جھگڑا، خیالات و نظریات اور اقدار میں اختلافات ہوتے ہیں۔ ایسے گھر جہنم کا نمونہ ہوتے ہیں اور ان میں پرورش پانے والے بچے ماں باپ کے جھگڑوں کی وجہ سے سہمے ہوئے رہتے ہیں۔ ان میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی سے بےزار ہو جاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ذہنی مریض ہو جاتے ہیں اور تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق چڑچڑے ہونے کی وجہ سے جھگڑا اور دنگا فساد کرتے ہیں۔ استادوں اور ہم جماعتوں کے لیے عذاب بن جاتے ہیں۔ مگر حقیقتاً وہ توجہ، ہمدردی، رہنمائی اور نگرانی کے محتاج ہوتے ہیں، کیونکہ گھر میں محبت سے محرومی

کے سبب وہ تحفظ اور امن و سکون کے متلاشی ہوتے ہیں ۔ والدین کو بدلا نہیں جا سکتا لیکن والدین سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کر کے بعض اوقات ان کا رویہ تبدیل کیا جا سکتا ہے ۔ ایسے گھروں کے بچوں سے اساتذہ کے انٹرویو انہیں گھر کے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں مدد دے سکتے ہیں اور گھر کی محرومیوں کے احساس کو رہنما استاد سکول میں دیگر اساتذہ اور طلبہ کی مدد سے کم کر سکتا ہے ۔ والدین کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بچے کو غذا سے زیادہ محبت اور تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے ۔ غذا کی کمی دواؤں سے پوری ہو سکتی ہے لیکن والدین کی محبت اور تحفظ کا کوئی نعم البدل نہیں ۔

محبت و تحفظ سکول میں

جس وقت بچہ گھر کے پرسکون ماحول سے صرف چند گھنٹوں کے لیے تعلیم کے واسطے سکول کے اجنبی ماحول میں آتا ہے تو عام طور پر اس کی عمر بمشکل پانچ سال ہوتی ہے ۔ گھر میں تمام حالات میں وہ آزاد ہوتا ہے۔ جب دل چاہتا ہے سوتا ہے، رفع حاجت کے لیے بلا پابندی اوقات اسے اجازت ہوتی ہے ، وہ گھر میں ہر ایک کی آنکھ کا تارا ہوتا ہے ، اہل خانہ اس کے حکم اور اشارے کے منتظر ہوتے ہیں ، لیکن سکول میں بھوک اور پیاس کی تسکین کے لیے وقفے کا انتظار کرنا پڑتا ہے ۔ رفع حاجت کے لیے اگر بلا اجازت اٹھ کر چلا جائے تو سزا کا خطرہ ہوتا ہے ۔ کئی بچے تو استاد کی اجازت نہ ملنے پر جماعت کے اندر ہی ڈر سے وہ کام کر لیتے ہیں جو انہیں غسل خانے میں کرنا تھا ۔ استاد بھی اگر ہٹلر قسم کا آمر بن جائے تو معصوم بچے کے لیے سکول میں کسی طرح کی کشش نہیں ہوتی ۔ متذکرہ بالا صورت میں بچے کے لیے سکول ایک جیل کا نمونہ پیش کرتے ہیں اور بچے نہ صرف عدم تحفظ کا شکار ہوتے ہیں بلکہ سکول سے بھاگتے ہیں اور تعلیم سے بے زار ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات تعلیم اور سکول سے اس قدر شدید نفرت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ تمام عمر خوف زدہ ہو کر سکول کا رخ ہی نہیں کرتے اور تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں لہذا رہنمائی کا اولین مقصد سکول میں گھر

کا سا پرسکون ماحول اور اساتذہ کو اپنے اندر والدین کی سی محبت و شفقت کا پیدا کرنا ضروری ہے۔ استاد کا کام صرف پڑھانا نہیں بلکہ ایسی فضا اور ماحول پیدا کرنا ہے جس میں بچے دلچسپی اور لگن سے تعلیم حاصل کریں اور ان کی شخصیت کے تمام پہلو اور خوبیوں کی نشوونما ہو۔ سکول میں ہم نصابی پروگرام کی نگرانی رہنما معلم خود کرے اور دیکھے کہ ہر بچہ اپنی صلاحیت کے مطابق اس میں بھرپور حصہ لے۔

نظم و ضبط کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا لیکن سکولوں میں عام طور پر ڈنڈے کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یاد رہے سزا اور جزا دونوں کا اثر محض وقتی ہوتا ہے۔ لیکن محبت اور حوصلہ افزائی کے ذریعے بچوں میں ضبط نفس پیدا کرنے سے نظم و ضبط کے تمام مسائل حل ہو جاتے ہیں اور پھر بچے استاد کا ہر حکم اس لیے نہیں مانتے کہ وہ آمر ہیں کرتے ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں ان کی بھلائی ہے اور رہنما قبل استاد دوست ہے۔

رفاقت اور سماجی وقار کی ضرورت

زندگی کے ہر موڑ پر اور ہر مرحلے پر انسان کو ہمدرد دوستوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جو اس کے بھی خیر خواہ ہوں اور صحیح مشورے دینے اور رہنمائی کرنے والے ہوں۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ساتھی احباب اور ہم عمروں میں عزت و وقار کی نظر سے دیکھا جائے۔ بعض والدین اور اساتذہ اچھی تربیت کے نام پر بچوں کو اپنے ہم عمر بچوں سے ملنے جلنے اور کھیلنے کودنے سے روکتے ہیں۔ ایسا بچہ اپنے تئیں دنیا میں تنہا اور بے یارو مددگار محسوس کرتا ہے اور اس کی شخصیت کا سماجی پہلو (Social aspect) بالکل مفلوج اور ناکارہ ہو جاتا ہے۔ وہ بڑا ہو کر آدم بیزار اور عدم مطابقت کا شکار ہو گا۔ ہر ایک کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھے گا۔ معاشرے میں اپنا وقار کھو کر محرومی کا شکار ہو گا لہٰذا گھر میں والدین اور سکول میں اساتذہ ایسے مواقع بہم پہنچائیں جن میں بچے اپنے ہم عمر اور ہم خیال بچوں سے مل کر رفاقت کی بنیادی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ عمل رہنمائی کی بنیاد

ہی بچے کے فطری تقاضوں کو سمجھنا اور پھر ان کی تسکین کے لیے وسائل کا بہتر استعمال کرنا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اس لیے اس کی شخصیت کے ہر پہلو کو پوری طرح سے اجاگر کرنے کے لیے اس کی متوازن اور صحیح تعمیر اور نشو و نما کے لیے اس کی بنیادی ضروریات سے مکمل آگاہی اور پھر ان ضر ریات کی تسکین بچے کو احساس محرومی ، رنج و ملال ، احساس کمتری ، کم حوصلگی اور شکست خوردہ ذہنیت سے بچا لے گی اور بچہ ہنستا مسکراتا ، پرعزم و استقلال ، خود اعتماد ، باشعور اور ملک و قوم کا قابل فخر شہری بن جائے گا۔

بعض والدین اور اساتذہ نادانستہ طور پر بچوں کے سماجی وقار کو ٹھیس پہنچاتے ہیں ۔ ان کی بے موقع ڈانٹ پھٹکار یا تنبیہ اس کی شخصیت کو مجروح کر دیتی ہے۔ مثلاً عمران کا امتحان قریب ہے۔ وہ ذہین ہے لیکن محنتی کم اور کھیل کا شوقین زیادہ ہے ۔ اپنے دوستوں کے ساتھ گھر میں داخل ہوتا ہے ۔ ادھر سے ماں کی آواز آتی ہے ”آگیا کام چور کھلنڈرا“ دوسری طرف سے والد نے گرج دار آواز میں بلایا ”عمران ادھر آؤ“ اور پھر نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ دوستوں کے سامنے اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا ۔ بظاہر عمران خاموش رہا اور آنسو پی گیا لیکن اپنے دوست اور ہمجولیوں کے سامنے اپنی پٹائی اور بے عزتی کا زخم اوز اپنی بے چارگی کا احساس مستقل صورت میں اس کے دل پر نقش ہو گیا ۔ اسی طرح فوزیہ کو اس کی استانی ہر وقت نالائق کہتی ہے، ایک دن وہ سب سے پہلے سوال حل کر کے استانی کو دکھاتی ہے ۔ اس کے باوجود استانی کلاس کو مخاطب کر کے کہتی ہے۔ ”دیکھو لڑکیو ! فوزیہ جیسی نالائق لڑکی نے بھی سوال حل کر لیا اور تم نے ابھی تک نہیں کیا۔ اس طرح کے رویے سے والدین اوراساتذہ نادانستہ طور پر بچوں کی انا کو مجروح کرتے ہیں اور ان کے سماجی وقار کو ٹھیس پہنچاتے ہیں ۔ دیکھیے فوزیہ کی استانی نے بچی کی تعریف کرنے میں کس قدر بخل سے کام لیا۔ اصل میں سماجی وقار، قدر دانی اور عزت نفس بچے کی اسی طرح بنیادی

ضروریات ہیں جس طرح ہوا، روشنی اور خوراک کی تسکین اشد
ضروری ہے۔

تفریحی اور فرصت کے مشاغل

جس طرح ہر وقت کا کھیل انسان کو نکما، ناکارہ اور بے کار بنا
دیتا ہے، اسی طرح ہر وقت کا کام اور کھیل و تفریح کا فقدان انسان
کو غبی،کند ذہن اور بور شخصیت بنا دیتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ
بعض والدین اور اساتذہ کرام کام کی اہمیت پر بہت زور دیتے ہیں لیکن
تفریح اور فرصت کے مشاغل کو تضیع اوقات تصور کرتے ہیں۔
کئی ذہین بچے دیکھے گئے ہیں جو امتحان میں تو ضرور اول آتے ہیں
لیکن وہ بدذوق، بور، عدم تعاون کے شکار اور عوامی مقبولیت سے محروم
ہوتے ہیں۔

ایک ترقی پذیر ملک کے وسائل محدود ہوتے ہیں۔ چنانچہ تعلیمی
پروگرام میں سرمائے کی کمی کے باعث مضامین میں تنوع اور انتخابی
مضامین کی تعداد بھی کم ہوتی ہے، لہٰذا ہر بچے کو اس کے فطری اور
ذہنی رجحان کے مطابق مضامین نہیں مل سکتے، جس کے باعث تدریسی
مضامین کے احاطے میں صلاحیتوں کی مکمل تشکیل و نشو و نما ممکن
نہیں اور اگر بچے کی ان تشنہ صلاحیتوں اور ذہنی رجحانات کو
نظر انداز کر دیا جائے تو ظاہر ہے احساس محرومی سے بچے کی شخصیت
کے تمام پہلو مکمل طور پر نشو و نما نہ پا سکیں گے اور بچہ سماج کا
درخشندہ ستارہ نہ بن سکے گا۔ تدریسی مضامین کو ہر بچے کے ذہنی اور
فطری رجحان کے مطابق ڈھالنا بہت مشکل ہے۔ تاہم ایسے ذرائع استعمال
کیے جا سکتے ہیں جن سے بچے فرصت کے لمحات میں اپنی فطری صلاحیت
کو اجاگر کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک بچہ عرفان جس کا رجحان فائن آرٹ کی
طرف تھا۔ مگر سکول میں اس مضمون کی تدریس کا کوئی بندوبست نہ تھا،
اسے آرٹس کونسل کی کلاس میں داخلہ دلا دیا گیا۔ وہاں
اپنے رجحان طبع اور دلچسپی کے سبب اس کا شمار اپنے گروہ کے
بہترین طلبہ میں ہونے لگا۔ حالانکہ سکول کے مضامین میں
وہ معمولی طلبہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس طرح اگر یہ بچہ اپنے فرصت

کے اوقات میں مصوری کی طرف توجہ نہ دیتا تو اس کی شخصی وقار اور عزت نفس کی بنیادی ضرورت پوری نہ ہوتی اور وہ سکول کے منتخب مضامین کے مطابق محض معمولی طالب علم گنا جاتا۔ احساس کمتری، عدم تحفظ و طمانیت کا شکار ہوتا اور شخصی وقار اور خود اعتمادی کھو بیٹھتا۔

کام کرنے سے جسمانی طاقت خرچ ہوتی ہے، جس کی بحالی کے لیے خوراک اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح پڑھنے لکھنے اور دوسرے ذہنی کاموں میں ذہنی طاقت خرچ ہوتی ہے، جس کی بحالی کے لیے تفریح اور کھیل کی ضرورت ہے۔ والدین اور رہنمائی کے نگران اساتذہ کو ہر بچے کی پسند اور ناپسند کو مدنظر رکھتے ہوئے سکول کے اندر اہم نصابی سرگرمیوں کی صورت میں تفریح کے مناسب مواقع فراہم کرنے چاہییں یہ سرگرمیاں نہ صرف کھیل کود کا موقعہ فراہم کرتی ہیں بلکہ ان کے ذریعے سیرت و شخصیت کے وہ تمام مراحل بھی طے پاتے ہیں جن کی تکمیل تدریسی مضامین اور لکھنے پڑھنے سے نہیں ہوتی۔ تفریحی ہم نصابی پروگرام میں کھیلیں، ڈرامے، موسیقی، سیاحت، کشتی رانی، گرل گائیڈنگ، سکاؤٹنگ، جونیئر کیڈٹ کور، ہلال احمر، سول ڈیفنس، کشتی اور کبڈی وغیرہ شامل ہیں۔

اساتذہ کرام کو یاد رہے کہ ان سرگرمیوں کو مرتب کرتے وقت واضح مقاصد کے ساتھ منظم پالیسی کا تعین ضروری ہے۔ اس کے بغیر طلبہ کی تفریح اور دلچسپی، سماجی تحفظ، باہمی تعاون، خود اعتمادی، گروہی رابطہ اور جذباتی استحکام کے مقاصد اور افادیت کا پہلو ناکام ہو جاتا ہے۔ اساتذہ کی عدم دلچسپی، نگرانی اور تنظیم کے بغیر یہ تحریکات وقت اور دولت کا زیاں ہیں۔

نشو و نما کے ارتقائی مدارج کے مسائل

عمل رہنمائی کے پروگرام کو مرتب کرتے وقت نشو و نما کے ہر مرحلے کی بنیادی ضروریات اور پھر ان کا نصاب تعلیم کے مضامین سے رابطہ اور ہم آہنگی اشد ضروری ہے۔ یہ مانا کہ انفرادی اختلافات

نشو و نما کا ایک اہم جزو ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی نشو و نما کے مرحلے میں چند ایسے بنیادی لوازمات ہیں جن کا علم معلم رہنمائی کے لیے لازم ہے۔

سن بلوغت سے قبل لڑکپن میں سرعت سے پیدا ہونے والے جسمانی تغیرات کی وجہ سے بچے بے چینی، سستی اور ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں، لیکن گروہی کھیلوں اور گروپ بندی میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ لڑکے اور لڑکیوں کی دلچسپیوں میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں بچے بہت متلون مزاج ہوتے ہیں۔

سن بلوغت میں پہنچ کر بچے جسمانی لحاظ سے مکمل مرد یا عورت نظر آتے ہیں۔ اس عمر میں وہ انتہائی حساس اور جذباتی ہوتے ہیں۔ وہ ہمچوما دیگرے نیست، کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ کسی کی طرف سے نکتہ چینی اور صلاح مشورے کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ بعض موقعوں پر سرکشی، بغاوت اور خود سری کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتے ہیں۔ مذہب کی طرف رجحان ہوتا ہے۔ اپنے لیے ایک مثالی شخصیت (Ideal) کی تلاش میں، چلتا ہوں تھوڑی دور ہر راہ رو کے ساتھ کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ بننے سنورنے اور مقبولیت کے متلاشی رہتے ہیں۔ گھر سے باہر رہنا پسند اور پابندیوں سے نفرت کرتے ہیں۔ جنس مخالف میں شدت سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔

رہنمائی کے عمل میں بچے کی متذکرہ بالا ارتقائی ضروریات کے پیش نظر مضامین اور دیگر اہم نصابی مشاغل میں اس کی نشو و نما کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایسا مواد مہیا کرنا چاہیے جو جذبات و نظریات اور ذہنی رجحانات کے مطابق ہو یا اس کی شخصیت کے تمام پہلو توازن کے ساتھ نشو و نما پا سکیں۔ والدین اور اساتذہ کی شخصیت ایسی مثالی ہو کہ بچہ انھی کو اپنا آئیڈیل تصور کرے اور ادھر آدھر بھٹکتا نہ پھرے۔

رہنمائی کے استاد کا زیادہ تر تعلق لڑکپن اور بلوغت کے مرحلے میں داخل ہونے والے طلبہ سے ہوتا ہے۔ لہٰذا نشو و نما کے مسائل اور

بچوں کی متعلقہ ضروریات کا علم حاصل کرنے کے لیے نفسیات کی تعلیم بہت مفید ثابت ہوتی ہے -

علاج سے انسداد بہتر ہے - اگر اساتذہ کو قبل از وقت بچوں کے ارتقائی مدارج اور نشو و نما کے مسائل اور ضروریات معلوم ہوں تو وہ بچوں کو ہر وقت معلومات بہم پہنچا کر انہیں بہت سی پریشانیوں اور الجھنوں سے نجات دلا سکتے ہیں -

رہنمائی کے بنیادی اصول

عام طور پر اساتذہ کرام رہنمائی کو تعلیم و تدریس سے علیحدہ ایک تنظیم تصور کرتے ہیں لیکن در اصل رہنمائی تعلیم کا ایک بنیادی حصہ ہے - اس سے مراد ہر وہ پروگرام اور فعالیت ہے جو بچے کی فلاح و بہبود کے لیے کیا جائے۔ ہر وہ عملی قدم جو استاد طالب علم کی مشکلات کے حل کے لیے اٹھاتا ہے رہنمائی میں شامل ہے -

۱ - رہنمائی کی اول شرط ایک چاق و چوبند، دانا و بینا تجربہ کار استاد ہے جو طالب علم کا چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، جماعت کے اندر اور جماعت کے باہر مشاہدہ کرتا رہے -

۲ - رہنمائی کے لیے بچوں کی بنیادی ضروریات، شعوری ارتقا، جسمانی، جذباتی اور معاشرتی نشو و نما کا مکمل علم ہونا ضروری ہے تاکہ استاد حتی الامکان بچوں کی شخصیت کے ہر پہلو کی نشو و نما کے لیے خوشگوار فضا پیدا کرے -

۳ - استاد، والدین اور طالب علم کے درمیان افہام و تفہیم، تعاون و رابطہ، اعتماد اور محبت ہونا لازم ہے تاکہ یہ مثلث باہمی تعاون سے طلبہ کے انفرادی مسائل اور الجھنوں کو سمجھ سکیں اور باہمی مشورے سے ان کو حل کرنے کی کوشش کریں -

۴ - عصر حاضر کے مادی نظریات کے باعث زندگی کی دشواریوں، الجھنوں اور پیچیدگیوں میں شدید اضافہ ہو گیا ہے - رہنمائی کے

فریضے کو بہتر طور پر انجام دینے کے لیے زندگی کے ہر شعبے کے متعلق ماہرین کا تعاون انتہائی ضروری ہے۔

۵ - رہنمائی کی حاجت رکھنے والے طلبہ کے کوائف نہایت احتیاط سے جمع کرنا اور پھر دوسروں سے پوشیدہ رکھنا چاہیے۔

۶ - طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد اور مسائل میں اضافے کے باعث تعلیمی رہنمائی کے لیے الگ مشیر مقرر ہوں تو بہتر ہے ورنہ طلبہ کی رہنمائی کی غرض سے ان کی گروہ بندی کرنا ضروری ہے تاکہ استاد اپنے طلبہ کے گروپ کی ذہنی صلاحیتوں، استعداد اور رجحانات و مقاصد زندگی اور اقدار سے بخوبی آگاہ ہو سکے۔

۷ - طلبہ کو اظہار رائے کی مکمل آزادی اور پسند و ناپسند کا پورا پورا اختیار دیں۔ فراہم شدہ کوائف کی روشنی میں اور انفرادی جائزوں اور آزمائشوں کے ذریعے بچوں کی علمی زندگی کے لیے انتخاب مضامین اور معاشی رہنمائی کے فرائض ادا کریں۔

۸ - تعلیمی ترقی، شعوری بلوغت، شخصی ارتقا اور سماجی تعلقات قائم کرنے کے تمام مراحل، عمر اور فطری تقاضوں کے مطابق طے پانے کے لیے بہترین اور بھرپور فضا پیدا کی جائے تاکہ بچے خود اپنی آرزوؤں اور صلاحیتوں کے مطابق اپنی زندگی کے لیے واضح نصب العین متعین کر سکیں اور شعبۂ رہنمائی کی فراہم شدہ معلومات کی روشنی میں اپنے تابناک مستقبل کا خود انتخاب کر سکیں۔

۹ - عمل رہنمائی کے لیے کسی پرسکون مقام پر جہاں کوئی بیرونی مداخلت نہ ہو، بچے کو اپنے مسائل بلا تامل زبانی بیان کرنے کی ترغیب دینی چاہیے۔ جذبات سے مبرا ہو کر ٹھنڈے دل اور آرام و تحمل سے سننا لازم ہے۔ دوران گفتگو ایسے رویے سے پرہیز کرنا چاہیے جس سے حقارت، ناپسندیدگی یا حوصلہ شکنی کا احتمال ہو کیونکہ رہنمائی ملامت نہیں معاونت ہے۔

۱۰ - عمل رہنمائی میں استاد کو نجی یا ذاتی مراسم نہیں پیدا کرنے چاہییں -

رہنمائی کی اقسام

۱ - انفرادی رہنمائی

رہنمائی کا بنیادی مقصد بچے میں خود شناسی اور خود نگری پیدا کرنا ہے - اس کو مختلف ذہنی اور رجحانات کی جانچ کے نفسیاتی ٹیسٹ دے کر اس کی اپنی کمزوریوں ، دلچسپیوں اور ذہنی خوبیوں یا کمزوریوں سے روشناس کروانا ہے تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کی مناسبت سے اپنا تعلیمی اور معاشی پروگرام مرتب کر سکے ۔

ہر بچے کی انفرادی رفتار ترقی کا گوشوارہ بنانا تو بچوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے مشکل ہے تاہم ان بچوں کا خصوصی مطالعہ جو کسی وجہ سے اساتذہ کے لیے مسئلہ بن جائیں ، مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت کیا جانا ضروری ہے -

۱ - ذہانت ، ادراک ، یادداشت ، معاملہ فہمی ، تدبر ، بالغ نظری -

۲ - جسمانی کیفیات ، صحت ، (ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق) -

۳ - تعلیمی ترقی ، نصابی معلومات ، عملی اطلاق ، معیار زندگی -

۴ - جذباتی کیفیت ، خود نمائی ، احساس کمتری ، شرمیلا پن - ہٹ دھرمی ، چڑچڑا اور جھگڑالو - مثبت انداز فکر -

۵ - سماجی تعلقات ، تعاون ، قیادت ، افہام و تفہیم ، اعتبار - خود اعتمادی ، شخصی وقار ، انصاف -

۶ - دیگر کوائف ، خاندانی حالات ، دوست و ہمجولی -

۷ - نصابی مشاغل میں شمولیت -

۸ - تعلیمی اکتساب کا جائزہ -

گوشوارے کی تیاری کے لیے ضروری ہے کہ استاد لگن اور انہاک

سے رہنمائی کے پروگرام کا سرگرم کارکن بن جائے اور بچوں کی حرکات و ممکنات کا مسلسل جائزہ لیتا رہے۔

۲ - گروہی رہنمائی

بچوں کی کثرت تعداد کے پیش نظر انفرادی رہنمائی کے گوشوارے بنانے اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہیں۔ موجودہ حالات میں بچوں کو فرداً فرداً ضروری معلومات بہم پہنچانا، ان کے واضح جوابات دینا، پیشہ ورانہ رہنمائی کی سہولتیں فراہم کرنا اور ہم نصابی مشاغل اور تحریکات کا جاری رکھنا اور ساتھ ساتھ پڑھانا اور امتحانات کے لیے تیار کرنا ایک استاد کے بس کا روگ نہیں۔

اس مسئلے کا حل گروہی رہنمائی کا طریقہ ہے جس میں ایک استاد بہت سے طلبہ کو بیک وقت تربیت دیتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اوسط تعلیمی اور ذہنی استعداد کے بچوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور اس طرح کم وقت میں زیادہ سے زیادہ بچوں کے انفرادی مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر شرمیلے بچوں کو بھی اظہار خیال کا موقع ملتا ہے اور ایک دوسرے کے تجربات کی روشنی میں تبادلۂ خیالات کے ذریعے بچے اپنی مدد آپ کر کے خود اصلاح کر لیتے ہیں۔

گروہی رہنمائی کے ذرائع

۱ - صبح کی اسمبلی

گروہی رہنمائی کے لیے ضروری ہے کہ صبح کی اسمبلی کے پروگرام اس طرح مرتب کیے جائیں کہ طلبہ اجتماعی امور کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات اور شعور حاصل کر سکیں اور حالات حاضرہ اور قومی مقاصد کی روشنی میں اپنے مستقبل کے متعلق غور و فکر کر سکیں۔ اس کے لیے روزانہ حمد و ثنا اور پند و نصائح کے علاوہ کبھی کبھار ایسے پروگراموں کا انتظام کیا جائے جن میں سکول سے باہر کے ماہرین

بھی شرکت کریں - اس سلسلے میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ مقرر گروہی سیاست اور فرقہ وارانہ تعصبات سے ہٹ کر محض اجتماعی معاملات و مفادات پر اظہار خیال کرے -

۲ - مجلس مذاکرہ وغیرہ

مجلس مذاکرہ میں مقررین کسی خاص موضوع کی تائید یا تردید میں دلائل دیتے ہیں - سامعین کو سوالات کی اجازت ہوتی ہے اور اس طرح باہمی گفت و شنید سے بہت سے ملی و قومی مسائل کے متعلق بچے روشناس ہوتے ہیں - بزم ادب ، بزم تمثیل ، بزم ثقافت کے ذریعے بھی بچوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جا سکتا ہے اور ان کے انفرادی اختلافات اور دلچسپیوں کی تسکین کا سامان کیا جا سکتا ہے- اس طرح کی مجالس کے انعقاد سے گروہی روابط اور باہمی تعاون اور رابطے کی تربیت حاصل ہوتی ہے -

۳ - تعلیمی سیر

تعلیمی سیر بھی بچوں کی گروہی رہنمائی کا ایک ذریعہ ہے- بچوں کو کارخانے ، صنعتی ادارے ، عجائب گھر ، تاریخی عمارات ، ہسپتال ، عدالتیں ، ڈاک خانے اور تار گھر وغیرہ دکھانے سے بچوں کی نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ پیشہ ورانہ رہنمائی بھی ہوتی ہے -

۴ - سمعی و بصری معاونات

شنیدہ کے بود مانند دیدہ- آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیز سنی سنائی بات کی نسبت زیادہ پر اثر ہوتی ہے لہٰذا متحرک تصاویر ، فلم اسٹرپ ، تصویری خبرنامے ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے تعلیمی پروگرام بھی گروہی رہنمائی کے لیے مفید ہو سکتے ہیں- کتابیں، رسالے اور اخبارات بھی گروہی رہنمائی کا بہترین ذریعہ ہیں -

۵ - یوم والدین

بچے کی صحیح نشو و نما اور فلاح و بہبود کے لیے استاد اور والدین کا تعاون اشد ضروری ہے - اچھی درس گاہوں میں سال میں کم از کم

سے رہنمائی کے پروگرام کا سرگرم کارکن بن جائے اور بچوں کی حرکات و سکنات کا مسلسل جائزہ لیتا رہے ۔

۲ ۔ گروہی رہنمائی

بچوں کی کثرت تعداد کے پیش نظر انفرادی رہنمائی کے گوشوارے بنانے اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہیں ۔ موجودہ حالات میں بچوں کو فرداً فرداً ضروری معلومات بہم پہنچانا، ان کے واضح جوابات دینا ، پیشہ ورانہ رہنمائی کی سہولتیں فراہم کرنا اور ہم نصابی مشاغل اور تحریکات کا جاری رکھنا اور ساتھ ساتھ پڑھانا اور امتحانات کے لیے تیار کرنا ایک استاد کے بس کا روگ نہیں ۔

اس مسئلے کا حل گروہی رہنمائی کا طریقہ ہے جس میں ایک استاد بہت سے طلبہ کو بیک وقت تربیت دیتا ہے ۔ اس مقصد کے لیے اوسط تعلیمی اور ذہنی استعداد کے بچوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور اس طرح کم وقت میں زیادہ سے زیادہ بچوں کے انفرادی مسائل حل ہو جاتے ہیں ۔

دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر شرمیلے بچوں کو بھی اظہار خیال کا موقع ملتا ہے اور ایک دوسرے کے تجربات کی روشنی میں تبادلۂ خیالات کے ذریعے بچے اپنی مدد آپ کر کے خود اصلاح کر لیتے ہیں ۔

گروہی رہنمائی کے ذرائع

۱ ۔ صبح کی اسمبلی

گروہی رہنمائی کے لیے ضروری ہے کہ صبح کی اسمبلی کے پروگرام اس طرح مرتب کیے جائیں کہ طلبہ اجتماعی امور کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات اور شعور حاصل کر سکیں اور حالات حاضرہ اور قومی مقاصد کی روشنی میں اپنے مستقبل کے متعلق غور و فکر کر سکیں ۔ اس کے لیے روزانہ حمد و ثنا اور پند و نصائح کے علاوہ کبھی کبھار ایسے پروگراموں کا انتظام کیا جائے جن میں سکول سے باہر کے ماہرین

بھی شرکت کریں - اس سلسلے میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ مقرر گروہی سیاست اور فرقہ وارانہ تعصبات سے ہٹ کر محض اجتماعی معاملات و مفادات پر اظہار خیال کرے -

۲ - مجلس مذاکرہ وغیرہ

مجلس مذاکرہ میں مقررین کسی خاص موضوع کی تائید یا تردید میں دلائل دیتے ہیں - سامعین کو سوالات کی اجازت ہوتی ہے اور اس طرح باہمی گفت و شنید سے بہت سے ملی و قومی مسائل کے متعلق بچے روشناس ہوتے ہیں - بزم ادب ، بزم تمثیل ، بزم ثقافت کے ذریعے بھی بچوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جا سکتا ہے اور ان کے انفرادی اختلافات اور دلچسپیوں کی تسکین کا سامان کیا جا سکتا ہے- اس طرح کی مجالس کے انعقاد سے گروہی روابط اور باہمی تعاون اور رابطے کی تربیت حاصل ہوتی ہے -

۳ - تعلیمی سیر

تعلیمی سیر بھی بچوں کی گروہی رہنمائی کا ایک ذریعہ ہے- بچوں کو کارخانے ، صنعتی ادارے ، عجائب گھر ، تاریخی عمارات ، ہسپتال ، عدالتیں ، ڈاک خانے اور تار گھر وغیرہ دکھانے سے بچوں کی نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ پیشہ ورانہ رہنمائی بھی ہوتی ہے -

۴ - سمعی و بصری معاولات

شنیدہ کے بود مانند دیدہ - آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیز سنی سنائی بات کی نسبت زیادہ پر اثر ہوتی ہے لہٰذا متحرک تصاویر ، فلم اسٹرپ ، تصویری خبرنامے ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے تعلیمی پروگرام بھی گروہی رہنمائی کے لیے مفید ہو سکتے ہیں- کتابیں، رسالے اور اخبارات بھی گروہی رہنمائی کا بہترین ذریعہ ہیں -

۵ - یوم والدین

بچے کی صحیح نشو و نما اور فلاح و بہبود کے لیے استاد اور والدین کا تعاون اشد ضروری ہے - اچھی درس گاہوں میں سال میں کم از کم

ایک مرتبہ والدین کو مدعو کیا جاتا ہے تاکہ وہ متعلقہ اساتذہ سے مل کر اپنے بچوں کی تعلیمی ترقی کے متعلق آگاہ ہو سکیں۔ نیز والدین کے سامنے بچوں کی جسمانی، تعلیمی اور سماجی تربیت کے مظاہرے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور بچے کی نشو و نما میں والدین کا تعاون حاصل کیا جاتا ہے۔

رہنمائی کے طریقے

ہم نے پچھلے صفحات میں تفصیل سے پڑھا ہے کہ رہنمائی دو طرح سے ہو سکتی ہے یعنی انفرادی اورگروہی طور پر۔ انفرادی طریقۂ رہنمائی کو ایک مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جمیل ایک لاپروا اور غیر ذمہ دار طالب علم ہے اور کسی کے کہنے یا مشورے پر کان نہیں دھرتا۔ اکڑتا ہے اور شیخی بھگارتا ہے۔ اس کے گھر والے، ہم جماعت اور استاد یک زبان ہو کر اس کے اس غیر موزوں رویے کی شکایت کرتے ہیں۔ ایسا بچہ ماہر رہنمائی کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انفرادی رہنمائی کس طریقے سے کی جائے۔ اس سائنسی دور میں جس طرح ایک مریض کو علاج کے لیے کسی نیم حکیم کے سپرد نہیں کیا جا سکتا بلکہ جدید تحقیق کی روشنی میں ہر مرض کے خصوصی ماہر کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اسی طرح بچے کی صحیح تعلیم و تربیت اور اس کی شخصیت کی نشوونما کے لیے ماہر اساتذہ کی ضرورت ہے۔ جدید تحقیقات کے نتیجے میں رہنمائی ایک مخصوص شعبۂ علم کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اس کے تشخیص اور علاج کے اپنے مخصوص طریقے ہیں جن میں سے چند طریقوں کا ذکر ذیل میں کیا گیا ہے۔

کوائف کی فراہمی

جس طرح سر درد یا کسی مرض کے لیے پہلے چھوٹا موٹا معروف علاج کیا جاتا ہے۔ اگر آرام نہ آئے تو کسی ماہر ڈاکٹر سے رجوع کیا جاتا ہے جو مرض کی تفصیلات معلوم کر کے اس کے اسباب کی کھوج لگاتا اور طبی آلات اور ٹیسٹ کے ذریعے صحیح تشخیص کرتا ہے، بالکل اسی طرح ماہر رہنمائی جب طالب علم کے کردار میں ایک

مستقل نقص، کمزوری یا عدم مطابقت دیکھتا ہے تو ڈاکٹر ہی کی مانند اس طالب علم کی مشکل کا حل تلاش کرنے کے لیے اس کے ذاتی، خاندانی، سماجی اور تعلیمی کوائف کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور ان معلومات کی روشنی میں بچے کی مشکلات کا نہ صرف صحیح حل تلاش کرتا ہے بلکہ اس کی تعلیمی ترقی کی رفتار کو نارمل بچوں کے برابر رکھنے کے لیے مفید پالیسی مرتب کرتا ہے۔ لیکن یاد رہے یہ اسی صورت ہو سکتا ہے جب کہ ماہر رہنمائی بچے کی شخصیت، فطرت، ذہنی، ثقافتی اور جذباتی رجحانات اور ماحول کے متعلق پوری طرح سے آگاہ ہو۔ رہنمائی کے خواست گار طالب علم کے متعلق مندرجہ ذیل کوائف حاصل کیے جائیں گے۔

۱ - معلومات عامہ

اس میں درج ذیل معلومات شامل ہوں گی۔ بچے کا نام، ولدیت، جائے پیدائش، گھر کا محل وقوع، سکول سے فاصلہ اور تاریخ پیدائش، خاندان کے افراد کی تعداد، اخلاق، مالی اور تعلیمی حالت، سماجی اور ثقافتی رویے، والد کا یا والد کی وفات کی صورت میں والدہ کا ذریعۂ معاش۔

۲ - صحت کا ریکارڈ

صحت مند ذہن کے لیے صحت مند جسم شرط اول ہے چنانچہ سکول میں صرف داخلے کے وقت ہی نہیں بلکہ ہر ششماہی کے بعد یا کم از کم سال کے بعد بچوں کا طبی معائنہ کرا دیا جائے۔ اس کا ریکارڈ محفوظ رکھا جائے جس میں طلبہ کی بصارت، سماعت، قوت گویائی اور جسم کے دیگر اندرونی و بیرونی اعضا کی صحت کا تفصیلی جائزہ ہونا لازم ہے۔ اس میں بچے کے موروثی امراض اور بچپن میں اتفاقی یا وبائی امراض کا ذکر ہونا اشد ضروری ہے تاکہ والدین اور سکول کا ڈاکٹر بروقت علاج کر کے بچے کو آیندہ لاحق ہونے والے امراض کے خطرات سے بچا سکے کیونکہ علاج سے انسداد بہتر ہے۔

۳ - ذہنی استعداد

موجودہ سائنسی دور میں علم طب نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ X-ray اور Screening کے ذریعے اندرونی اعضائے رئیسہ کا تفصیلی جائزہ

لیا جا سکتا ہے - جس طرح جسم میں داخل ہونے والے جراثیم کو ظاہری آنکھ نہیں دیکھ سکتی البتہ خوردبین سے دیکھے جا سکتے ہیں ، اسی طرح بچے کی ذہنی کیفیت اور صلاحیتوں کو دیکھا نہیں جا سکتا البتہ ماہرین نفسیات نے ذہنی استعداد اور رجحانات کو جانچنے کے لیے ذہنی آزمائش اور ٹیسٹ کے طریقے رائج کیے ہیں جن سے بچوں کی ذہنی صلاحیت کا معیار معلوم کیا جا سکتا ہے اور پھر اس ذہنی آزمائش کی روشنی میں بچے سے اس کی صلاحیتوں اور رجحانات کے مطابق توقعات وابستہ کی جاتی ہیں - جس طرح ایک اندھے سے سلائی اور لنگڑے سے 220 میٹر کی دوڑ کی توقع نہیں کی جا سکتی، اسی طرح پیدائش سے ہی ذہنی طور پر کمزور انسان سے ریسرچ اور ایجاد کی توقع نہیں ہو سکتی۔ اکثر والدین اپنے بچوں اور استاد اپنے شاگردوں سے تعلیمی ترقی کی بڑی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور اگر وہ ان کی توقعات پر پورے نہ آتریں تو انھیں مورد الزام ٹھہراتے ہیں - حالانکہ ہو سکتا ہے کہ طالب علم نے اپنی پوری ذہنی صلاحیت کے مطابق کوشش کی ہو - ایسی صورت میں نہ صرف والدین اور استاد محرومی کا شکار ہوتے ہیں بلکہ طالب علم کی شخصیت دب سی جاتی ہے - استاد اور والدین کو بچے سے اس کی ذہنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق ہی جائز حد تک توقعات وابستہ کرنی چاہییں -

۴ - اکتساب

بچے کی مشکل کا حل اس وقت تک ماہر رہنمائی نہیں کر سکتا جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ بچے نے کون کون سا تعلیمی ، علمی ، لسانی یا جسمانی تربیت کا عمل سیکھا ہے - کیونکہ بچے کے آیندہ تعلیمی پروگرام کا تعین اور منصوبہ اس سابقہ واقفیت پر ہو سکتا ہے چنانچہ بعض شعبوں میں ناکامی اور اسناد انعامات ، اعزازی سرٹیفکیٹ اور امتحان کے نتائج کا ریکارڈ بھی ماہر رہنمائی کے لیے ضروری ہے -

۵ - طبیعی میلانات

ماہرین نفسیات نے جس طرح ذہنی آزمائش کے کلیے اور پیمانے

بناتے ہیں اسی طرح طالب علم کی فنی ، میکانکی ، سائنسی ، تحقیقی صلاحیت ، فطری رجحانات اور طبیعی میلانات کا جائزہ لینے کے لیے معیاری آزمائشوں کے طریقے رائج کیے ہیں ان کے ذریعے بچوں کو ان کے فطری اور طبیعی رجحانات اور میلانات کے مطابق کام تفویض کیا جاتا ہے اور مضامین کا انتخاب ان کی دلچسپیوں اور فطری صلاحیتوں کی مناسبت سے کیا جاتا ہے اور اس طرح انہیں ناکامی ، نامرادی اور محرومی سے بچایا جاتا ہے ۔

۶ ۔ ہم آہنگی

عام طور پر ہم اپنا چلنا پھرنا اوڑھنا بچھونا ، رہن سہن ، بول چال جیسے تہذیب وتمدن کے تمام کام اپنے معاشرے اور سماج کی پسندکو مدنظر رکھ کر کرتے ہیں اسی کا نام ہم آہنگی ہے ۔ جو فرد معاشرے کی مسلم اقدار کو ٹھکراتا ہے وہ معاشرے میں نکو بنتا ہے اور معاشرہ اسے ٹھکرا دیتا ہے ۔ ہم آہنگی سے مراد ہے کہ طالب علم کہاں تک معاشرے یعنی والدین ، دیگر اہل خانہ ، اساتذہ اور ہم جماعت ، گلی اور محلے والوں کے جذبات اور احساسات اور سماجی اقدار کا پاس کرتا اور ان سے مطابقت پیدا کرتا ہے ۔ اجتماعی تحریکات ، خدمت خلق، ہمدردی اور فرصت کے لمحات کو کس طور پر استعمال کرتا ہے ۔ زود رنج ، حاسد ، متعصب اور خود غرض تو نہیں ۔ کیا ہمیشہ من مانی کرتا ہے یا دوسرں کی بات کا بھی احترام کرتا ہے ۔ اگر عدم مطابقت کا شکار ہے تو لازماً اپنے حلقۂ احباب میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ اگر ہم آہنگ ہے تو ہر دلعزیز ہوگا ۔

۷ ۔ دلچسپی

آمادگی یا پسند اور دلچسپی پر کسی کام کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہوتا ہے ۔ کہتے ہیں گھوڑے کو پانی کے کنارے لے جا تو سکتے ہیں لیکن پانی پینے پر مجبور نہیں کر سکتے ۔ اسی طرح ایک طالب علم کو اس کی استعداد اور ذہانت کے خلاف مضامین لینے پر مجبور تو کیا جا سکتا ہے مگر اسے اس کے رجحان اور دلچسپی کے خلاف مضامین

میں مہارت حاصل کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ۔ عام طور پر والدین اپنے بچے کو ڈاکٹر ، انجینئر یا سائنس دان بنانا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں اُن کے رجحانات اور دلچسپیوں کا لحاظ نہیں رکھتے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے بچے مضامین کے غلط انتخاب کی وجہ سے ناکام ہو جاتے ہیں ۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر ہر طالب علم کو اس کے والدین کی خواہش کے مطابق ڈاکٹر ، انجنیر اور سائنس دان بنانے کی کوشش کی جائے تو دنیا کے باقی شعبوں کا کیا ہو۔ لہٰذا قدرت نے ایسا بندوبست کیا ہے کہ ہر کسے را کارے ساختند ۔ انہیں افراد میں سے کسی کو لوہار بننا ہوتا ہے اور کسی کو معمار ، کوئی درزی بنتا ہے اور کوئی حجام ، کوئی کامیاب مصور بنتا ہے اور کوئی شاعر ۔ صلاحیت اور فطری رجحان کے مطابق دلچسپی بھی ہوتی ہے لہٰذا اگر بچوں کے لیے ان کی دلچسپی کے مطابق ماہر رہنمائی کے مشورے سے مضامین اور پیشے کا انتخاب کیا جائے تو طالب علم ، اساتذہ اور والدین کی بہت سی دشواریوں کا ازالہ ہو جائے اور بچے کامیابی سے ہمکنار ہوں ۔

۸ ۔ مستقبل کے منصوبے

ماہر رہنمائی کا فرض اولین ہے کہ وہ طالب علم سے تبادلہ خیالات کر کے معلوم کرے کہ وہ کیا بننا چاہتا ہے مصور یا موسیقار ، معلم یا ڈاکٹر ۔ پھر کوائف کے ریکارڈ کی روشنی میں طالب علم کو اس کی صلاحیتوں ، رجحانات اور ذہنی استعداد اور مارکیٹ میں اس کی مانگ اور کھپت کے متعلق تمام مکمل تفصیلات بہم پہنچائے تاکہ بچہ خود بغیر کسی اثر (Pressure) کے اپنی استعداد کے مطابق اپنی توقعات اور منزل کا تعین کرے اور اسے ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے اور ساتھ ہی اپنی فطری صلاحیتوں کا صحیح استعمال کر کے ذہنی اور قلبی سکون حاصل کرے ۔

۹ ۔ بالمشافہ گفتگو

بالمشافہ گفتگو سے اعتماد اور محبت کی فضا میں رہنما ، طالب علم کی بہت سی مشکلات حل کر سکتا ہے ۔ دو افراد یا دو گروہ دوستی اور

اعتماد کی فضا میں بیٹھ کر جب کسی پیچیدہ مسئلے پر غور کرتے ہیں تو اس کا حل تلاش کر لیا جاتا ہے۔ سوالات کے ذریعے، جوابات کی روشنی میں (بشرطیکہ وہ صحیح ہوں) بچے کی عادات و اطوار اور اس کے طرز تکلم سے ہم بآسانی بلا واسطہ معلومات کا ذخیرہ اکٹھا کر سکتے ہیں، جس کی روشنی میں بہت سے مسائل فوری طور پر حل ہو سکتے ہیں۔

رہنمائی اور استاد

فی زمانہ سائنسی ترقی نے جہاں انسان کے لیے آرام و آسائش کے سامان فراہم کیے ہیں وہاں انفرادی اور اجتماعی مسائل میں بھی لا محدود اضافہ کر دیا ہے۔ پہلے وقتوں میں استاد کا کام فقط بچوں کو پڑھانا تھا لیکن آج کل بچوں کے وسائل کم اور مسائل زیادہ ہیں اس لیے ملک اور قوم کے لیے صحت مند معاشرہ اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ استاد نہ صرف پڑھائیں بلکہ والدین کی طرح بچوں کے اجتماعی مسائل کا حل تلاش کرنے میں بچوں کے ممد و معاون بھی بنیں۔

۱۔ رہنمائی ایک ایسا عمل ہے جس میں دو افراد کی شرکت ضروری ہے یعنی استاد اور مشکلات سے دو چار طالب علم۔

۲۔ رہنمائی میں استاد کے پیش نظر بنیادی مقصد طالب علم کے مسئلے کو حل کرنا ہوتا ہے اور مسئلے کی نوعیت اور اس کے اسباب و عامل کی صحیح تشخیص کے لیے آزادانہ اور مشفقانہ گفتگو بہترین طریقہ ہے۔

۳۔ استاد، رہنمائی اور تربیت میں بہتر مہارت رکھنے کی بنا پر طالب علم کو اس قابل بنا سکتا ہے کہ وہ اپنے عیوب و محاسن سمجھتے ہوئے اپنی ذاتی الجھنوں اور مستقبل کے منصوبوں کا از خود تجزیہ کر کے ضروری توضیح اور تصریح کر سکے اور ماحول کے مطابق نئے اطوار، نئے احساسات اور نئے جذبات سے ہم آہنگ ہو۔

۴ - استاد رہنمائی اور شاگرد کے مابین ایسے خوشگوار ، پرخلوص اور پراعتماد تعلقات ہونے چاہییں کہ طالب علم خود مشاورت کی تمنا لے کر استاد کے پاس آئے اور آزاد فضا میں گفت و شنید کر سکے -

۵ - طالب علم اگر اپنے خفیہ جذبات اور احساسات کا ذکر کرے تو استاد رہنمائی قطعاً افسوس یا نفرت کا اظہار نہ کرے بلکہ طالب علم کی حوصلہ افزائی کرے تاکہ اس کے اندر خود شناسی اور خود اعتمادی پیدا ہو اور وہ اپنے مسائل کا خود حل تلاش کر سکنے کے قابل ہو جائے اور اپنے مقاصد زندگی کا رہنمائی کی روشنی میں خود تعین کرے اور اس طرح اس کی جبلی تسکین ہو -

۶ - استاد رہنمائی ، طالب علم پر اپنے فیصلے ٹھونسنے کے بجائے اس میں خود فیصلہ کرنے کی اہلیت پیدا کرے -

۷ - طالب علم کے رجحانات ، جذبات اور ذہنی استعداد کے متعلق کوائف و شواہد جمع کرتا رہے -

۸ - طالب علم کی تعلیمی اور تربیتی ضرورتوں پر کڑی نظر رکھے -

۹ - طالب علم ، رہنما استاد اور طالب علم کے والدین کے درمیان اکثر تبادلۂ خیالات ہوتا رہنا چاہیے -

رہنما استاد کے اوصاف

۱ - رہنمائی ایک فن ہے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے مسلسل تحقیق اور نفسیات کا مطالعہ ضروری ہے - محض مطالعہ ہی کافی نہیں بلکہ صلاح ومشورے کا کچھ عملی تجربہ بھی ہونا ضروری ہے - اس کے لیے بچے کی نشو و نما کے ارتقائی مدارج اور بنیادی نفسیاتی ضروریات اور مدارج تعلیم کا وسیع تدریسی تجربہ رکھنا بھی ضروری ہے -

۲ - رہنما کے اوصاف میں سب سے اہم وصف سماجی احساس ، ہمدردی ،

شہری شعور ، نسل انسانی کا احترام ، بلا امتیاز مذہب و ملت و مکتبہ فکر ، عوام الناس سے خوشگوار مراسم ہیں ۔

٣ - اس میں اعتماد ، قوت فیصلہ اور دوسروں کے خیالات کو متاثر کرنے کی قائدانہ صلاحیت ہونی چاہیے ۔

٤ - اختلاف رائے کا احترام اور اگر صحیح رائے ہو تو اسے تسلیم کرنا قوت برداشت، باہمی دوستی ، گرم جوشی اور زندہ دلی کی صفات بھی ایک رہنما استاد میں ہونا ضروری ہیں ۔

٥ - وہ ایک مقبول شخصیت ہو اور غیر سماجی حرکات سے احتراز کرے ۔

٦ - پیشہ ورانہ ضابطۂ اخلاق کا احترام کرے ، یعنی زیر علاج بچے کی جذباتی اور سماجی مشکلات کی رازداری کرے اور رہنمائی کے مقاصد کے حصول کے لیے دلی شوق ، دلچسپی ، لگن اور صبر و استقلال سے کام لے ۔

٧ - اس میں عزت نفس ، خود اعتمادی ، خود یقینی اور مسائل کو سمجھنے کی اہلیت ہو ۔

٨ - طلبا کے کردار کا خارجی مشاہدے سے تعلیمی ، جذباتی اور سماجی حالات کا صحیح تجزیہ کر سکے ۔

٩ - رہنما استاد میں یہ صفت ہونی چاہیے کہ وہ طلبہ کے گھریلو ماحول اور سماجی اقدار کو سمجھ سکے ، ان کا احترام کرے اور سکول کے پروگرام اور تدریسی نصاب کی ان سے ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کرے ۔

١٠ - غیر موزوں اور نامناسب ماحول کی جگہ خوش گوار ماحول پیدا کرے ۔

١١ - بچوں کے والدین سے خوش گوار مراسم قائم کرنا اور اپنی پروقار اور پر عزم شخصیت سے ان کا اعتماد حاصل کر کے ان کی

مشاورت سے بچوں کے مسائل کا حل تلاش کرنا رہنمائی کی شرط اول ہے۔

رہنمائی اور والدین

والدین سے اولاد کو نہ صرف شکل و شباہت وراثت میں ملتی ہے بلکہ عادات و خصائل، اخلاق و اقدار، رسومات، نیکی اور بدی کا تصور، مذہب و ثقافت، لباس، خوراک اور رہن سہن کے طریقے، طرز تکلم و طرز فکر غرضیکہ اکثر و بیشتر عادات و خصائل اسے یا تو وراثت میں ملے ہوتے ہیں یا اپنے گھر اور ارد گرد کے ماحول سے سیکھتا ہے۔ ماہرین نفسیات کی تحقیقات کی بنا پر بچے کی زندگی کے پہلے پانچ سال اس کی شخصیت، رویے اور رجحانات کی تعمیر کے لحاظ سے اہم ترین شمار کیے جاتے ہیں لہٰذا اس ابتدائی دور میں والدین کی دی گئی تربیت کا اثر نہ صرف دور رس بلکہ دیرپا اور سب سے زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔

عام طور پر والدین میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ بچے کو سکول میں داخل کر دینے کے بعد اپنے تئیں بری الذمہ خیال کرتے ہیں اور بچے کی ہر نیک عادت کے لیے خود کو اور بد عادت کے لیے اساتذہ کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ والدین کا ہر قول و فعل بچے کے لیے حرف آخر ہوتا ہے اور وہ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، ہر وقت ماں باپ سے دانستہ یا نادانستہ متاثر ہوتے ہیں اور ان کے نیک یا بد نمونے پر عمل کرنا عین سعادت اور فرمانبرداری تصور کرتے ہیں اور انہی کے نقش قدم پر عمل کرنے کو اپنے لیے فلاح دارین تصور کرتے ہیں۔

بعض والدین اپنے بچوں کی تعلیم، خوراک اور رہائش کے لیے مال و زر اکٹھا کرنے کو ہی اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن یاد رہے بچوں کی تعلیم و تربیت میں والدین کے کردار اور اخلاق کی ذاتی مثال سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ پیدائش سے لے کر قبر تک جاری رہتا ہے لہٰذا والدین کا فرض رہنمائی بچے کو

سکول میں داخل کرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے جب کے والدین کو مندرجہ ذیل باتیں یاد رکھنی ضروری ہیں ۔

۱ ۔ بچے کی صحیح تربیت کی خاطر اساتذہ سے گہرا اور قریبی رابطہ قائم رکھنا ضروری ہے ۔

۲ ۔ باوجود مالی مشکلات کے بچے کی صحت ، تعلیم اور آسائش کی خاطر تمام جائز اخراجات خندہ پیشانی سے برداشت کرنے چاہییں ۔

۳ ۔ اہم نصابی سرگرمیوں میں بچوں کی شمولیت کی حوصلہ افزائی کرنا ضروری ہے ۔

۴ ۔ یوم والدین ، سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات یا سکول کی دیگر تقاریب میں شامل ہو کر اپنے بچوں کی تعلیمی ترقی کے متعلق اساتذہ سے ملاقات کرنا بہت ضروری ہے ۔

۵ ۔ بچوں کے غیر موزوں رویے ، اخلاقی کج روی اور تعلیم سے عدم دلچسپی کے متعلق استاد کے توجہ دلانے پر بچے کو بے جا ڈرانا دھمکانا اور سختی کرنا اور استاد کو مورد الزام ٹھہرانا نامناسب ہے بلکہ ان خامیوں کو مرض کی علامت سمجھتے ہوئے ماہر نفسیات اور استاد رہنمائی سے مکمل تعاون کر کے انھیں تشخیص اور علاج میں مدد کرنی چاہیے ۔

۶ ۔ اگر استاد بچے کو غلطی پر سزا دے یا سرزنش کرے تو اکثر والدین اسے بچے کا دشمن تصور کرتے ہوئے جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں ، بچے کو بے قصور اور استاد کو قصور وار ٹھہراتے ہیں ۔ والدین کو چاہیے کہ معاملے کی اصلیت کو سمجھتے ہوئے بچے کو یہ احساس دلائیں کہ اس کی غلطی ہے اور استاد اس کا ہمدرد ہے اور یہ کارروائی اسی کی بھلائی کے لیے کی گئی ہے ۔

۷ ۔ شعبۂ رہنمائی کی جانب سے بچے میں کسی خامی کی نشاندہی پر والدین کو تحمل سے کام لینا چاہیے اور ان کی رہنمائی میں بچوں

کے فائدے کے لیے جو مشورے اور تجاویز ہوں ان پر عمل کرنا چاہیے اور بہتر مستقبل کی خاطر بچے کے رجحانات کے مطابق ماحول میں تبدیلی کرنی لازم ہے۔

عمل رہنمائی ایک مثلث ہے جس کے تین کونے اُستاد، والدین اور طالب علم ہیں، جن کے باہمی تعاون سے تعلیم و تربیت میں پیش آنے والے مسائل آسانی سے حل ہو سکتے ہیں۔ بچے کو اپنے مسائل کا خود احساس کرنے کے بعد، اُستاد رہنمائی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اُستاد کی تشخیص اور تجویز کردہ پروگرام پر پرعزم اور پراعتماد طریقے سے عمل کر کے بچے کو اپنے عیوب اور محاسن کو پوری طرح سمجھ لینا چاہیے اور ان کی روشنی میں اپنے مستقبل کا انتخاب کرنا چاہیے۔ والدین، اُستاد اور شاگرد کے درمیان ایک ایسا رابطہ قائم ہو کہ تعاون برقرار رہے اور اس شرکت باہمی سے مسائل خوش اسلوبی کے ساتھ حل کیے جا سکیں۔ یہی رہنمائی ہے۔

سوالات

[illegible] ں سال سے 14 سال تک کے بچوں کی بنیادی فطری ضروریات [illegible] ا ہیں۔ ان کی تشنگی سے ان کی شخصیت کس طرح متاثر ہوتی [illegible] مثالیں دے کر واضح کیجیے

۲ - [illegible] نی کے بنیادی اُصول بیان کیجیے

۳ - انفرادی اور گروہی رہنمائی میں کیا فرق ہے مثالیں دے کر وضاحت کیجیے؟

۴ - مندرجہ ذیل رہنمائی کے طریقوں پر مختصر نوٹ لکھیے۔

(i) کوائف کی فراہمی اور صحت کا ریکارڈ

(ii) مستقبل کے منصوبے

(iii) ذہن اور رجحانات کی آزمائش

(iv) رہنمائی اور اُستاد کے فرائض اور اوصاف۔

(v) والدین کا رہنمائی میں تعاون اور اس کے اثرات۔

دسواں باب

جمہوری معاشرے میں معلّم کے فرائض اور ذمے داریاں

تنظیم مدرسہ میں معلّم کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ مدرسے کی مختلف سرگرمیوں اور مشاغل کو عملی جامہ پہنانے کا بیشتر کام اس کے سپرد ہوتا ہے لہٰذا اس کے فرائض اور ذمے درایوں کی وضاحت نظام تعلیم کی کامیابی کے لیے لازمی ہے۔ اس سلسلے میں معاشرے کی نوعیت کا پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ ہر معاشرے میں تعلیم کے مقاصد مختلف ہوتے ہیں جو مدرسے اور معلم سے مختلف کردار کا تقاضا کرتے ہیں۔

جمہوری معاشرے میں مدرسے کا کردار

جمہوری معاشرہ افراد معاشرہ کی مساوات کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے۔ اس میں تمام انسان کسی اقتصادی، علاقائی یا نسلی امتیاز کے بغیر یکساں مرتبہ و مقام اور حقوق کے مالک ہوتے ہیں اور سب کے لیے ترقی کے یکساں مواقع کی ضمانت ہوتی ہے۔ کسی قسم کی مصنوعی حد بندیاں ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتیں۔ سیاسی اعتبار سے جمہوری معاشرہ عوام کے مشورے سے حکومت کے قیام کا علمبردار ہوتا ہے۔ یہ مشورہ بلا واسطہ بھی ہو سکتا ہے اور عوام کے منتخب نمایندوں کے ذریعے بالواسطہ بھی۔ جمہوری سیاسی نظام میں فیصلوں کا انحصار کثرت رائے پر ہوتا ہے۔ مغربی جمہوری نظام میں تو اس سلسلے میں اس حد تک مبالغہ کیا گیا ہے کہ کثرت رائے سے جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ پاکستان بھی جمہوریت کا داعی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی پاکستان کا اساسی نظریہ اسلامی نظام کا تقاضا کرتا ہے۔ اسلامی نظام حکومت بھی جمہوریت

کی طرح مشاورتی اصولوں پر قائم ہوتا ہے، لیکن اس میں عوام کو تمام اختیارات کا سرچشمہ قرار نہیں دیا جاتا بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے اختیارات کا اصل سرچشمہ اور حاکمیت اعلیٰ کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی جمہوری نظام میں عوام اللہ تعالیٰ کی مقررکردہ حدود کے اندر باہمی مشورے سے امور مملکت کو انجام دیتے ہیں - گویا اسلامی جمہوری معاشرے میں فرد یا معاشرہ یا حکومت کسی کو بھی غیر محدود آزادی حاصل نہیں ہوتی - البتہ شریعت کی عائد کردہ حدود کے اندر ہر فرد کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس پر ذمے داریاں بھی عائد ہو جاتی ہیں -

جمہوری معاشرے میں مدرسے کے کردار کے سلسلے میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ وہ اس معاشرے کے لیے تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والے ایسے افراد تیار کرے جو اس معاشرے کے قیام اور تسلسل کا باعث بن سکیں، جو جمہوری اخلاق سے پوری طرح مزین ہوں اور جمہوری اقدار کے فروغ کے لیے مؤثر کردار ادا کر سکیں، جو آزادی فکر سے مالا مال ہوں اور جرأت اظہار کے ساتھ ساتھ دوسروں کی رائے سننے، سمجھنے اور قبول کرنے کی آمادگی بھی رکھتے ہوں - اسلامی جمہوری معاشرے میں مدرسے کی ذمے داری عام جمہوری معاشروں سے کسی قدر بڑھ جاتی ہے - اس میں مدرسے کا بنیادی کردار یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے ابدی اصولوں اور اقدار کو افراد میں منتقل کرے اور انھیں اسلام کا پر جوش مبلغ اور جانباز مجاہد بنائے - تمام جمہوری معاشروں کی طرح اسلامی جمہوری معاشرے میں بھی مدرسہ ذمے دار ہے کہ افراد میں کسب معاش کی صلاحیت پیدا کرے اور انھیں معاشرے کی بہبود و خوشحالی میں شرکت کی تربیت دے -

تعلیم کے مفہوم کے ضمن میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ مدرسہ معاشرے میں ایسا ہے جیسے انسانی جسم میں دماغ ہوتا ہے - گویا معاشرے کو قائم رکھنے، اس کی ضروریات کا اہتمام کرنے اور اسے

صحیح سمت میں چلانے کا کام مدرسے کے سپرد ہے۔ مختصر طور سے کہا جا سکتا ہے کہ مدرسہ رسمی تعلیم کا ادارہ ہے اور اس کے سپرد یہ کام ہے کہ معاشرے کے ذخیرۂ علم کی حفاظت کرے، جہاں تک ہو سکے اس میں توسیع کرے اور اسے نئی نسل کو منتقل کرے۔ گویا مدرسہ مقاصد تعلیم کے حصول کا رسمی ادارہ ہے اور جمہوری معاشرہ جس کے وجود اور ترقی کا انحصار ہی افراد معاشرہ کی تعلیم و تربیت پر ہوتا ہے اس ادارے کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

جمہوری معاشرے میں فرد کی ذمے داریاں :

مدرسہ معاشرے کے لیے افراد تیار کرتا ہے۔ جس قسم کا معاشرہ ہوگا اسی قسم کے افراد تیار کرنا مدرسے کی ذمے داری ہو گی۔ مدرسے کے کردار اور معلم کے فرائض کا براہ راست تعلق اس امر سے ہے کہ کسی معاشرے میں فرد کی ذمے داریاں کیا ہیں۔ چنانچہ جمہوری معاشرے میں فرد کی ذمے داریوں کا مختصر خاکہ ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔

۱۔ گروہی زندگی کے مسائل کا فہم :

جمہوری معاشرے میں ایک شہری کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ گروہی زندگی کے مسائل میں دلچسپی لے، ان پر غور و فکر کرے اور ان کے متعلق مناسب فیصلے کی اہلیت حاصل کرے۔ اس کے لیے محض حکومت اور جمہوریت کے متعلق اصولی علم ہی کافی نہیں بلکہ عملاً اس قسم کے امور میں شرکت ضروری ہے جن میں جمہوری طرز عمل کی ضرورت پڑے اور فرد کو ضروری مہارتوں کے عملی استعمال کا موقع ملے۔ ان مہارتوں میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ فرد اپنے رفقا کے ساتھ مل کر سوچنے کی اہلیت حاصل کرے۔ اس میں آزادانہ طور سے رائے قائم کرنا، بر ملا اس کا اظہار کرنا اور دوسروں کی رائے سننا اور اس کا احترام کرنا شامل ہیں۔ اس کے بعد یہ بھی

ضروری ہے کہ فرد دوسروں کے ساتھ مل کر کام کر سکے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مشترکہ مسائل کے حل کے لیے دوسروں کے ساتھ تعاون کر سکے اور ان کا تعاون حاصل کر سکے ۔ مزید برآں مسائل کے حل کے لیے بہتر طریقے استعمال کرنا بھی ایک جمہوری تقاضا ہے ۔ جمہوری معاشرے میں کسی فرد کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ مسائل حل کرنا کسی اور کا کام ہے بلکہ جمہوریت چونکہ عوام کی حکومت ہے اور عوام ہی کے لیے ہوتی ہے لہٰذا معاشرے کے مسائل کا حل سوچنا سب کا کام ہے اور سب کو اس کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرنی چاہییں ۔

۲ ۔ دوسروں سے ارتباط :

یہ اوپر بیان کردہ پہلے نکتے کا منطقی نتیجہ ہے ۔ اس میں اپنی رائے کا اظہار بھی شامل ہے اور دوسروں کی آرا کو سننا بھی ۔ لیکن اس سلسلے میں یہ انتہائی ضروری ہے کہ جمہوری معاشرے کا ذمے دار شہری اپنی رائے کا بھی معروضی (objective) جائزہ لے اور دوسروں کی رائے کو بھی تنقیدی نظر سے جانچے ۔ ورنہ اس کے بغیر ریڈیو ، ٹیلی ویژن اور اخبارات جیسے ابلاغ عامہ کے ذرائع سے شائع ہونے والے بے شمار متفرق نظریات کی وجہ سے وہ جا بجا بھٹکتا پھرے گا ۔

۳ ۔ فرد کا احترام :

جمہوری معاشرے میں ہر فرد پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دوسرے افراد کا احترام کرے ۔ اس میں دو باتیں شامل ہیں اول یہ کہ اپنی معرفت حاصل کرے اور اپنے مقام کو پہچانے ۔ دوسرے یہ کہ دوسروں کو سمجھنے کی کوشش کرے اور ان کے مرتبہ و مقام کا اعتراف کرے ۔ اس میں معرفت نفس یعنی اپنی پہچان کا معاملہ انتہائی اہم ہے کیونکہ اس کے بغیر دوسروں کو پہچاننا ناممکن ہو جاتا ہے ۔

۴ - جمہوریت کا دلی احترام :

جمہوری معاشرے کے افراد کی سب سے بڑی ذمے داری یہ ہے کہ وہ جمہوریت کی دل سے قدر کریں اور اس کے تقاضوں کو سمجھیں - جمہوریت کو محض عوام کی حکومت سمجھے جانے کے سبب اس رجحان نے بہت ترقی کی کہ جمہوریت میں عوام کو خاص حقوق حاصل ہوتے ہیں - لیکن حقیقت کے دوسرے رخ کی طرف دیکھنے کی کسی نے ضرورت محسوس نہ کی کہ ہر حق کے مقابل ایک ذمے داری بھی ہے جسے تسلیم کرنا ضروری ہے - جمہوریت کے صحیح شعور میں یہ دونوں پہلو شامل ہیں - اسلامی جمہوری معاشرے میں اس کے علاوہ یہ یقین بھی ضروری ہے کہ حقوق و فرائض کا معاملہ صرف دنیوی معاملہ نہیں بلکہ آخرت میں بھی اس کے متعلق باز پرس ہوگی -

جمہوری معاشرے میں معلّم کے فرائض اور ذمے داریاں

جمہوری معاشرے میں مدرسے کی حیثیت اور فرد کی ذمے داریوں کی روشنی میں معلم کے فرائض اور ذمے داریوں کا تعین کرنا آسان ہے - ذیل میں معلم کی اہم ذمے داریوں کا ایک خاکہ دیا گیا ہے -

۱ - طلبہ کو مدرسے سے مانوس کرانا :

غیر جمہوری معاشروں میں مدرسہ ایک انتہائی ناپسندیدہ مقام سمجھا جاتا ہے، جہاں طلبہ محض ناگواری سے جاتے ہیں- جمہوری معاشرے میں مدرسے کی حیثیت ایک چھوٹے جمہوری سماج کی ہوتی ہے - لہٰذا معلم کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ بچوں کو مدرسے سے مانوس کرائے- اس مقصد کے لیے انھیں مدرسے کے ماحول سے واقفیت حاصل کرنے میں مدد دی جائے ، مشاغل میں آزادانہ شرکت کے مواقع فراہم کیے جائیں ، مدرسے کے پروگرام کے مقاصد اور طریق کار کی وضاحت کی جائے- معلم کا

فرض ہے کہ طلبہ سے ہمدردانہ برتاؤ کے ذریعے انھیں اپنے قریب لائے اور انھیں ایک دوسرے سے قریب ہونے میں مدد دے ۔ اس طرح طلبہ بہت جلد مدرسے کے ماحول میں اپنائیت محسوس کرنے لگیں گے اور یہاں وقت گزارنے میں انھیں کوئی ناگواری نہ ہوگی بلکہ خوشی محسوس کریں گے ۔

۲ ۔ طلبہ کے سامنے شخصی کردار کا بہترین نمونہ پیش کرنا :

بچوں کی فطرت ہے کہ وہ بڑوں کے نمونے کو اختیار کرنا پسند کرتے ہیں ۔ آپ نے گھر میں چھوٹے بہن بھائیوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ ابو کی ٹوپی یا بوٹ پہن کر یا امی کا دوپٹہ اوڑھ کر بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں ۔ اسی طرح مدرسے میں محسوس اور غیر محسوس طور سے وہ معلم کی خصوصیات کو اپنے کرادر کا حصہ بناتے رہتے ہیں ۔ جمہوری معاشرے میں تو طلبہ کو معلم سے قریب ہونے کے عام مواقع ملتے ہیں لہذا اس کے شخصی کردار کی تاثیر اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ معلم طلبہ کے سامنے اپنے کردار کا بہترین نمونہ پیش کرے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ معلم کے لیے غلطیوں اور خطاؤں سے بالکل پاک ہونا ضروری ہے ۔ معلم آخر انسان ہے لہذا اس سے غلطی کا صدور ممکن ہے لیکن اسے اپنی خود پہچان ہونی چاہیے اور اپنی کمزوریوں کا احساس ہونا چاہیے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ محسوس یا غیر محسوس طور سے بالآخر طلبہ میں بھی معرفت نفس کی صفت پیدا ہو جائے گی جو جمہوری معاشرے کے شہریوں کے لیے لازمی صفت کی حیثیت رکھتی ہے ۔

۳ ۔ جمہوری طرز عمل اختیار کرنا :

معلم کو مدرسے میں ایک با اختیار شخصیت کی حیثیت حاصل ہے ۔ اپنے اس اختیار کو وہ جس طرح استعمال کرے گا ، طلبہ اسی کو ایک با اختیار شہری کے لیے معیار قرار دیں گے ۔ جمہوری معاشرے میں اختیارات کا تصور یہ ہے کہ ان سے مشترکہ جمہوری مقاصد کا

حصول ممکن ہو جاتا ہے اور اسی بنا پر اختیارات کا احترام کیا جاتا ہے ۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ صاحب اختیار شخص کو دوسروں پر مطلق برتری حاصل ہے ۔ معلم کو چاہیے کہ وہ اپنے اختیارات کو جمہوری انداز سے استعمال کرے ۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ آیندہ زندگی میں طلبہ کو جب بھی اختیار کا کوئی مقام حاصل ہوگا وہ جمہوری طرز عمل کا مظاہرہ کریں گے ۔ اس کے برعکس اگر معلم آمرانہ انداز اختیار کرے گا اور گروہی طرز عمل کے قواعد و ضوابط بناتے وقت اپنے آپ کو علیحدہ کر لے گا تو اختیار ملنے پر طلبہ کا طرز عمل بھی اسی قسم کا ہوگا ۔

۴ - طلبہ کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرنا :

جمہوری معاشرے میں معلم کی حیثیت ایک دوست اور ہمدرد کی ہوتی ہے ۔ معلم کو اپنے طرز عمل سے جلد از جلد طلبہ کے دلوں میں یہ اعتماد پیدا کر دینا چاہیے کہ معلم ان کا دوست ، خیر خواہ اور ہمدرد ہے ۔ طلبہ اس بات کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنے مسائل کسی سے بیان کریں ۔ اس سلسلے میں وہ کسی ایسے شخص کے متلاشی ہوتے ہیں جو ان کا دوست اور خیر خواہ بھی ہو اور مسائل کے حل میں ان کی رہنمائی کی اہلیت بھی رکھتا ہو ۔ مدرسے میں معلم کو یہ کردار ادا کرنا چاہیے تاکہ بچے بلا تکلف اس سے اپنے مسائل بیان کر سکیں ۔

۵ - طلبہ کو گروہی عمل کی تربیت دینا :

جمہوری معاشرے میں معلم کا فرض ہے کہ طلبہ کو گروہی کاموں میں شرکت کی تربیت دے ۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود گروہی امور میں شرکت کا پورا سلیقہ رکھتا ہو ۔ جمہوری معاشرے میں معاشرتی عمل کا تمام تر انحصار گروہی طریق کار پر ہوتا ہے ۔ اس میں فیصلہ کرنے ، منصوبہ بنانے اور اس پر عملدرآمد کرنے کے تمام مرحلوں میں دوسروں سے ربط و ارتباط کی ضرورت پڑتی ہے اور دوسروں

کی رائے کے احترام کی تربیت ہوتی ہے ۔ معلم کو مدرسے میں ایسے بے شمار مواقع ملتے ہیں جہاں وہ گروہی عمل کی جمہوری اقدار کا مظاہرہ کرا سکتا ہے ۔ کمرۂ جماعت کو چھوٹے پیمانے پر ایک جمہوری معاشرے کی شکل دی جا سکتی ہے ۔

٦ ۔ طلبہ میں آزادیٔ فکر پیدا کرنا :

جمہوری معاشرے میں آزادیٔ فکر کو ایک اہم قدر کی حیثیت حاصل ہے ۔ معلم کو چاہیے کہ طلبہ میں یہ صفت پیدا کرے ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ طلبہ پر اپنے نظریات ٹھونسنے کے بجائے انہیں آزادی سے رائے قائم کرنے دی جائے اور اظہار رائے اور تنقید کا حق دیا جائے ۔

٧ ۔ تعلیمی مہارت سے طلبہ کی رہنمائی کرنا :

جدید دور میں معلم کی علمی قابلیت کو بہت نظر انداز کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ معلم کا کام نفس مضمون کا علم دینا نہیں ۔ تاہم معلم کو طلبہ کا رہنما اور مشیر تسلیم کیا جاتا ہے ۔ یہ منصب بذات خود اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ معلم کو ایک ایکسپرٹ یعنی ماہر تعلیم کا کردار ادا کرنا چاہیے ۔ اس حیثیت میں اس کا فرض ہے کہ وہ طلبہ کو اپنی نشو و نما ، اپنی خوبیوں اور خامیوں کا پتا چلانے اور اسی طرح دوسرے ساتھی طلبہ کو سمجھنے میں مدد دے نیز مقاصد تعلیم کے حصول اور مسائل کے حل تلاش کرنے میں طلبہ کی رہنمائی کرے ۔ اس سلسلے میں یہ بات جمہوری تقاضوں میں شامل ہے کہ طلبہ کو معلم کی آرا و تجاویز سے اختلاف کی آزادی ہونی چاہیے اور معلم میں اس اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا مادہ ہونا چاہیے ۔

٨ ۔ پیشہ ورانہ نشو و نما کی کوشش کرنا :

معلم کی علمی و فنی قابلیت کو ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہی ہے ۔ اب صرف یہ کہہ کر اس اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا کہ معلم

کا کام علم دینا نہیں بلکہ علم حاصل کرنے میں مدد دینا ہے ۔ اگر بغور دیکھا جائے تو جمہوری معاشرے میں معلمؔ کی پیشہ ورانہ نشو و نما کی ضرورت پہلے سے بھی بڑھ گئی ہے ۔ اب اس کا ہر لفظ حرف آخر نہیں سمجھا جاتا بلکہ طلبہ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ اس کی باتوں کو تنقیدی نظر سے پرکھ کر قبول یا رد کریں ۔ اس صورت حال میں ضروری ہے کہ معلم اپنے متعلقہ شعبے میں علمی و فنی ترقیات و تحقیقات اور حالات حاضرہ سے پوری طرح با خبر ہو ۔ صرف درسی کتاب پر انحصار کا اب زمانہ نہیں رہا ۔ اب معلم کو دوسرے ذرائع سے بھی ضروری علمی و فنی مواد حاصل کرنا چاہیے ۔ اس میں مقامی آبادی اور وسیع تر معاشرے کے انسانی اور مادی ذرائع کے علاوہ ابلاغ عامہ کے ذرائع بھی شامل ہیں ۔ معلم کو ایسے ذرائع سے واقفیت ہونی چاہیے تاکہ بوقت ضرورت ان سے رجوع کر سکے ۔ اس قسم کے ذرائع سے حاصل شدہ مواد مختلف فائلوں میں جمع کرتے رہنا چاہیے ۔ یہ مواد مختلف حوالوں میں معلم کے کام آئے گا ۔

و ۔ اشارات سبق کی تیاری کا اہتمام کرنا :

جمہوری معاشرے میں نفس مضمون کے بجائے طلبہ کے تجربات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے ۔ اس سے بعض اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ اب معلم کے لیے تدریسی پلان یا اشارات تدریس کی تیاری ضروری نہیں ۔ حالانکہ تجربات مرکز نصاب (Experience-Centred Curriculum) میں پلان کی ضرورت اور بھی زیادہ ہوتی ہے اور اس پلان کی تیاری میں طلبہ کو بھی شریک کیا جانا چاہیے ۔ بہرحال معلم نفس مضمون کی مرکزیت کا طریقہ Subject Centred method اختیار کرے یا تجربات کی مرکزیت والا طریقہ (Experience centred method) معلم کو تدریسی اشارات بڑے اہتمام سے تیار کرنے چاہییں۔ اس سلسلے میں اسے متعلقہ معلمین ، طلبہ ، والدین اور عام شہریوں کو شریک مشورہ کرنا چاہیے ۔

۱۰ ۔ طلبہ کے ساتھ مؤثر تعلقات رکھنا :

جمہوری معاشرے میں تدریسی عمل معلم و متعلم کی مشترکہ سرگرمی کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا معلم کو طلبہ کے ساتھ مل کر کام کرنے میں مؤثر کردار ادا کرنا چاہیے ۔ معلم کو ایک رفیق کار کی حیثیت اختیار کرنی چاہیے اور مدرسے کے ہم نصابی مشاغل کی منصوبہ بندی میں طلبہ کو باقاعدہ شریک کرنا چاہیے اور عملاً خود برابری کی سطح پر طلبہ کے ساتھ ان مشاغل میں شرکت کرنی چاہیے ۔ دوسری طرف نصابی امور کی منصوبہ بندی میں بھی طلبہ کو شریک کار کیا جانا چاہیے ۔

۱۱ ۔ نظم و نسق مدرسہ میں مؤثر شرکت کرنا :

جمہوری معاشرے میں مدرسے کا نظم و نسق بھی جمہوری طرز پر قائم ہوتا ہے ۔ لہٰذا صرف صدر معلم کو تمام انتظامی امور کا ذمے دار قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ معلمین کو اس میں باقاعدہ شرکت کرنی چاہیے ۔ اس میں مدرسے کی پالیسیوں کا طے کرنا ، ان کا نفاذ اور جائزہ شامل ہے ، جس میں ہر معلم کو دوسرے معلمین کے تعاون سے شرکت کرنی چاہیے ۔ علاوہ ازیں ریکارڈ کی تیاری اور حفاظت ، رپورٹوں کی تیاری اور ترسیل ، ضبط مدرسہ ، طلبہ کی نگرانی اور ان کی صحت کی حفاظت کے امور بھی معلم کی سرگرم شرکت کے متقاضی ہیں ۔

۱۲ ۔ معاشرے کے ساتھ مؤثر تعلقات رکھنا :

جمہوری معاشرے میں مدرسہ معاشرے سے براہ راست متعلق ہوتا ہے ۔ افراد معاشرہ مدرسے کے کام کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کی اصلاح کے لیے رائے دینے کو اپنا حق سمجھتے ہیں ۔ اس صورت حال میں مدرسے اور معاشرے کے مابین خوشگوار تعلقات ضروری ہیں اور اس سلسلے میں معلم کو مؤثر کردار ادا کرنا چاہیے ۔ اسے چاہیے کہ مقامی آبادی میں طلبہ کے والدین اور سرپرستوں سے رابطہ قائم رکھے اور انہیں مدرسے آنے کی دعوت دیتا رہے اور خود ان کی معاشری سرگرمیوں میں شریک ہوتا رہے ۔

معلم کو ایک مقامی آبادی اور وسیع پیمانے پر معاشرے کے مسائل میں دلچسپی لینی چاہیے اور انھیں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے - اس سلسلے میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ معلم معاشرے کے سیاسی یا مذہبی اختلافات کو مدرسے میں موضوع بحث نہ بنائے -

۱۳ - پیشہ ورانہ تنظیموں میں شرکت کرنا :

معلمی ایک پیشہ ہے لہٰذا اس کے کارکنوں کی اپنی پیشہ ورانہ تنظیم ضروری ہے جو پیشے کے وقار کی حفاظت کرے اور کارکنوں کی پیشہ ورانہ نشو و نما کا انتظام کرے - معلم کو چاہیے کہ ایسی پیشہ ورانہ تنظیموں میں باقاعدہ شرکت کرے اور پیشہ ورانہ اخلاق کی پوری پوری پابندی کرے - اس موضوع پر مفصل بحث بارہویں باب میں آ رہی ہے -

۱۴ - طلبہ کی نشو و نما میں مدد دینا :

معلم کے تمام فرائض اور ذمے داریوں کا مرکز و محور طلبہ کی نشو و نما ہے - معلم کو اس سلسلے میں طلبہ کی مناسب رہنمائی کرنی چاہیے اور انھیں مناسب مواقع فراہم کرنے چاہییں - ان میں غور و فکر اور جذبۂ جستجو کی تخلیق کرنی چاہیے اور انھیں اعلیٰ اخلاق اور قومی تہذیب کا نمونہ بنانا چاہیے -

ان تمام ذمے داریوں اور فرائض کی ادائیگی میں معلم کو ہمیشہ یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ وہ اسلامی جمہوری معاشرے کا معلم ہے اور اس کا مطمحِ نظر یہ ہونا چاہیے کہ وہ طلبہ کو اسلامی جمہوری معاشرے کے مفید شہریوں کی حیثیت سے نشو و نما میں مدد دے - اس کے لیے ضروری ہے کہ معلم خود اسلامی اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہو -

سوالات

(۱) جمہوری معاشرے میں مدرسے کے کردار پر مختصر نوٹ لکھیے پاکستان میں مدرسے کا کردار کیا ہونا چاہیے ؟

(۲) جمہوری معاشرے میں فرد کی ذمے داریاں کیا ہیں ؟ اور ان کا معلم کی ذمے داریوں سے کیا تعلق ہے ؟

(۳) طلبہ سے متعلق امور کے بارے میں جمہوری معاشرے کے معلم کی ذمے داریوں کا خاکہ پیش کیجیے۔

(۴) جمہوری معاشرے میں معلم کے فرائض کو درج ذیل نکات کے تحت بیان کیجیے۔

(الف) مدرسے سے متعلق امور

(ب) ساتھی معلمین سے تعلقات

(ج) معاشرے سے تعلقات

(د) طلبہ میں جمہوری اخلاق کی نشو و نما

گیارھواں باب

مدرسہ ایک معاشرتی مرکز

تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے اور مدرسہ ایک معاشرتی مرکز - - - انسانی معاشرہ اپنی نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے لیے تعلیمی ادارے قائم کرتا ہے تاکہ نوجوان طلبہ اور چھوٹے بچے پروان چڑھ کر معاشرے کی زندگی میں شرکت کر سکیں اور اس کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کر سکیں - اس لحاظ سے مدرسہ ایک منتخب شدہ ماحول مہیا کرتا ہے جس میں معاشرے کی پسندیدہ عادات ، آداب ، افکار ، اقدار اور رجحانات طلبہ کے استفادے کے لیے پیش کر دیے جاتے ہیں تاکہ طلبہ کی شخصیت و کردار کی بہترین تربیت ہو اور وہ زمانہ بلوغت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں - معاشرے کی ناپسندیدہ عادات اور آداب و افکار کو مدرسے کے منتخب شدہ ماحول میں جگہ نہیں دی جاتی - اس لحاظ سے مدرسہ معاشرے کا بہترین اور معیاری معاشرتی ادارہ ہے اور معاشرے کی تہذیب و تمدن کی عکاسی کرتا ہے - مدرسہ اس لحاظ سے بھی اہم ترین معاشرتی مرکز ہے کہ بچے کی تعلیم و تربیت مدرسے کے ہاتھوں میں دے کر معاشرہ یہ توقع اور تقاضا کرتا ہے کہ اس کی تربیت معاشرے کی ضرورتوں ، مقاصد اور نصب العین کے مطابق ہوگی اور اس طرح تربیت پا کر بچہ معاشرے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرے گا - در حقیقت افراد کی تربیت معاشرے کے بغیر ممکن ہی نہیں - زبان و بیان اور اخلاق و آداب کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے لے کر سیاست و حکومت کے بڑے بڑے امور تک ، انسان کی حیثیت سے اس کی پوری زندگی معاشرے کے بغیر ناقابل تصور ہے - بقول اقبالؒ

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ ہر انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہنا اور پھلنا پھولنا چاہتا ہے۔ در حقیقت وہ فطری طور پر مجبور بھی ہے کہ انسانوں کے گروہ میں رہے۔ اسی سے انسانی نسل کے تحفظ اور تسلسل کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ انسانوں کے یہ گروہ چھوٹے ہوں یا بڑے، عارضی ہوں یا مستقل، انسانی گروہ بندی اور معاشرت کی اہمیت و ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ گروہ بندی یا معاشرہ مشترکہ ضرورتوں، مقاصد اور نصب العین کے تحت شعوری طور پر بھی معرض وجود میں آتا ہے اور غیر شعوری طور پر بھی۔ معاشرے کا ہر فرد محسوس یا غیر محسوس طور پر ان مشترکہ ضرورتوں اور نصب العین کے لیے متحرک رہتا ہے اور ان کے مطابق اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ ہر فرد معاشرے یا گروہ کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے حتیٰ کہ پیدا ہونے والا بچہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو معاشرے کے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔

مدرسہ چونکہ باقاعدہ طور پر منضبط، منظم اور رسمی قسم کا معاشرہ ہے اس لیے ہر بچہ اپنے نقطہ نظر، رجحان، آداب و اخلاق اور کردار و سیرت کے لحاظ سے سکول کے معاشرے سے گہرا اثر قبول کرتا ہے۔ جونہی کوئی بچہ مدرسے میں داخل ہوتا ہے وہ پہلے سے موجود طلبہ سے مطابقت پر مجبور ہوتا ہے اور خود ایسی مطابقت چاہتا بھی ہے۔ یہ مطابقت وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ غیر شعوری طور پر بھی ہوتی رہتی ہے۔ چونکہ مدرسے کا معاشرہ زیادہ منضبط اور منظم ہوتا ہے اس لیے مدرسے کا دائرہ اثر گھر کے معاشرے، گلی، محلے کے معاشرے اور دیگر بہت سی تنظیموں کے معاشروں سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ مزید برآں اس معاشرے کو پورے گاؤں، محلے، شہر اور حکومت کی تائید اور حمایت حاصل ہوتی ہے اس لیے مدرسے کا یہ معاشرہ بچوں کی شخصیت اور کردار کی تربیت کے لیے اہم ترین اثرات رکھتا ہے۔ در حقیقت کسی انسان کی شخصیت اور کردار کا انحصار اس کے معاشرتی ماحول پر ہے۔ جیسا کسی شخص کا ماحول ہو گا ویسا ہی اس

کا کردار ہوگا اور ویسی ہی اس کی شخصیت ہو گی ۔ بچہ پیدائش کے وقت جو صلاحیتیں لے کر دنیا میں آتا ہے ماحول ان پر اثر انداز ہو کر بچے کے کردار اور شخصیت کی تشکیل کرتا ہے ۔

اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک جو کچھ ہے بڑی حد تک اس معاشرتی ماحول کی وجہ سے ہے جس میں وہ پیدا ہوا اور جس میں اس کی تربیت ہوئی ۔ ہمارا اخلاق و کردار اچھا ہو یا برا سب کا سب معاشرتی ہے ۔ اسی طرح طلبہ کی عادات و صفات بھی کلی طور پر ان کی اپنی تخلیق نہیں ہیں بلکہ یہ ان کے اندرونی احساسات ، جذبات اور صلاحیتوں اور ماحول کی مختلف قوتوں کے باہمی اختلاط کا نتیجہ ہیں۔ گویا طلبہ کا معاشرتی ماحول ان کی مجموعی شخصیت کے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنی کہ ان کی اندرونی صلاحیتیں۔ مدرسہ بچوں کے معاشرتی ماحول کا اہم ترین جزو ہے ۔ مدرسے کی زندگی طلبہ کے سامنے ایسے حالات پیش کرتی ہے ، جن سے ان کے خیالات ، جذبات اور اعمال میں ایسا رد عمل پیدا ہوتا ہے ، جو مدرسے کی روایات کے عین مطابق ہوتا ہے ۔ اس طرح سے مدرسے کا معاشرتی ماحول ہر نئے طالب علم کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتا ہے ۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے جو مدرسے کا ماحول بچوں کے کردار و سیرت پر کرتا رہتا ہے اور اسی طرح سے اس مدرسے میں زیر تربیت رہتے ہوئے بچے اچھے کردار و اخلاق کے مالک بن جاتے ہیں ۔ اس لیے یہ امر اچھی طرح سے ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ جب کبھی ہم بچوں کے کردار میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا چاہیں تو یہ بالواسطہ طور پر اس کے ماحول کے ذریعے سے ہونی چاہیے نہ کہ براہ راست اور بلاواسطہ ۔ جس قسم کی تبدیلی بچوں کی سیرت میں پیدا کرنی مقصود ہو اسی لحاظ سے ان کے معاشرتی ماحول اور خصوصاً مدرسے کے معاشرتی ماحول میں تبدیلی پیدا کر دی جائے ۔

اس بحث سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ بچوں کی شخصیت اور کردار کی نشو و نما کے لیے سکول کا معاشرتی ماحول نہایت مؤثر اور اہم ذریعہ ہے اس لیے ضروری ہے کہ نہایت ہوش مندی اور منظم

طریقے سے سکول کے معاشرتی ماحول کو بچوں کے لیے منتخب کیا جائے۔ ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ معاشرتی ماحول کو اتفاقات اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بچوں کی شخصیت اور کردار کو مجروح کیا جائے۔ مدرسہ معاشرے کا ایک ادارہ ہے جس کے ذمے نہ صرف یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ طلبہ کو معلومات، تحسینات، عادات اور مہارتیں مہیا کر کے معاشرے کا ثقافتی ورثہ ان تک پہنچائے اور اس طرح معاشرے کے تحفظ کا اہتمام کرے، بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھا کر اس معاشرے کی ترقی کی ضمانت دے۔ معاشرتی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھ کر موجودہ حالات کو بہترین طریقے پر استعمال کیا جائے۔ اس طرح مدرسہ نہ صرف معاشرے کے استحکام میں مدد دے گا بلکہ اس سے معاشرتی ترقی بھی ہو گی۔ تعلیم کا یہ معاشرتی مقصد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مدرسے کی معاشرتی زندگی کی تنظیم اور منصوبہ بندی اس طرح سے کی جائے کہ اس سے کسب فیض کر کے ہر فرد اس قابل بن جائے کہ وہ بالغ زندگی کی ذمہ داریوں میں شریک ہو اور مؤثر طور پر ان سے عہدہ برآ ہو نیز اپنے رجحانات اور صلاحیتوں سے بھر پور فائدہ اٹھاتے ہوئے معاشرے کو ترقی کے اعلیٰ مدارج کی طرف لے جائے۔

زمانۂ طالب علمی میں بچے کو ہر وقت اپنے مدرسے کے معاشرتی ماحول سے مطابقت کرنی پڑتی ہے۔ چونکہ مدرسے کا ماحول جامد نہیں اس لیے بچے کا ردعمل سکول کے معاشرتی ماحول کے متعلق بھی جامد نہیں ہوتا۔ ماحول میں تغیر اور تبدیلی کے ساتھ ساتھ نئے مطالبات اور ضروریات بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں اس لیے طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں معاشرتی ماحول سے مطابقت کرتا رہے اور اس مطابقت کی تجدید کرتا رہے۔ اس سلسلے میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ مدرسے میں نشو و نما اور بالیدگی، معاشرتی مطابقت کے عمل کے دوران میں بچے کی شخصیت کو نقصان نہ پہنچے۔ طلبہ سکول کی روایات کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور اجتماعی کاموں کی تکمیل اور مقاصد کے حصول میں ایک دوسرے کا ساتھ دو

دیں لیکن اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھیں۔ کسی طالب علم کی مسرت اور کامیابی کا انحصار اسی بات پر ہے کہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے وہ کس حد تک اپنے کردار کو اپنے گروہ کے کردار کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ اس لیے ہر پاکستانی طالب علم کے لیے ایسے مواقع کی فراہمی ضروری ہے کہ وہ ماحول سے مطابقت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادیت کو بھی درجہ کمال تک پہنچائے۔ اپنی زندگی کے جسمانی، ذہنی، روحانی، اخلاقی اور معاشرتی گوشوں میں ترقی کی اعلیٰ منازل پر فائز ہو اور اس انفرادی ترقی کی بنیاد پر وہ پاکستان میں معاشرتی اور قومی سطح پر اصلاح اور ترقی کا بیڑا اٹھائے۔ غرض مدرسے کے بہترین معاشرتی ماحول کے لیے یہ ضروری ہے کہ معاشرتی مطابقت کے ساتھ ساتھ طلبہ کی انفرادیت کو پروان چڑھانے کے مواقع بھی مہیا کرے۔ مدرسے کی معاشرتی مطابقت کے سلسلے میں ضروری ہے کہ بچے کی پوری شخصیت کی تربیت کی جائے۔ عموماً علمی مطابقت کے لیے چند کتابوں اور ان کی سطحی معلومات تک بچے کے ذہن کو محدود کر دیا جاتا ہے۔ اگر اسے صحیح معنوں میں قومی اور بین الاقوامی معاشرے کا بہترین فرد بنانا ہے تو اس کی زندگی کی ہر پہلو سے تربیت کی جائے اور اس میں مطابقت پیدا کی جائے تاکہ وہ ذہنی، جسمانی، جذباتی، معاشرتی، سیاسی، روحانی، اخلاقی اور جمالیاتی طور پر مکمل شخصیت کا مالک بن جائے۔

مدرسے کی معاشرتی زندگی کس طرح تعلیم میں ممد و معاون بن سکتی ہے؟

تعلیمی اداروں کے باہر معاشرے اور پوری دنیا کے ساتھ بچوں کی مطابقت کے لیے ضروری ہے کہ مدرسے کی زندگی کی دلچسپیاں، سرگرمیاں اور عادات و مقاصد ایسے ہوں جو آسانی سے عملی زندگی میں قابل عمل ہوں، اس لیے ضروری ہے کہ بالغ زندگی کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر سکول کی زندگی میں ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے کہ مدرسے کی زندگی اور معاشرے کی عملی زندگی میں کوئی بعد یا تفاوت

محسوس نہ ہو اور بچوں کو سکول ہی میں وقت گزارنے سے عملی زندگی گزارنے کا ڈھنگ اور ڈھب آ جائے، لیکن آج کل کے جدید دور کی معاشرتی زندگی بہت پیچیدہ ہو چکی ہے اور اسے ہو بہو مدرسے کے معاشرتی ماحول میں سمو لینا نہایت مشکل ہے۔ پوری دنیا میں معاشرتی اور معاشی ڈھانچے میں اہم تبدیلیوں کی وجہ سے ہر سوسائٹی کی روایات ، رسم و رواج اور آداب و اخلاق بدل چکے ہیں اور ان میں تنوع اور پیچیدگی بڑھ چکی ہے ۔ صنعتی دور نے افراد ، معاشروں اور اقوام کو ایک دوسرے پر انحصار کرنا سکھا دیا ہے اور معاشرتی ادغام بھی بڑھ گیا ہے ۔ جمہوریت کے چرچے اور شہرت نے ہر فرد کو اس کی اہمیت سے آگاہ کر دیا ہے ، اس لیے زمانے کے حالات کے تحت نئے تقاضے ، نئے مقاصد اور نئے رجحانات پرورش پا رہے ہیں ۔ ان حقائق کے پیش نظر خام طبع طلبہ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ جدید زمانے کے پیچیدہ حالات میں براہ راست اور تیاری کے بغیر حصہ لیں، اس لیے مدرسوں کے منتظمین کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ نوخیز بچوں کو اس دنیا سے روشناس کرائیں اور مختلف نظریات ، رجحانات اور مقاصد سے واقفیت بہم پہنچائیں ، جو سماجی ترقی کے ضامن ہیں ۔

ان حالات میں مدرسے کے معاشرتی ماحول سے مناسب استفادے کے لیے درج ذیل اصول پیش نظر رہنے ضروری ہیں :

۱ - ہماری موجودہ معاشرتی زندگی کے مختلف پہلو بہت پیچیدہ ہیں اور طلبہ انہیں آسانی سے نہیں سمجھ سکتے ۔ اس لیے ان پیچیدہ عوامل میں سے آسان پہلو طلبہ کے سامنے پیش کیے جائیں ۔ معاشرتی تجربے کو آسان کر کے اور ترتیب دے کر طلبہ کے سامنے پیش کیا جائے ۔ طلبہ کی معاشرتی ترقی کے مطابق سکول کے معاشرتی ماحول کی درجہ بندی کی جائے ۔ جیسے جیسے طلبا کا شعور بڑھتا جائے معاشرتی زندگی کے تجربات پیچیدہ ہوتے چلے جائیں اور ان کا دائرہ اثر بھی سکول سے بڑھ کر محلے ، شہر ، قوم اور پوری دنیا تک وسیع ہو جائے ۔

۲ - یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ بالغ افراد کی معاشرتی زندگی کے کچھ پہلو اچھے ہوتے ہیں اور کچھ برے - اس لیے سکول کے منتظمین و اساتذہ کا یہ فرض ہے کہ وہ خام طبع طلبہ کے سامنے معاشرے کے اچھے پہلو ہی پیش کریں اور برے پہلوؤں کو سکول کی معاشرتی سرگرمیوں میں جگہ نہ دیں - مزید برآں مثالی سیرت و کردار کے اعلیٰ اوصاف بھی طلبہ کے نصب العین کے طور پر ان کے سامنے پیش کریں - اس طرح مدرسے کے ذریعے پورے معاشرے اور قوم کا اخلاق و کردار بہتر ہو سکتا ہے -

۳ - مدرسے کا یہ فرض ہے کہ متضاد نظریات میں توازن پیدا کرے - عام معاشرتی ماحول میں دلچسپیوں ، رجحانات اور مقاصد ، نسلی ، لسانی ، مذہبی ، معاشرتی گروہ بندیوں اور رسم و رواج اور روایات کے تضاد اور اختلاف کی وجہ سے عام طالب علم ذہنی اور عملی انتشار کا شکار ہو سکتا ہے - اس لیے مدرسے کا فرض ہے کہ ان معاشرتی تضادات میں توازن پیدا کرے - طلبہ کو وسعت قلب کے لیے آمادہ کرے اور چھوٹی چھوٹی گروہی وفاداریوں کو قربان کر کے اعلیٰ قومی اور دینی اقدار کے حصول کے لیے آمادہ کرے -

۴ - بچوں کو مدرسے کے معاشرتی ماحول میں معاشرتی تجربات کے لیے جو مواقع مہیا کیے جائیں وہ عملی سرگرمیوں سے متعلق ہوں - طلبہ ان سرگرمیوں میں حصہ لیں جو بالغ افراد کے لیے ضروری ہیں اور ان میں تربیت حاصل کریں اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق شہریت کے حقوق و فرائض کو اچھی طرح سے سیکھ لیں -

مدرسے کو معاشرتی مرکز بنانے کے فوائد :

مدرسے کو معاشرتی مرکز بنانے سے چند فوائد مرتب ہوتے ہیں جو دوسرے معاشرتی اداروں میں ناقابل حصول ہیں - یہ فوائد حسب ذیل ہیں :

۱ - مدرسے میں ہر طالب علم کو میسر آنے والا گروہ گھر کے گروہ کی بہ نسبت بڑا ہوتا ہے۔ گھر میں بچے کے بہن بھائی ہوتے ہیں جن کے ساتھ وہ کھیل سکتا اور کام کر سکتا ہے لیکن یہ بہن بھائی مختلف عمروں کے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس سکول میں ہم جماعت بچے تقریباً ہم عمر ہوتے ہیں۔

۲ - یہ بچے مختلف اخلاقی، ذہنی، سماجی پس منظر اور درجات کے گھروں سے آتے ہیں، اس لیے ہر بچہ دوسرے بچوں کے سابقہ تجربات سے استفادہ کرتا ہے۔ اس طرح ہر بچے کا ذہنی، اخلاقی، روحانی اور سماجی سرمایہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ گھر کے محدود معاشرتی ماحول سے مدرسے کے وسیع معاشرتی ماحول میں آکر ہر طالب علم وسیع معاشرتی ماحول کا رکن بن کر بہت سی اقدار کو حاصل کر لیتا ہے۔

۳ - جب بچہ وسیع معاشرتی ماحول میں اساتذہ اور دوسرے طلبہ سے ملتا ہے تو ان کے گروہ کا رکن بن جاتا ہے۔ اس کے مفادات اور دل چسپیاں وسیع ہو جاتی ہیں۔ تنگ نظری کی جگہ اس میں باہمی احترام، ہم دردی، رحمدلی اور بردباری کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ دائمی قسم کی دوستی اور محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ خودغرضانہ ذاتی مفادات اور صفات کی جگہ اجتماعی زندگی کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔

۴ - مدرسے کے معاشرہ میں یک جہتی کی بنا پر طالب علم کی زندگی باہم اشتراک کی زندگی ہوتی ہے۔ ایک ہی عمارت مدرسہ میں یکساں قسم کے مقاصد، دلچسپیوں اور مشغلوں، روایات اور رسم و رواج اور قواعد و ضوابط کے ذریعے ہر بچہ مشترکہ زندگی میں فخر سے حصہ لیتا ہے اور سکول کی شہرت کو بلند سے بلند تر کرنے کا متلاشی رہتا ہے۔ اپنے ہم عمروں اور ہم جماعت طلبہ سے باہم مسابقت اور اتحاد و تعاون اور اسی طرح کے بہت سے سماجی اور اخلاق اوصاف و اقدار سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

سماجی مشاغل

تعلیم کے مقاصد کی تکمیل اور حصول کے لیے نصاب تعلیم اہم ترین ذریعہ ہے۔ نصاب سے مراد طلبہ کی وہ سب سرگرمیاں، تجربات، فہم، تحسین اور رجحانات ہیں جو طلبہ کے کردار اور شخصیت کی تعمیر کے لیے تعلیمی اداروں کی سرپرستی میں انجام پائیں۔ اس نصاب تعلیم کو عموماً دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ نصابی سرگرمیاں، جیسے مدرسے کے مختلف مضامین تدریس۔

۲۔ ہم نصابی سرگرمیاں یعنی مضامین کے علاوہ کھیل کود، علمی و ادبی سرگرمیاں، تفریحی مشاغل وغیرہ۔

نصابی اور ہم نصابی سرگرمیاں ابھی تک الگ الگ سمجھی جاتی ہیں لیکن ماہرین تعلیم ان دونوں میں کسی تفریق و تمیز کے قائل نہیں اور تعلیمی مقاصد کے حصول کے لیے دونوں قسم کی سرگرمیوں کو ہم پلہ سمجھتے ہیں۔ موجودہ تعلیمی نظریات کے مطابق معاشرتی مشاغل کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔ ان مشاغل اور فعالیتوں کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ ان اعلیٰ اقدار اور اوصاف سے لگایا جا سکتا ہے جو ان سماجی مشاغل کی مدد سے طلبہ میں پیدا کیے جاتے ہیں۔ یہی مشاغل کچھ عرصہ قبل محض تفریح کا ذریعہ سمجھے جاتے تھے اور ان کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ طلبہ کی ذہنی اور اخلاقی نشو و نما میں انھیں کوئی دخل حاصل نہیں۔ آج کل یہی سماجی مشاغل معاشرتی مقاصد کے حصول کے لیے سب سے اہم ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔

ان کا تعلق چونکہ براہ راست طلبہ کے احساسات اور جذبات سے ہوتا ہے اس لیے درسی مضامین کے مقابلے میں یہ مشاغل زیادہ جاندار اور مؤثر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اب طلبہ کی ذہنی، سماجی، اخلاقی اور روحانی اقدار کو بروئے کار لانے کے لیے اور تعلیمی اداروں کو زندہ اور فعال بنانے کے لیے درس و تدریس اور سماجی مشاغل میں ارتباط پیدا کرنے کا

رجحان فروغ پا رہا ہے اور بچوں کو مفید شہری بنانے کے لیے نصابی
اور غیر نصابی مشاغل کا امتیاز مٹا کر طلبہ کی اجتماعی نشو و نما کے
لیے ان عوامل کو مربوط اور منظم صورت میں پیش کرنے کی طرف
توجہ کی جا رہی ہے۔

بہترین شہریوں کی تربیت کے لیے مدرسہ سب سے بڑی تربیت گاہ
ہے۔ کسی معاشرے یا ملک کو جس قسم کے شہری درکار ہوں
مدرسے میں تربیت کے ذریعے سے پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ مدرسوں کی
تربیت ہی کی وجہ سے قومی کردار کی چھاپ ہر ایک فرد پر لگتی ہے
اور وہ دوسری اقوام کے افراد سے واضح طور پر ممتاز اور نمایاں ہوتا
ہے۔ مثال کے طور پر سپارٹا کو مضبوط اور تندرست نوجوانوں کی ضرورت
تھی اس لیے یہ کام مدرسوں کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ صحت مند اور
تندرست نوجوانوں کی تربیت کریں۔ اسی طرح ہر ملک اور قوم اپنے
اپنے حالات کے مطابق اپنی قوم کے افراد کی سیرت و کردار اور
شخصیت کو جس ضابطۂ اقدار اور اوصاف کے مطابق ڈھالنا چاہے ڈھال
سکتی ہے۔ ان میں حب الوطنی، تعاون، اتحاد، قوت اختراع و تخلیق،
احساس ذمہ داری، سلیقہ، سوجھ بوجھ، آزادی رائے، عزم، ولولہ،
حوصلہ، بردباری اور مقاصد کی بلندی جیسی اعلیٰ صفات پیدا کر سکتی
ہے۔ بچوں میں سماجی مشاغل کے ذریعے بلند حوصلگی، عمدگی، نفاست،
افہام و تفہیم، جد و جہد اور تکمیل نفس کی صفات پیدا کی جا سکتی
ہیں۔

معاشرتی مشاغل کا دائرہ کار کسی معاشرے کے اوصاف و اقدار
معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ ان مشاغل میں ماحول حقیقی ہوتا
ہے اور تجربات ذاتی (اس کے برعکس درس و تدریس میں ماحول حقیقی
نہیں ہوتا)۔ علمی و ادبی سرگرمیوں کے لیے دوسرے مدرسوں میں جانا
کھیل کود کے مقابلے، سماجی مشغلوں میں شرکت، معاشرے میں
رفاہ عامہ کے کام اور سکول سے باہر دور و دراز مقامات پر سکاؤٹنگ،
پکنک یا تعلیمی سیر کے لیے جانا در حقیقت بہت سی تعلیمی اقدار

کا آئینہ دار ہوتے ہیں ۔ بچے کے کردار و شخصیت کی تعمیر اور اس کی ذاتی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے ۔

سماجی مشاغل کی اہمیت :

اوپر بیان کیے گئے حقائق سے سماجی مشاغل کے مفہوم ، اس کی اہمیت ، ان سے حاصل ہونے والے چند اوصاف و اقدار کی وضاحت ہو گئی ہے ۔ ان مشاغل کی اہمیت کی مزید وضاحت کے لیئے درج ذیل چند امور پیش کیے جاتے ہیں :

۱ ۔ سماجی مشاغل طلبہ کی ضروریات کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے ہیں :

نئی تعلیمی پالیسی کے مطابق پرائمری مدرسوں کا دائرہ کار آٹھویں جماعت تک وسیع کر دیا گیا ہے لہٰذا ان طلبہ کی عمر 5 سال سے 13 ، 14 سال تک ہوتی ہے ۔ اس لحاظ سے پرائمری مدرسے کی ابتدائی جماعتوں کے طلبہ بچپن کی منزل پر ہوتے ہیں اور آخری جماعتوں کے طلبہ لڑکپن کی منزل سے گزر کر بلوغت کی سرحدوں میں داخل ہونے کے قریب ہوتے ہیں، اس لیے ان طلبہ کی لڑکپن اور ابتدائی بلوغت کی جسمانی ، ذہنی ، روحانی ، معاشرتی اور اخلاقی ضرورتیں منفرد قسم کی ہوتی ہیں اور معاشرتی مشاغل ان ضرورتوں کی تسکین کا سامان مہیا کرتے ہیں ۔ ان ضرورتوں کی تسکین کے ذریعے طلبہ کی شخصیت کی ہمہ جہت نشو و نما ہوتی رہتی ہے ۔ بچوں میں گروہ پسندی کا عنصر فطری طور پر موجود ہوتا ہے ۔ وہ اپنے گروہ کی فعال ترین شخصیت کی قیادت میں آگے بڑھ کر اپنے ذوق و شوق کو پروان چڑھاتے ہیں ۔ ان میں افکار و خیالات اور احساسات و اعمال کی یکسانیت پیدا ہوتی ہے ۔ بچوں کے گروہ پسندی اور تجسس کے فطری میلانات کو صحیح رخ پر ڈال کر انفرادی اور اجتماعی نقصان سے بچانے کے لیے صحیح قسم کے مشاغل نہایت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعے نوجوانوں

کی فالتو توانائی کا مفید مصرف فراہم کیا جاتا ہے اور آغاز بلوغت کے شدید اور تند و تیز جذبات اور محسوسات کو متوازن اور معتدل بنایا جاتا ہے۔ ان سے طلبہ میں مخصوص سماجی اور اخلاقی اقدار نشو و نما پاتی ہیں - وہ گروہ میں رہ کر ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ، دوسروں سے تعاون کرنا سیکھتے ہیں ، ان سے پڑھائی اور کھیل میں مقابلہ بھی کرتے ہیں - انھی مشاغل کے ذریعے طلبہ کو خدمت ، محبت ، اخوت ، یک جہتی ، جمہوریت اور دوسروں پر اعتماد کرنا سکھایا جاتا ہے - یہ معاشرتی مشاغل صحیح سیرت و کردار اور صحیح معاشرتی شعور پیدا کرتے ہیں جو تعلیم کا ایک اہم مقصد ہے -

۲ - سماجی مشاغل طلبہ کی معاشرتی تربیت میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں :

سماجی مشاغل اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ یہ طلبہ کی معاشرتی تربیت میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں - لڑکوں اور لڑکیوں کی سماجی تربیت و تنظیم اہم مسئلہ ہے - گروہ پسندی کا جذبہ ان طلبہ میں جماعتی تنظیم پیدا کرنے میں مدد گار ثابت ہوتا ہے - وہ مدرسے کے نظم و ضبط اور اس کے مختلف کاموں میں اشتراک عمل کا درس حاصل کرتے ہیں - انھیں اجتماعی کام کرنے کا سلیقہ بھی آ جاتا ہے - گروہی کام سے اپنے حقوق کے حصول اور دوسروں کے حقوق کا احترام سیکھتے ہیں - فرد اور معاشرے یا جماعت کے تعلقات اس دور میں مضبوط ترین ہوتے ہیں- اپنی جماعت یا سکول کی ٹیم کی کامیابی کو وہ اپنی کامیابی اور ان کی شکست کو اپنی شکست تصور کرتے ہیں - وہ اپنی جماعت اور گروہ کی بہترین خدمت انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں - اس سے وہ اطاعت و فرمانبرداری ، قیادت اور تعاون وغیرہ کے اوصاف حاصل کرتے ہیں -

۳ - ہم نصابی مشاغل سے طلبہ کے کردار کی تعمیر ہوتی ہے :

سماجی مشاغل طلبہ کی اخلاقی تربیت میں بھی بہت ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں- علمی، ادبی، معاشرتی اور دوسری تفریحی سرگرمیوں میں

طلبہ کو بہت سے ایسے مواقع ملتے ہیں جن سے وہ اپنے اخلاق کو زیادہ سے زیادہ بلند اور مثالی بناسکتے ہیں۔ وہ صداقت، دیانتداری، صفائی، پاکیزگی، راست بازی، تحمل، مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کی اعلیٰ صفات سے اپنے آپ کو متصف کر سکتے ہیں اور اس طرح پورے معاشرے اور قوم میں ایسی صفات پیدا ہو جاتی ہیں جن سے پوری دنیا میں قوم و ملت کا وقار و احترام بڑھ جاتا ہے۔

۴۔ سماجی مشاغل طلبہ کی صلاحیتوں کی نشو و نما کرتے ہیں:

سماجی مشاغل اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہیں کہ ان سے طلبہ کی صلاحیتوں کی نشو و نما ممکن ہو جاتی ہے۔ بڑے ہو کر کامیاب زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں لڑکوں کو اپنے کام کاج کے انتظام و انصرام کا موقع مہیا کیا جاتا رہے۔ جن بچوں کے ماں باپ اور اساتذہ ان کی ضرورت سے زیادہ خبر گیری اور دستگیری کرتے ہیں، ضرورت سے زیادہ محبت اور مروت سے پیش آتے ہیں ایسے بچے اپنے مسائل حل کرنے کی اہلیت اپنے آپ میں پیدا نہیں کر سکتے۔ چونکہ انہیں معاملات کو سمجھنے اور مسائل کو سلجھانے کی تربیت نہیں دی جاتی اس لیے موقع آنے پر مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس سماجی مشاغل طلبہ میں قیادت، رہنمائی، سوجھ بوجھ اور عزم و استقلال پیدا کرتے ہیں اور عقل و دانش کا صحیح استعمال کرنا سکھاتے ہیں۔

۵۔ سماجی مشاغل طلبہ کو کامیاب شہریت کی تربیت دیتے ہیں:

سماجی مشاغل کی اہمیت اس لحاظ سے بھی مسلّم ہے کہ یہ طلبہ کو کامیاب شہریت کے مواقع مہیا کرتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں کسی ملک و قوم کی عظمت کا راز اس چیز میں پوشیدہ ہے کہ اس کے شہری کتنے کامیاب شہری ہیں۔ کامیاب شہری وہ ہوتے ہیں جو اپنی قوم و ملک کے مسائل کو سمجھتے ہیں اور انہیں حل کرنے میں انفرادی مفاد کو قربان کر کے اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ نظم و ضبط کے پابند ہوتے ہیں۔

ذریعے طلبہ کو انفرادی دلچسپیوں کی نشوونما کا موقع ملتا ہے۔ درس و تدریس اور شہریت کی تربیت کے ساتھ ساتھ بچوں کی پسند و ناپسند، ان کے فطری رجحانات، ان کی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کا اندازہ کر کے انہیں مناسب سماجی مشاغل میں شرکت کا موقع دینا چاہیے۔ کوئی فنون لطیفہ کا دلدادہ ہوتا ہے تو کوئی باغبانی کا۔ کسی کی دلچسپی شعر و ادب کے ساتھ ہے تو کسی دوسرے کی صحافت سے۔ انفرادی اختلافات کے اس نظریہ کو قبول کرنے سے بچوں کی تربیت میں بہت آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ انفرادی دلچسپیوں کی نشو و نما سے طلبہ میں اجتماعی زندگی کے اوصاف کے ساتھ ساتھ انفرادی زندگی کی اقدار بھی نشو و نما پاتی ہیں۔

۸۔ سماجی سرگرمیوں سے طلبہ میں قائدانہ صلاحیتوں کی تربیت ہوتی ہے:

سماجی مشاغل کے ذریعے طلبہ میں قائدانہ صلاحیتوں کی تربیت ہوتی ہے۔ ان سرگرمیوں کے ذریعے ان میں جدت پسندی، خود اعتمادی، معاملہ فہمی، ہوش مندی، جرأت، انصاف پسندی، باہمی تعاون و اشتراک، بلند ہمتی، جوش، مصمم ارادہ، ایمان کی پختگی، ایثار، بے غرضی اور بے لوث خدمت کی صفات پیدا کی جا سکتی ہیں۔ جب بچے کسی تقریری مباحثے، مقابلے یا کھیل میں حصہ لیتے ہیں تو ان میں بطور لیڈر اور پیروکار کام کرنے کی صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ ساری صفات عملی زندگی میں نہایت مفید ثابت ہوتی ہیں۔

سماجی مشاغل کا انتظام:

مندرجہ بالا سطور میں سماجی مشاغل کی اہمیت واضح ہو چکی ہے۔ ان مشاغل کو کامیاب طریقے سے انجام دینے کے لیے جن چند امور کا پیش نظر رہنا ضروری ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سماجی مشاغل اور سرگرمیوں کے انتظام میں بھی اتنی ہی احتیاط برتی جائے جتنی تدریسی سرگرمیوں یا مضامین کے لیے کی جاتی ہے۔

اکثریت کے فیصلے کو وسعت قلبی سے قبول کرتے ہیں۔ معاشرے اور ملک و ملت کو خطرے اور مصیبت سے دو چار دیکھتے ہیں تو اپنی جان پر کھیل جانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی، محبت اور خلوص کا اظہار کرتے ہیں۔ سماجی مشاغل شہریت کی اس صحیح تربیت کے مواقع مہیا کرتے ہیں۔ طلبہ شہریت کے صحیح مفہوم کو سمجھنے لگتے ہیں اور حکومت کرنا اور حکم ماننا سیکھ جاتے ہیں۔ طلبہ کی کونسل اور کھیل کی ٹیموں میں شرکت انہیں تعاون اور محبت سیکھا دیتی ہے۔

۶۔ سماجی مشاغل کی مدد سے فارغ وقت کا صحیح استعمال ممکن ہو جاتا ہے:

مدرسے سماجی مشاغل کے ذریعے سے ایسی سرگرمیوں کا اہتمام کرتے ہیں جن سے طلبہ اپنی فرصت کا وقت مفید کاموں میں صرف کر سکتے ہیں۔ طلبہ کو شروع ہی سے ایسے مواقع باقاعدہ طور پر مہیا کرنے چاہییں جن سے وہ اپنے لیے اپنے پسندیدہ مشاغل چن کر ان میں اچھی خاصی مہارت اور دل چسپی پیدا کر لیں۔ ان مشاغل میں کھیل کود، دستکاری، صنعت اور باغبانی وغیرہ شامل کیے جا سکتے ہیں۔ فارغ اوقات میں بچہ جب ذوق و شوق سے ان سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے تو اسے ایک قسم کی مسرت اور راحت محسوس ہوتی ہے۔ اس کی شخصیت میں توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ بہت سی بری باتوں پر غور و فکر کرنے اور لغو کاموں میں اُلجھنے سے محفوظ رہتا ہے۔ اس طرح سے فارغ وقت ضائع بھی نہیں ہوتا بلکہ تخلیقی مشاغل میں صرف ہوتا ہے اور طلبہ کی شخصیت جامع ہو جاتی ہے۔ مزید یہ کہ فارغ وقت کو صحیح طریقے سے صرف کر کے جب طلبہ مطالعے اور درسی کام کو شروع کریں گے تو زیادہ مستعدی، استغراق اور جستجو کا مظاہرہ کریں گے۔

۷۔ سماجی مشاغل طلبہ کی انفرادی دلچسپیوں کی نشو و نما کرتے ہیں:

سماجی مشاغل کی اہمیت اس لحاظ سے بھی مسلم ہے کہ ان کے

ذریعے طلبہ کو انفرادی دلچسپیوں کی نشوونما کا موقع ملتا ہے۔ درس و تدریس اور شہریت کی تربیت کے ساتھ ساتھ بچوں کی پسند و ناپسند، ان کے فطری رجحانات، ان کی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کا اندازہ کر کے انھیں مناسب سماجی مشاغل میں شرکت کا موقع دینا چاہیے۔ کوئی فنون لطیفہ کا دلدادہ ہوتا ہے تو کوئی باغبانی کا۔ کسی کی دلچسپی شعر و ادب کے ساتھ ہے تو کسی دوسرے کی صحافت سے۔ انفرادی اختلافات کے اس نظریہ کو قبول کرنے سے بچوں کی تربیت میں بہت آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ انفرادی دلچسپیوں کی نشو و نما سے طلبہ میں اجتماعی زندگی کے اوصاف کے ساتھ ساتھ انفرادی زندگی کی اقدار بھی نشو و نما پاتی ہیں۔

۸۔ سماجی سرگرمیوں سے طلبہ میں قائدانہ صلاحیتوں کی تربیت ہوتی ہے:

سماجی مشاغل کے ذریعے طلبہ میں قائدانہ صلاحیتوں کی تربیت ہوتی ہے۔ ان سرگرمیوں کے ذریعے ان میں جدت پسندی، خود اعتمادی، معاملہ فہمی، ہوش مندی، جرأت، انصاف پسندی، باہمی تعاون و اشتراک، بلند ہمتی، جوش، مصمم ارادہ، ایمان کی پختگی، ایثار، بے غرضی اور بے لوث خدمت کی صفات پیدا کی جا سکتی ہیں۔ جب بچے کسی تقریری مباحثے، مقابلے یا کھیل میں حصہ لیتے ہیں تو ان میں بطور لیڈر اور پیروکار کام کرنے کی صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ ساری صفات عملی زندگی میں نہایت مفید ثابت ہوتی ہیں۔

سماجی مشاغل کا انتظام:

مندرجہ بالا سطور میں سماجی مشاغل کی اہمیت واضح ہو چکی ہے۔ ان مشاغل کو کامیاب طریقے سے انجام دینے کے لیے جن چند امور کا پیش نظر رہنا ضروری ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سماجی مشاغل اور سرگرمیوں کے انتظام میں بھی اتنی ہی احتیاط برتی جائے جتنی تدریسی سرگرمیوں یا مضامین کے لیے کی جاتی ہے۔

۲- تمام معلمین اپنی دلچسپیوں اور رجحانات کے مطابق مختلف سرگرمیوں کا انتظام اور نگرانی اپنے ذمے لے لیں۔

۳- سب اساتذہ مل کر مختلف سرگرمیوں اور مشاغل کا مشترکہ اور مجموعی پروگرام بنائیں۔

۴- ہر سرگرمی کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ طلبہ کے لیے اس میں کشش موجود ہو۔ لہٰذ بچوں کو اپنی پسند اور رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے کسی بھی سرگرمی میں شرکت کی اجازت ہو۔

۵- ہر سرگرمی کے مقاصد واضح طور پر بیان کیے جائیں اور یہ مقاصد طلبہ کی دلچسپیوں اور ذوق سے ہم آہنگ ہوں۔

۶- ہر سرگرمی اور مشغلے کی کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی معلم رہنما اور نگران کے طور پر اس سرگرمی میں حصہ لے۔

۷- زیادہ سے زیادہ طلبہ کو ان سماجی مشاغل میں حصہ لینے کا موقع مہیا کیا جائے اور اس سلسلے میں مختلف طریقوں سے طلبہ کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ مثلاً انعامات اور تعریفی سرٹیفکیٹ دے کر۔

۸- ہر طالب علم کسی نہ کسی سماجی سرگرمی میں لازمی طور پر شریک ہو۔

۹- کسی اہم سماجی مشغلے سے پہلے مدرسے کے سربراہ کو یہ یقین کر لینا چاہیے کہ وہ مشغلہ طلبہ کے لیے لازمی طور پر مفید رہے گا اور اس کے لیے مناسب صلاحیتوں سے متصف معلم بطور رہنما میسر ہو گا۔

۱۰- سماجی مشاغل مدرسے میں طلبہ کی تعداد اور سکول کی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر تجویز کیے جائیں۔

۱۱ - معاشرتی سرگرمیوں میں مدرسے کے باقاعدہ طلبہ ہی حصہ لیں - باہر کے بچے ان میں شریک نہ ہوں -

۱۲ - معاشرتی مشاغل کو باقاعدہ طور پر سکول کے ٹائم ٹیبل میں شامل کیا جائے - ان مشاغل کا درسی مضامین کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعلق استوار کیا جائے -

سماجی مشاغل کی اقسام :

طلبہ کی دلچسپیوں اور ان کے فطری رجحانات کے پیش نظر بہت سی سماجی سرگرمیاں تجویز کی جا سکتی ہیں - یہ سرگرمیاں طلبہ میں اعلیٰ قسم کی اخلاقی ، شہری ، سماجی اور ذہنی تربیت کا باعث ہوتی ہیں - لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی سکول میں کتنی اور کون کون سی سرگرمیاں منعقد ہوں - کسی مدرسے میں سماجی مشاغل کی تعداد اور نوعیت کا انحصار سکول میں طلبہ کی تعداد ، طلبہ کی عمر اور مدرسے کے مالی وسائل پر ہے - مزید براں مدرسے میں باصلاحیت اساتذہ جو طلبہ کو رہنمائی مہیا کریں اور مدرسے کے ارد گرد معاشرے کے خاص حالات بھی سماجی سرگرمیوں کے انتخاب پر اثر انداز ہوتے ہیں - اس لیے ہر ایک مدرسے کو اپنے اپنے حالات کے مطابق سماجی مشاغل کا انتخاب کرنا ہوگا -

سماجی مشاغل کو عام طور پر اس طرح تقسیم کیا جاتا ہے :

(الف) علمی و ادبی مشاغل - مثلاً مباحثہ ، تقاریر ، مدرسے کا رسالہ اور مدرسے کی انجمنیں یا جماعت وار یا مضمون وار انجمنیں -

(ب) ڈرامے یا تمثیل کاری کی سرگرمیاں ۔

(ج) کھیل اور اتھلیٹکس -

(د) تفریحی مشاغل -

۱ - **علمی و ادبی مشاغل :**

علمی و ادبی مشاغل نوخیز طلبہ کو خیالات کے اظہار کا موقع

فراہم کرتے ہیں۔ اس اظہار کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب، دلائل اور ترتیب وغیرہ کے رموز بھی طلبہ سیکھ جاتے ہیں۔ لوگوں کے سامنے اپنے مافی الضمیر کا اظہار ان کے لیے سماجی شعور کی تقویت کا باعث بنتا ہے۔ دوسروں کے سامنے اپنے نقطہ نظر کا برملا اظہار، لطیف انداز بیان اور دلائل سے مزین گفتگو سماجی زندگی کے لیے نہایت اہم ہے۔ علمی و ادبی مشاغل میں اظہار تحریری بھی ہو سکتا ہے اور زبانی بھی۔ زبانی اظہار کی یہ صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ عام طلبہ کے سامنے اپنے پسندیدہ موضوع پر تقریر۔
۲۔ عام دلچسپی کے مسائل پر بحث مباحثہ۔
۳۔ کسی کتاب پر تبصرہ۔
۴۔ اعلیٰ علمی، ادبی شہ پاروں کی زبانی یا کتاب کی مدد سے قرأت۔

مدرسے میں علمی و ادبی سرگرمیوں کے انتظام کے لیے ضروری ہے کہ اگر سکول بڑا ہو تو سکول کی مختلف علمی و ادبی انجمنوں کے ساتھ ساتھ مختلف جماعتوں یا درجوں یا مضمونوں کی انجمنیں قائم کی جائیں۔ اس طرح طلبہ کو اظہار مافی الضمیر کے زیادہ مواقع میسر آسکیں گے اور زیادہ سے زیادہ طلبہ ان میں شرکت کر سکیں گے۔ جماعت وار یا مضمون وار انجمنیں طلبہ کو بڑی مجلسوں میں شرکت کے لیے تیاری کے بہترین مواقع مہیا کرتی ہیں۔

تحریری علمی و ادبی سرگرمیوں میں مدرسے کا رسالہ نہایت اہم ہے۔ یہ رسالہ طلبہ کو تحریری طور پر اظہار کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ مدرسے کا رسالہ پورے مدرسے کی سرگرمیوں کو ایک وحدت میں منسلک کر دیتا ہے۔ اس رسالے کی مدد سے طلبہ مختلف امتحانات، کھیلوں، مباحثوں اور تقاریر میں اپنے مدرسے کے مقام کو جان سکتے ہیں۔ سکول نے جو نمایاں امتیاز حاصل کیا ہوتا ہے وہ اس میں چھاپ دیا جاتا ہے۔ اس سے سکول سپرٹ میں اضافہ ہوتا ہے۔ سکول سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ رسالے میں شائع ہونے والے مضامین سے طلبہ کے

ذوق و شوق کو ابھارا جا سکتا ہے۔

رسالے کے علاوہ تحریری علمی و ادبی سرگرمیوں میں سکول کا خبرنامہ، ہاتھوں کا لکھا ہوا جماعت وار رسالہ یا سالنامہ طلبہ کے اظہار خیال کے لیے ایک نادر ذریعہ اظہار ہے۔ اس سے بچوں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملتا ہے۔ خصوصی طور پر سکول کے رسالے یا سالنامے کو ترتیب دینے والے طلبہ کی صحافت اور تنظیم میں کافی تربیت ہو جاتی ہے۔ ان رسالوں، خبرناموں یا سالناموں کو تمام طالب علموں کے لیے مفید بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ طلبہ ان میں حصہ لیں اور اگر ممکن ہو تو یہ رسالہ، خبرنامہ یا سالنامہ ہر طالب علم میں تقسیم کیا جائے تا کہ وہ اسے پڑھ سکے۔ قلمی رسالہ یا سالنامہ چند طلبہ کی مدد اور تعاون سے تیار کر کے الماری میں بند کر لینے سے مدرسے کے بیشتر طالب علموں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، سوائے ان طلبہ کے جنھوں نے ان کی ترتیب وغیرہ میں حصہ لیا ہو۔ مدرسے کے رسالے یا سالنامے کے لیے مالی ضرورت پوری کرنے کے لیے رضا کارانہ طور پر طلبہ سے اور باہر کے لوگوں سے چندہ یا عطیات اکٹھے کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اشتہارات حاصل کر کے مدرسے کے رسالے کے مالی وسائل کو تقویت دی جا سکتی ہے۔

ب۔ ڈرامے یا تمثیل کاری:

تمثیل کاری سماجی سرگرمی کے طور پر ہمارے مدرسوں میں ابھی اتنی مقبول نہیں جتنی مغربی ممالک کے سکولوں میں ہے۔ لیکن تمثیل کاری کا رجحان سب بچوں میں موجود ہوتا ہے۔ بچوں میں ڈرامے میں حصہ لینے اور ڈرامہ دیکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ تمثیل کاری یا ڈرامہ ایسا فن ہے جس میں زبان سے اظہار مدعا اور جسمانی پٹھوں سے خاص ترتیب میں حرکت کے ذریعے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ ڈرامے میں حصہ لینے سے طلبہ کو خود اظہاری کے مواقع ملتے ہیں۔ اکثر اسباق کو اگر ڈرامے کی صورت میں پیش کیا جائے تو ادنیٰ ذہانت

کا طالب علم بھی اسے سمجھ جائے گا۔ ڈرامے پیش کرنے سے والدین اور معاشرے کو مدرسے میں دل چسپی پیدا ہوتی ہے۔

مدرسوں میں پیش کیے جانے والے ڈراموں میں درج ذیل خصوصیات ہونی چاہییں:

۱- یہ ڈرامے مختلف اقسام کے ہونے چاہییں مثلاً ناٹک، سوانگ یا نقلیں۔

۲- چھوٹے بچوں کے لیے ڈرامے چھوٹے چھوٹے ہونے چاہییں۔ ایک ایکٹ کا مختصر ڈرامہ تیار کرنے میں بچوں کو آسانی رہتی ہے اور وقت بھی زیادہ خرچ نہیں ہوتا، اس لیے مختصر سے ڈرامے کو اگر بغیر بھولے اچھی طرح پیش کیا جائے تو اس کا تاثر زیادہ اچھا رہتا ہے بہ نسبت طویل ڈرامے کے جو اچھی طرح طلبہ یاد نہ کر سکے ہوں۔

ڈرامے کے عنوانات ایسے ہوں جن سے معاشرے کی اصلاح کی جا سکے مثلاً سمگلنگ کے برے نتائج، چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کے نقصانات، بیماریوں کی روک تھام، قرض لینے کا انجام وغیرہ

۴- مدرسے میں پیش کیے جانے والے ڈرامے تعلیمی نوعیت کے ہونے چاہییں، مثلاً تاریخ کے بیشتر اسباق کو ڈرامے کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

۵- اگر ہو سکے تو یہ ڈرامے بچوں کی تخلیق ہوں اور ان میں مناسب اصلاح کے بعد انہیں پیش کیا جائے۔

۶- ڈرامے کی کلب کا نگران ایسا معلم ہو جو ڈرامے سے گہری وابستگی رکھتا ہو۔

۷- بچوں کی نفسیات، رجحانات، دلچسپیوں اور خصوصاً ان کی عمر کے مطابق صرف اخلاقی، اصلاحی اور ذہنی پرورش کے موضوعات والے ڈرامے پیش کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

ج - کھیل اور اتھلیٹکس :

سماجی مشاغل میں سب سے زیادہ مقبول کھیل اور اتھلیٹکس ہیں۔ ان سے متعدد جسمانی ، ذہنی ، سماجی اور اخلاقی فوائد مرتب ہوتے ہیں۔ کھیل کے میدان کو جمہوریت کے گہوارے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے - ان کھیلوں سے انفرادی طور پر یا ٹیم کے ممبر کی حیثیت سے ہر طالب علم میں بے شمار اقدار نشو و نما پاتی ہیں اور ان کی غلط تنظیم اور نگرانی سے بے شمار خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے -

کھیلوں کی تنظیم کے لیے ضروری ہے کہ ہر طالب علم اپنی صلاحیت اور پسند کے مطابق کسی ایک یا زیادہ کھیلوں یا اتھلیٹکس کے مقابلوں میں حصہ لے - طلبہ کو مختلف گروہوں یا ٹیموں میں تقسیم کر دیا جائے۔ طلبہ کی عمر ، تعداد اور سکول کے وسائل کے مطابق مناسب کھیلوں کا انتخاب کیا جائے - اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ طلبہ کی رہنمائی کے لیے ایسے اساتذہ موجود ہوں جو مختلف کھیلوں اور اتھلیٹکس میں خصوصی مہارت اور شغف رکھتے ہوں -

کھیلوں اور اتھلیٹکس کی مناسب نگرانی اور رہنمائی کے لیے ایک کونسل یا کمیٹی یا سپورٹس بورڈ کا قیام لازمی ہے - ہیڈ ماسٹر اس کا صدر ہو اور کھیلوں کا انچارج (پی - ٹی - آئی یا کوئی اور معلم) اس کا سیکرٹری ہو - چند اساتذہ جو مختلف کھیلوں کے مشیر ہوں وہ اس کمیٹی کے ممبر بنا لیے جائیں - مختلف ٹیموں کے کپتان یا سکرٹری بھی اس کمیٹی میں شرکت کریں -

کھیلوں کے صحیح انتظام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو مدرسے کے درسی مضامین کی طرح باقاعدہ پروگرام کے مطابق چلایا جائے - ہر طالب علم روزانہ ان کھیلوں میں سے کسی ایک یا زیادہ میں حصہ لے - سب طلبہ کی کھیلوں میں شرکت کے لیے طلبہ کو جماعت وار یا کسی اور لحاظ سے مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - جماعت وار سالانہ مقابلے بھی منعقد کیے جا سکتے ہیں اور اول آنے والی

کا طالب علم بھی اسے سمجھ جائے گا۔ ڈرامے پیش کرنے سے والدین اور معاشرے کو مدرسے میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

مدرسوں میں پیش کیے جانے والے ڈراموں میں درج ذیل خصوصیات ہونی چاہییں:

۱۔ یہ ڈرامے مختلف اقسام کے ہونے چاہییں مثلاً ناٹک، سوانگ یا نقلیں۔

۲۔ چھوٹے بچوں کے لیے ڈرامے چھوٹے چھوٹے ہونے چاہییں۔ ایک ایکٹ کا مختصر ڈرامہ تیار کرنے میں بچوں کو آسانی رہتی ہے اور وقت بھی زیادہ خرچ نہیں ہوتا، اس لیے مختصر سے ڈرامے کو اگر بغیر بھولے اچھی طرح پیش کیا جائے تو اس کا تاثر زیادہ اچھا رہتا ہے بہ نسبت طویل ڈرامے کے جو اچھی طرح طلبہ یاد نہ کر سکے ہوں۔

ڈرامے کے عنوانات ایسے ہوں جن سے معاشرے کی اصلاح کی جا سکے مثلاً سمگلنگ کے برے نتائج، چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کے نقصانات، بیماریوں کی روک تھام، قرض لینے کا انجام وغیرہ

۴۔ مدرسے میں پیش کیے جانے والے ڈرامے تعلیمی نوعیت کے ہونے چاہییں، مثلاً تاریخ کے بیشتر اسباق کو ڈرامے کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ اگر ہو سکے تو یہ ڈرامے بچوں کی تخلیق ہوں اور ان میں مناسب اصلاح کے بعد انہیں پیش کیا جائے۔

۶۔ ڈرامے کی کلب کا نگران ایسا معلم ہو جو ڈرامے سے گہری وابستگی رکھتا ہو۔

۷۔ بچوں کی نفسیات، رجحانات، دلچسپیوں اور خصوصاً ان کی عمر کے مطابق صرف اخلاقی، اصلاحی اور ذہنی پرورش کے موضوعات والے ڈرامے پیش کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

ج - کھیل اور اتھلیٹکس :

سماجی مشاغل میں سب سے زیادہ مقبول کھیل اور اتھلیٹکس ہیں۔ ان سے متعدد جسمانی ، ذہنی ، سماجی اور اخلاقی فوائد مرتب ہوتے ہیں۔ کھیل کے میدان کو جمہوریت کے گہوارے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے - ان کھیلوں سے انفرادی طور پر یا ٹیم کے ممبر کی حیثیت سے ہر طالب علم میں بے شمار اقدار نشو و نما پاتی ہیں اور ان کی غلط تنظیم اور نگرانی سے بے شمار خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے -

کھیلوں کی تنظیم کے لیے ضروری ہے کہ ہر طالب علم اپنی صلاحیت اور پسند کے مطابق کسی ایک یا زیادہ کھیلوں یا اتھلیٹکس کے مقابلوں میں حصہ لے - طلبہ کو مختلف گروہوں یا ٹیموں میں تقسیم کر دیا جائے۔ طلبہ کی عمر ، تعداد اور سکول کے وسائل کے مطابق مناسب کھیلوں کا انتخاب کیا جائے۔ اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ طلبہ کی رہنمائی کے لیے ایسے اساتذہ موجود ہوں جو مختلف کھیلوں اور اتھلیٹکس میں خصوصی مہارت اور شغف رکھتے ہوں ۔

کھیلوں اور اتھلیٹکس کی مناسب نگرانی اور رہنمائی کے لیے ایک کونسل یا کمیٹی یا سپورٹس بورڈ کا قیام لازمی ہے - ہیڈ ماسٹر اس کا صدر ہو اور کھیلوں کا انچارج (پی - ٹی - آئی یا کوئی اور معلم) اس کا سیکرٹری ہو - چند اساتذہ جو مختلف کھیلوں کے مشیر ہوں وہ اس کمیٹی کے ممبر بنا لیے جائیں - مختلف ٹیموں کے کپتان یا سیکرٹری بھی اس کمیٹی میں شرکت کریں -

کھیلوں کے صحیح انتظام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو مدرسے کے درسی مضامین کی طرح باقاعدہ پروگرام کے مطابق چلایا جائے - ہر طالب علم روزانہ ان کھیلوں میں سے کسی ایک یا زیادہ میں حصہ لے - سب طلبہ کی کھیلوں میں شرکت کے لیے طلبہ کو جماعت وار یا کسی اور لحاظ سے مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - جماعت وار سالانہ مقابلے بھی منعقد کیے جا سکتے ہیں اور اول آنے والی

جماعت یا ٹیموں کو مدرسے کی سالانہ ترق دی جا سکتی ہے ۔

۷ ۔ **تفریحی مشاغل** (Hobbies) : عام طلبہ اور خصوصاً لڑکپن اور بلوغت کی ابتدائی منزل کے طلبہ کی شخصیت اور کردار کی تعمیر کے لیے ان کے دل پسند تفریحی کھیل نہایت اہم ہوتے ہیں ۔ یہ تفریحی کھیل طلبہ کی دلچسپیوں کے مظہر ہوتے ہیں ۔ فارغ وقت میں طلبہ کی دل چسپیاں ایسے تفریحی کھیلوں میں نہایت کار آمد ہوتی ہیں ۔ ایسی تفریحی سرگرمیاں فارغ وقت کے بہترین استعمال کے مواقع فراہم کرتی ہیں ۔ اگر فارغ وقت میں ایسے مشاغل کا اہتمام نہ کیا جائے تو طلبہ اس وقت کو غلط طریقے پر استعمال کر کے ضائع کر دیں گے جس سے ان کی سیرت و کردار کی نشو و نما اور اصلاح کی بجائے تخریب ہوگی ۔

دل پسند تفریحی مشاغل اور سرگرمیوں میں درج ذیل پانچ قسم کی سرگرمیاں شامل ہیں ، اگرچہ ان کی تعداد محدود نہیں :

۱ ۔ **علمی مشاغل** : زبان و ادب ، شعر و شاعری ، افسانہ نویسی ، دلچسپ سائنسی کھیل وغیرہ ۔

۲ ۔ **جمالیاتی مشاغل** : موسیقی ، مصوری ، تصویر کشی ، پینٹنگ (Painting) وغیرہ ۔

۳ ۔ **مشاہداتی مشاغل** : مطالعہ قدرت ، باغبانی ، کوہ پیمائی ، تعلیمی سیر ، خطاطی ، نقشہ کشی وغیرہ ۔

۴ ۔ **سماجی مشاغل** : انجمن امداد باہمی ، سکاؤٹنگ ، "گرل گائیڈنگ ، انجمن ہلال احمر ، ایمبولینس سوسائٹی ، سماجی خدمت کی مختلف انجمنیں اور زخمی لوگوں کی امداد وغیرہ ۔

۵ ۔ **صنعتی مشاغل** : سکول کی ورکشاپ میں مختلف قسم کے مواد سے ساختہ اشیاء ۔

ان سب دل پسند تفریحی کھیلوں اور سرگرمیوں کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی جا سکتی ۔ البتہ سکاؤٹنگ اور گرل گائیڈنگ کے متعلق چند سطور تحریر کی جا رہی ہیں ۔

سکاؤٹنگ :

سکاؤٹنگ جسے لارڈ بیڈن پاول نے 1908ء میں انگلستان میں شروع کیا موجودہ صدی کی سب سے بڑی تعلیمی تحریک ہے ۔ لارڈ

بیڈن پاول نے اپنی ملازمت کے دوران میں اپنے وسیع تجربے کی بنا پر محسوس کیا کہ بچوں میں خدمت اور وفاداری کا جذبہ بدرجہ کمال موجود ہوتا ہے۔ اگر طلبہ کو موزوں تربیت دے کر ان سے فائدہ اٹھایا جائے تو یہ بچے نہ صرف اپنی تعلیمی زندگی میں بلکہ اس کے بعد بھی بڑے مفید اور اعلیٰ قسم کے کام انجام دے سکتے ہیں۔ لارڈ بیڈن پاول نے تربیت کے قوانین اور اصول وضع کیے اور سکاؤٹوں کی تربیت میں وہ سب چیزیں جو شہری، دیہاتی، صحرائی اور بحری زندگی میں کام آ سکتی ہیں شامل کیں تاکہ سکاؤٹنگ کی تربیت پانے والا ہر بچہ کٹھن میں کامیاب و کامران ہو۔

سکاؤٹ سے مراد در حقیقت سپاہیوں کا وہ دستہ ہے جو دشمن کے ٹھکانے، جگہ، رسدگاہ وغیرہ سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے آگے بھیجا جاتا ہے۔ اس خطرناک اور اہم مشن پر ایسے سپاہیوں کو بھیجا جاتا ہے جن کی ذہانت تیز ہو، سوجھ بوجھ میں کمال ہو، اجنبی راستوں پر چلنا اور واپس آنا جانتے ہوں اور ہر قسم کے حالات میں مردانہ وار مقابلے کے لیے مستعد ہوں۔ لارڈ بیڈن پاول کو انھی خطوط پر طلبہ کے ایسے دستے تیار کرنے کا خیال پیدا ہوا، جو زمانۂ امن میں خلق خدا کی خدمت بجا لانے کے اہل ہوں۔ برصغیر پاک و ہند میں یہ تحریک 1920ء میں وجود میں آئی۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک اتنی مقبول ہوئی کہ آج کل یہ تحریک دنیا کے ہر حصے میں رائج ہو چکی ہے۔ ہر چار سال بعد دنیا بھر کے سکاؤٹوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ اس میں مدرسے کے طلبہ کے علاوہ عوام بھی بڑی تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔

اس تحریک میں سات سال کے بچوں سے لے کر بڑی عمر کے آدمیوں تک سب حصہ لے سکتے ہیں۔ ان منازل کی تفصیل یوں ہے:

۱۔ سات سال کی عمر سے گیارہ سال کی عمر تک کے جو بچے اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں انھیں ولف کب (wolf cub) کہا جاتا ہے۔ ان کا امتیازی رنگ زرد ہے۔ ان کے نصاب میں وہ

چیزیں شامل ہیں جن سے ان کی ذہنی اور جسمانی نشو و نما بہتر طریقے پر ہو سکے - ولف کب بنانے کا مقصد اچھا سکاؤٹ تیار کرنے کی تربیت دینا ہے - ان کا اصول ''بہترین کوشش'' ہے -

۲ - بارہ سال سے سترہ سال تک کی عمر کے جو طلبہ اس تحریک میں شرکت اختیار کرتے ہیں انہیں سکاؤٹ کہا جاتا ہے - ان کا امتیازی رنگ سبز ہے اور ان کا مقصد اچھے شہری بنانا ہے - ان کا اصول ''مستعد رہو'' ہے - ان کی تربیت میں ایسی سرگرمیاں شامل ہوتی ہیں جن سے ان کی عام روش کی نشو و نما ہو سکے اور ان میں خدمت خلق کا جذبہ بیدار ہو سکے -

۳ - اٹھارہ سال سے زائد عمر کے بالغ افراد کو جو اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں ''روور'' (Rover) کہتے ہیں۔ ان کا امتیازی رنگ سرخ ہے - ان کا مقصد اچھے شہری بنانا ہے اور ان کا اصول ''خدمت'' ہے - ان کے نصاب تربیت میں وہ سرگرمیاں شامل ہیں جن سے یہ اچھے شہری بن سکیں - اس لحاظ سے سکاؤٹنگ کی تربیت کے چار اہم پہلو ہیں (۱) عام روش کی تربیت ، (۲) تفریحی شغف کی تربیت ، (۳) جسمانی صحت کی تربیت اور (۴) شہریت کی تربیت -

عام روش کی تربیت کے لیے سکاؤٹنگ میں ایسی سرگرمیاں شامل کی گئی ہیں جن سے طلبہ میں خود ضبطی ، حاضر دماغی ، خود اعتمادی اور اپنا کام آپ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے - عام روش کی تربیت کے لیے سکاؤٹنگ کے مختلف مدارج ہیں مثلاً ٹینڈر فٹ ، سیکنڈ کلاس ، فسٹ کلاس اور شاہی سکاؤٹ - ان مدارج کے حصول کے لیے مختلف قسم کا نصاب متعین ہے جس سے عام روش کی تربیت ہوتی ہے -

تفریحی شغف کے نصاب میں ایسی سرگرمیاں شامل ہیں جن سے

بچہ بڑا ہو کر فائدہ اٹھا سکے ۔ یہ سرگرمیاں اس کے مستقبل کے پیشے کی بھی آئینہ دار ہوتی ہیں ۔ ان سرگرمیوں میں درزی کا کام، ٹائپ سیکھنا، محرری کا کام، باغبانی، جلد سازی اور ٹوکری بنانا اور اس قسم کے بہت سے مشاغل شامل ہیں ۔

جسمانی صحت کی نشوونما کے لیے کیمپ کی زندگی اور سکاؤٹنگ کے کھیل نہایت اہم ہیں ۔ آبادی سے دور تازہ اور کھلی فضا میں وسیع میدانوں، پہاڑوں یا جنگلوں میں خیمے لگائے جاتے ہیں ۔ سکاؤٹ خود خیمے لگاتے ہیں ۔ صفائی کرنا، پانی لانا، کھانا پکانا، برتن صاف کرنا اور اس طرح کے سارے کام خود کرتے ہیں ۔ شب بسری سے پہلے رات کو کیمپ فائر لگاتے ہیں اور دن بھر کی کوفت کو کیمپ کے دلچسپ پروگرام کے شور میں قہقہوں کے ساتھ فراموش کر دیتے ہیں ۔ اس پروگرام میں گیت، لطیفے، چٹکلے، لوک ناچ یا ایک ایکٹ کے ڈرامے جیسی تفریحات شامل ہوتی ہیں ۔ اس میں تعلیم اور تفریح کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے ۔ اس میں کسی کے خلاف بغض، نفرت، یا طنز نہیں ہوتی، بلکہ تفریح کے ساتھ ساتھ سادگی، شرافت اور اخلاق کا درس دیا جاتا ہے ۔ سکاؤٹ بچے اس پروگرام میں دوسرے ملکوں کی کہانیاں بیان کر کے ان قوموں کی بودوباش اور طرز معاشرت سے آگاہ ہوتے ہیں ۔ دوسری قوموں کے تجربات اور معلومات سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ انسانیت کے وسیع مفہوم سے آگاہ ہو کر اخوت اور مساوات کے جذبے سے آشنا ہوتے ہیں اور انسانوں سے فطری محبت کی وجہ سے کمزور و ناتواں اور ضرورت مند انسانوں کی مدد کرنے کا درس حاصل کرتے ہیں ۔ کیمپ فائر کا پروگرام شام کے کھانے کے بعد سے رات کے دس بجے تک ہوتا ہے ۔ اس پروگرام کو زیادہ طول نہیں دیتے تاکہ سکاؤٹ بچے جلد سو جائیں اور صبح جلد اٹھ کر اپنے مشاغل کے لیے بر وقت تیار ہو جائیں ۔

جسمانی تربیت کے لیے کیمپ کی زندگی کے ساتھ ساتھ کھیل بھی

نہایت ضروری ہیں ۔ تحریک کے موجد لارڈ بیڈن پاول نے اس چیز پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا ہے کہ تربیتی نصاب کی ہر چیز بذریعہ کھیل سکھائی جائے ۔ انھوں نے اپنی تصنیف لڑکوں کے لیے سکاؤٹنگ (Scouting for Boys) میں ہر موضوع کے بعد ایسے کھیلوں کی تفصیل درج کی ہے جن کے ذریعے اس موضوع پر کافی عبور حاصل کیا جائے ۔ سماجی خدمت سکھانے کے لیے زخمیوں کی ابتدائی طبی امداد ، زندگی بچانے کے طریقے اور عوام کی خدمت کے بہت سے طریقے تجویز کیے گئے ہیں ۔

سکاؤٹنگ کی تربیت میں قوت مشاہدہ میں اضافہ کیا جاتا ہے ۔ بچوں کو مختلف درختوں اور پودوں کے نام ان کے پتوں اور جڑوں کے خواص بتائے جاتے ہیں ۔ جانوروں اور پرندوں کے نام ، ان کی آوازوں اور عادات سے واقفیت دلائی جاتی ہے ۔ ان دیکھے راستے پر چلنے ، مختلف آوازوں ، سیٹیوں اور اشارات سے پیغام پہنچانے ، ندی نالوں کا پتا دینے اور ان کو عبور کرنے کے لیے عارضی پل بنانے کی تربیت دی جاتی ہے ۔ اجنبی جگہ پر رات کو ستاروں ، مسجدوں اور قبرستانوں کے ذریعے سمتوں کا پتا چلانے کی بھی تعلیم دی جاتی ہے ۔ کلہاڑی کا استعمال ، لکڑیاں اکٹھی کرنا ، رسی کا استعمال ، آگ کے ذریعے پیغام رسانی ، عمارتوں اور درختوں کی بلندی کا اندازہ لگانا اور جانوروں ، پرندوں یا انسانوں کے پاؤں کے نشانات سے کسی بات کا کھوج لگانا بھی ان کی تربیت کا اہم جزو ہے ۔

سکاؤٹنگ کی تحریک کا کسی مذہب یا فرقے سے کوئی تعلق نہیں ۔ ہر مذہب و ملت اور قوم و ملک کا بچہ اور جوان اس میں شرکت کر سکتا ہے ۔ اس میں شامل ہونے والے ایک دوسرے کو اپنا بھائی تصور کرتے ہیں ۔ اس تحریک کا لب لباب سکاؤٹ کے وعدے ، موٹو اور سکاؤٹ کے قانون میں مضمر ہے۔ سکاؤٹ اپنے وعدے میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پورا کرنے کا وعدہ کرتا ہے ۔ سکاؤٹ کا وعدہ یہ ہے ''میں اپنی آن پر وعدہ کرتا ہوں کہ (۱) خدا اور ملک کے فرض کی

ادائیگی میں (۲) دوسرے لوگوں کی ہر وقت مدد کرنے میں اور (۳) سکاؤٹ قانون کی پابندی میں ، میں اپنی پوری کوشش کروں گا"
سکاؤٹ کا موٹو یا اصول "المستعد" ہے۔ جس کے معنی ہیں "تیار رہو" ۔ یہ ہر سکاؤٹ کے لیے ہر وقت تیار رہنے کا الارم ہے ۔ اس اصول کے تحت سکاؤٹ روزانہ ایک اچھا کام کرنے کا عزم کرتا ہے ۔

سکاؤٹ کے قانون میں سکاؤٹ کی صفات اور فرائض گنوائے گئے ہیں ۔ یہ وہ اوصاف ہیں جن سے معاشرے کی بہترین طریقے پر خدمت کی جا سکتی ہے ۔ اس وجہ سے اس تحریک کو شہریت کی تربیت گاہ کہا جاتا ہے ۔

سکاؤٹ کا قانون یہ ہے :

۱ ۔ سکاؤٹ کی عزت قابل اعتبار ہوتی ہے ۔
۲ ۔ سکاؤٹ اپنے ملک ، سکاؤٹوں ، والدین ، اپنے اعلیٰ افسروں اور ماتحتوں کا وفا دار ہوتا ہے ۔
۳ ۔ سکاؤٹ کا فرض مفید ہونا اور دوسروں کی مدد کرنا ہے ۔
۴ ۔ سکاؤٹ سب کا دوست اور ہر دوسرے سکاؤٹ کا بھائی ہوتا ہے ۔ چاہے وہ کسی معاشرتی طبقے کا ہو ۔
۵ ۔ سکاؤٹ شائستہ ہوتا ہے ۔
۶ ۔ سکاؤٹ اپنے والدین ، پٹرول لیڈر یا سکاؤٹ ماسٹر صاحب کا حکم بغیر حیل و حجت مانتا ہے ۔
۷ ۔ سکاؤٹ حیوانات کا دوست ہوتا ہے ۔
۸ ۔ سکاؤٹ تمام مشکلات میں مسکراتا اور سیٹیاں بجاتا ہے ۔
۹ ۔ سکاؤٹ کفایت شعار ہوتا ہے ۔
۱۰ ۔ سکاؤٹ خیال ، قول اور فعل میں پاکیزہ ہوتا ہے ۔

گرل گائیڈنگ :

گرل گائیڈنگ وہ تعلیمی تحریک ہے جو سکاؤٹنگ کی تحریک کے اجرا کے بعد لڑکیوں کی زبردست خواہش اور اصرار پر 1909ء میں لارڈ بیڈن پاول اور لیڈی بیڈن پاول کی مشترکہ کوششوں سے قائم کی گئی۔

اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ لڑکیوں کو نظم و ضبط میں رہنے، اچھی شہری بننے، سماجی کام کرنے اور فوری حادثات میں مدد گار ثابت ہونے کی تربیت دی جائے۔

پاکستان میں یہ تحریک 1947ء میں قائم ہوئی اور مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح اس کی سرپرست اعلیٰ بنائی گئیں۔ پاکستان گائیڈ تحریک نے کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی ہے۔ گائیڈنگ کی چیف کمشنر بیگم جی۔ اے۔ خاں کو 1951ء میں دنیا کی گائیڈنگ کمیٹی کی طرف سے "چاندی کی مچھلی" کا تمغہ عطا کیا گیا۔ یہ اس تحریک کا سب سے اعلیٰ تمغہ ہے۔ پاکستان گائیڈ تحریک اپنے عوامی بہبود کے کام میں تعلیم بالغاں، باغبانی، زیادہ اناج اگاؤ، صاف گھر اور محنت و مشقت جیسے پروگرام نہایت کامیابی سے ملک کے کئی حصوں میں مکمل کر چکی ہے۔

گائیڈ تحریک، گائیڈ کے حلف، قانون، اصول اور تربیت و تنظیم کے لحاظ سے سکاؤٹنگ سے مشابہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کے درسی نصاب اور قانون وغیرہ کو لڑکیوں کی فطرت کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے۔ جب کوئی لڑکی گرل گائیڈ تحریک میں رضا کارانہ طور پر شامل ہوتی ہے تو وہ خدا اور ملک کی وفا دار رہنے کا حلف اٹھاتی ہے۔ وہ اس موقع پر دوسرے لوگوں کی مدد کرنے اور گائیڈ قوانین پر پابند رہنے کا بھی عہد کرتی ہے۔ حلف اٹھانے پر گائیڈ کو سہ شاخہ بیج دیا جاتا ہے جو اسے اپنے عہد کے تین حصوں کی یاد دلاتا ہے اور

اسے ہر روز ایک نیکی کرنے کا خیال دلاتا ہے :

۱ - خدا کے احکام کو صدق دل سے تسلیم کرنا اور انھیں بجا لانے کی کوشش کرنا ۔

۲ - جمہوریت میں کامیابی کے لیے ہر بچے کو ابتدائی عمر میں ذمہ داری قبول کرنے کی تربیت دی جائے ۔

۳ - بیرون خانہ سرگرمیاں عموماً اور کیمپنگ کی تربیت خصوصاً عمدہ کردار اور بہترین شہری بنانے کا ذریعہ ہوتی ہے ۔

گائیڈ قوانین انسان دوستی ، ہمدردی اور خدمت کے جذبے کے مطابق بنائے گئے ہیں ۔ گائیڈ بچیاں ان قوانین کو برضا و رغبت قبول کرتی ہیں اور ان پر عمل کرتی ہیں ۔ گائیڈ قوانین یہ ہیں ۔

۱ - گائیڈ کی عزت قابل اعتماد ہوتی ہے ۔

- گائیڈ وفا دار ہوتی ہے ۔

۳ - گائیڈ مدد گار ہوتی ہے اور دوسروں کو فائدہ پہنچاتی ہے ۔

۴ - گائیڈ سب عورتوں کی دوست اور دوسری گائیڈ کے ساتھ بہن جیسا سلوک کرتی ہے ۔

۵ - گائیڈ ہر ایک سے ادب سے پیش آتی ہے ۔

۶ - گائیڈ جانوروں سے ہمدردانہ سلوک کرتی ہے ۔

۷ - گائیڈ اپنے سے بڑوں کا حکم مانتی ہے ۔

۸ - گائیڈ مشکلات میں بھی مسکراتی ہے ۔

۹ - گائیڈ کفایت شعار ہوتی ہے ۔

۱۰ - گائیڈ خیال ، قول اور فعل میں پاکیزہ ہوتی ہے ۔

گائیڈ بچیوں کی تربیتی سرگرمیوں میں مطالعۂ فطرت ، نرسنگ ، لوک ناچ ، کھانا پکانا ، گانا ، موسیقی اور کئی کھیل شامل ہیں ۔ ان

تربیتی سرگرمیوں کا مقصد یہ ہے کہ گائیڈ بچوں میں وفا شعار، ہنس مکھ، صحت مند اور خدمت گزار خواتین کی صفات پیدا ہو جائیں۔ بیرون خانہ تربیتی سرگرمیوں کی مشق کا اعلیٰ ترین انتظام کیمپنگ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ جس میں گائیڈ بچیاں تمام سال کے سیکھے ہوئے اصولوں کی عملی مشق کرتی ہیں اور اپنے تجربے، ذمہ داری اور قائدانہ صلاحیتوں کا ثبوت مہیا کرتی ہیں۔ کیمپنگ سے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں، خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

اگرچہ گائیڈنگ کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے لیکن اجمالی طور پر اس کے بڑے مقاصد یہ ہیں:

۱- کھیل اور مسلسل امتحان کے ذریعے عمدہ کردار اور اعلیٰ شعور کا پیدا کرنا۔ گائیڈ قانون و عہد کی روشنی میں ضبط و نظم میں رہنے کی عادت اختیار کرنا۔

۲- اچھے شہری کی صفات اپنے آپ میں پیدا کرنا مثلاً تعاون، دوستی ہمدردی، مصیبت کے وقت دوسروں کی مدد۔

۳- کوئی ہنر یا فن سیکھ کر اپنی تخلیقی قوتوں کو کام میں لا کر مسرت و شادمانی حاصل کرنا۔

۴- کیمپنگ اور بیرون خانہ سرگرمیوں، کھیلوں اور سادہ صحت مندی کے اصولوں کی مشق سے جسمانی طور پر تندرست رہنا۔

گائیڈ بچیوں کی عمر کے لحاظ سے اس تحریک کے تین حصے ہیں:

۱- بلیو برڈز (Blue Birds) سات سے لے کر گیارہ سال سے کم عمر تک کی بچیاں۔

۲- گرل گائیڈز (Girl Guides) گیارہ سال سے سولہ سال تک عمر کی لڑکیاں۔

۳ - رینجر کمپنی (Ranger Company) سولہ سال سے زیادہ عمر کی لڑکیاں اور خواتین۔

بلیو برڈز کا عہد اور حلف قدرے نرم ہے۔ انھیں کم عمر ہونے کی بنا پر گھر پر روزانہ ایک نیکی کی تلقین کی جاتی ہے۔ البتہ گائیڈز اور رینجرز سے بلا لحاظ ملک و ملت، رنگ و نسل تمام نوع انسانی کی خدمت کا عہد لیا جاتا ہے۔

پٹرول سسٹم کے تحت بچیوں کو مختلف پٹرولوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے جہاں وہ قائد یا کارکن کی حیثیت سے مشترکہ نصب العین کے حصول کی تربیت حاصل کرتی ہیں۔ ایک کمپنی میں تقریباً ۳۲ گائیڈز ہوتی ہیں اور ہر کمپنی چار یا چھ پٹرول پر مشتمل ہوتی ہے۔

سوالات

۱ - "معاشرتی تربیت کے بغیر انسانی تعلیم قطعی نا مکمل ہے" بحث کیجیے۔

۲ - مدرسے کا معاشرتی ماحول کس طرح کسی قوم کی تہذیب و تمدن کے تحفظ اور احیاء کا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے؟

۳ - مدرسے کے معاشرتی ماحول کا گلی، محلے، مسجد، بازار، اور کھیل کے میدانوں کے معاشرتی ماحول سے موازنہ کیجیے۔

۴ - مدرسے کے معاشرتی ماحول سے کس طرح تعلیم میں مدد لی جا سکتی ہے؟

۵ - مدرسے کو معاشرتی مرکز بنانے کے فوائد بیان کیجیے؛ نیز بتائیے کہ مدرسے کے معاشرتی ماحول سے کس طرح استفادہ کیا جائے؟

۶ - تعلیمی مقاصد کے حصول میں ساجی مشاغل کی اہمیت واضح کیجیے۔

۷ - سماجی مشاغل کے انتظام کے مقاصد بیان کیجیے ، نیز ان مشاغل کے انتظامی اصول بھی بتائیے -

۸ - کیا آپ اس نظریے سے اتفاق کرتے ہیں کہ ''کھیل کا میدان بغیر چھت کا مدرسہ ہے؟ دلائل دے کر کھیلوں کی تعلیمی افادیت بھی واضح کیجیے -

۹ - سماجی مشاغل کو کون کون سے شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ؟ تفصیل سے بتائیے -

۱۰- علمی و ادبی مشاغل میں سے کون سا مشغلہ آسانی سے بہترین طریقے پر ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کے بچوں میں مقبول و مستفید ہو سکتا ہے ؟

۱۱- ڈرامے کی تعلیمی اہمیت واضح کیجیے اور بتائیے کہ ہمارے مڈل سکول میں اس سے کس طرح تعلیمی طور پر استفادہ کیا جا سکتا ہے ؟

۱۲- تفریحی مشاغل میں سے کسی دو پر مختصر نوٹ لکھیے -

۱۳- کھیلوں کے صحیح انتظام کے لیے کون کون سے امور پیش نظر رہنے چاہییں ؟

۱۴- سکاؤٹنگ یا گرل گائیڈنگ تحریک کے تعلیمی فوائد سپرد قلم کیجیے -

---

بارھواں باب

معلم کے پیشہ ورانہ تعلقات

مدرسہ ایک معاشرتی مرکز ہے۔ طلبہ معلمین ، منتظمین اور قومی سطح پر پورا معاشرہ اُس سے متعلق ہوتا ہے۔ اس طرح اس کے اندر اور باہر معاشرتی تعلقات کا ایک وسیع جال پھیلا ہوتا ہے جن میں متعدد افراد اور ادارے بلاواسطہ یا بالواسطہ شریک ہوتے ہیں۔ اس تمام معاشرتی صورت حال میں معلم کو اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے مدرسے سے متعلق تمام افراد اور اداروں سے اپنے تعلقات کی نوعیت کا بڑی احتیاط سے فیصلہ کرنا چاہیے۔ ایک معاشرتی مرکز کی حیثیت سے مدرسے کی کامیابی کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ معلم کے پیشہ ورانہ تعلقات خوشگوار اور بامقصد بنیادوں پر استوار ہوں۔

معلمی ایک پیشہ ہے :

معلم کے پیشہ ورانہ تعلقات کے صحیح شعور کے لیے معلمی کی پیشہ ورانہ حیثیت کا سمجھنا ضروری ہے۔ عرف عام میں معاش کے حصول کا ہر ذریعہ پیشہ کہلاتا ہے ؛ لیکن ماہرین نے پیشے کے لیے درج ذیل خصوصیات ضروری قرار دی ہیں :

(۱) اس کے لیے اعلیٰ اختصاصی تعلیم (Specialisation) کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۲) عملی میدان میں اس کے لیے مناسب طریق کار اور طرز عمل بڑی مہارت کا تقاضا کرتا ہے۔

(۳) اس کے لیے باقاعدہ لائسنس یا سند کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۴) یہ معاشرے کی انتہائی قابل قدر خدمت انجام دیتا ہے۔

(۵) اسے معاشرے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔
(٦) اس سے متعلق افراد اپنی پیشہ ورانہ اصلاح کے لیے اپنی انجمنیں بناتے ہیں۔
(۷) یہ اپنے افراد متعلقہ کے لیے قابلیت، کارکردگی اور طرز عمل کے معیار متعین کرتا ہے۔
(۸) قانون سازی اور معاشرتی اثر و رسوخ سے اپنے پیشہ ورانہ تحفظ کا اہتمام کرتا ہے۔

پیشۂ تدریس ان میں سے اکثر معیارات پر پورا اترتا ہے۔ معلمی کے لیے قابلیت، کارکردگی اور طرز عمل کے معیار متعین ہیں۔ معلمین کے لیے سندیں جاری کی جاتی ہیں اور معلمین کی پیشہ ورانہ انجمنیں قائم کرنے کا رواج بھی دن بدن بڑھ رہا ہے۔

پیشہ ورانہ تعلقات :

دیگر پیشوں کی طرح پیشۂ تدریس بھی اچھے پیشہ ورانہ تعلقات کا تقاضا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ باہمی تعلقات کا معاملہ بہت سادہ، آسان اور سستا ہے، اسے مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ معلم کے لیے یہ معاملہ انتہائی اہم ہے۔ اس کی ذاتی قابلیت، پسند یا ناپسند، طریقۂ تدریس، طرز عمل غرض جو کچھ بھی وہ کہتا ہے یا کرتا ہے، اس سے یہ تعلقات متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ اس کے ساتھی معلمین، منتظمین، طلبہ اور طلبہ کے والدین سب اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے رکھتے ہیں اور اس سے کچھ توقعات وابستہ کرتے ہیں جو عین ممکن ہے خود اس کی رائے اور نقطۂ نظر سے مطابقت نہ رکھتی ہوں لیکن اس کے لیے انہیں نظر انداز کرنا بھی ممکن نہیں۔ اس طرح معلم کے پیشہ ورانہ تعلقات کا معاملہ اتنا سادا نہیں رہتا کہ اسے سرسری نظر سے دیکھ کر چھوڑ دیا جائے۔ معلم کو اس کے مختلف پہلوؤں پر ہمیشہ گہری نظر رکھنی چاہیے۔ اس کے چند پہلو حسب ذیل ہیں :

معلم کے طلبہ سے تعلقات :

دور حاضر میں طلبہ کو نظام تعلیم میں مرکزی اہمیت دینے کا رجحان عام ہے ۔ یہ کچھ بے جا بھی نہیں ۔ دراصل پورے نظام تعلیم کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کی صحیح تعلیم و تربیت کی جائے۔ اس رجحان میں مبالغے کی وجہ سے بعض لوگوں نے طالبِ علم کی انفرادیت پر اتنا زور دیا کہ معاشرہ اور اس کے تقاضے نظر انداز ہو گئے ۔ اس نقطۂ نظر کی خامیاں آپ پہلے باب میں پڑھ آئے ہیں ، لیکن طالب علم کی مرکزی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے تو طالب علم محبت اور شفقت ہی نہیں احترام کا بھی مستحق ہے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ جو شخص طلب علم کے لیے نکلتا ہے فرشتے اس کے راستے میں اپنے پر بچھاتے ہیں ۔ استاد اور شاگرد کے خوشگوار تعلقات میں اس نکتے کو بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہیے ۔ استاد کو یہ بات ہمیشہ سامنے رکھنی چاہیے کہ طلبہ علم کے متلاشی ہیں لہٰذا قابل احترام ہیں ۔

طلبہ استاد کی رہنمائی کے حاجت مند ہوتے ہیں ۔ یہ استاد کی بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ طلبہ کی صحیح رہنمائی کرے ۔ جس طرح ایک فن کار ، مٹی ، گارے اور رنگوں کے خام مواد سے اپنی مہارت فن کے ذریعے ایک خوبصورت شاہکار کی تخلیق کرتا ہے اسی طرح ایک استاد کو ایک ناپختہ بچے سے ایک عظیم شخصیت کی تشکیل کرنی ہوتی ہے ۔ لیکن استاد کا کام ایک عام فن کار سے کہیں زیادہ مشکل ہے ۔ استاد کا خام مواد بے جان و بے حس نہیں بلکہ ذہن اور شعور سے مزین ہے ، احساسات اور جذبات کا مالک ہے ، اپنی پسند اور ناپسند رکھتا ہے ۔ وہ ایک جسم ہی نہیں بلکہ اس کے اندر ایک روح بھی ہے ۔ بقول علامہ اقبالؒ

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روحِ انسانی

طلبہ کی تربیت اور ان سے تعلقات کے سلسلے میں استاد کو یہ تمام پہلو سامنے رکھنے چاہییں۔

استاد اور شاگرد کے تعلقات پورے نظام تعلیم کی عکاسی کرتے ہیں ۔ ہر طالب علم نظام مدرسہ کے متعلق ایک رپورٹر کی حیثیت رکھتا ہے ۔ وہ مدرسے سے جا کر اپنے دوستوں ، بہن بھائیوں اور والدین سے اپنے تاثرات بیان کرتا ہے ، جہاں سے وہ آگے سے آگے پھیلتے رہتے ہیں ۔ اس اعتبار سے ضروری ہے کہ استاد طلبہ سے خوشگوار تعلقات قائم کرے ۔ اس سے یہ مقصد نہیں کہ استاد سستی شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کے لیے طلبہ سے جا و بے جا بے تکلفی کا مظاہرہ کرے ۔ اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ طلبہ استاد کا احترام کریں اور تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ طلبہ ایسے استاد کا احترام کرتے ہیں جو مستحکم شخصیت کا مالک ہونے کے باوجود طلبہ سے دوستانہ و ہمدردانہ برتاؤ کرے ، جو مزاح کا لطیف ذوق تو رکھتا ہو لیکن طلبہ کو کام میں بھی مصروف رکھے اور انھیں علم کی اہمیت اور اس کے صحیح استعمال کا شعور دے ۔

استاد بہرحال انسان ہے اور اسے انسان ہی رہنا چاہیے ۔ اسے نہ تو اپنے آپ کو عالم کل سمجھنا چاہیے نہ خطا سے پاک اور نہ ہی طلبہ کے ذہن میں اپنے متعلق کوئی ایسا تصور بٹھانا چاہیے ۔ ضرورت پڑے تو استاد کو بڑے سلیقے سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیے اور آیندہ کے لیے اصلاح کر لینی چاہیے ۔ تعلیمی اور تنظیمی امور میں طلبہ سے مشورہ لینا چاہیے ۔ انھیں مختلف ذمے داریوں کے ادا کرنے میں شریک کرنا چاہیے اور ان کی صلاحیتوں اور خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے ۔ طلبہ کے ساتھ ہم نصابی مشاغل میں شرکت کرنی چاہیے اور ان کی کمزوریوں اور خامیوں کو اچھالے بغیر ان کی اصلاح کی حتی الامکان کوشش کرنا چاہیے ۔

استاد کو چاہیے کہ طلبہ کی انفرادی ضروریات اور دلچسپیوں کا جائزہ لیتا رہے اور ان کے مطابق ان سے مناسب برتاؤ اور سلوک کرے۔

اس کے علاوہ محض اپنی پسند ناپسند یا کسی اور وجہ سے طلبہ میں کوئی امتیاز اور تفریق روا رکھنے سے طلبہ کے ساتھ تعلقات پر برا اثر پڑتا ہے ۔ لہٰذا استاد کو اس سے ہمیشہ اجتناب کرنا چاہیے اور طلبہ سے انصاف اور مساوات کا سلوک کرنا چاہیے ۔ طلبہ کے منشا کے خلاف ان سے ذاتی کام لینے ، انھیں ٹیوشن پر مجبور کرنے یا اساتذہ کے باہمی اختلافات کے سلسلے میں انھیں آلۂ کار بنانے سے استاد اور طلبہ کے باہمی تعلقات بری طرح متاثر ہوتے ہیں لہٰذا استاد کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے ۔

معلم کے ساتھی معلمین سے تعلقات :

قومی مقاصد تعلیم کے مطابق طلبہ کے لیے مناسب تعلیمی فضا قائم کرنا اور طلبہ کی معیاری تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا تمام معلمین کا مشترکہ فرض ہے ۔ اس فرض کو ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معلمین کے باہمی تعلقات انتہائی خوشگوار ہوں اور ان کی تہہ میں مشترکہ مقصد کے حصول کا جذبہ کام کر رہا ہو ۔ معلمین میں تقسیم کار کے سلسلے میں ربط و تسلسل کے لیے معلمین کے باہمی تعلقات بے حد اہم حیثیت رکھتے ہیں ۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ معلمین اپنے اپنے مضامین یا اپنی اپنی جماعت ہی کو اہم نہ سمجھیں بلکہ تمام مضامین اور تمام جماعتوں کو پورے نظام تعلیم کے بنیادی مقاصد کی روشنی میں مناسب اہمیت دیں ۔ اس سے باہمی مشاورت اور تعاون کے طریقوں کو فروغ حاصل ہوگا ۔

مثل مشہور ہے کہ کسی کو دوست بنانے کے لیے خود وہی بننا پڑتا ہے ۔ معلمین میں باہم دوستانہ اور ہمدردانہ تعلقات کے لیے اس اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے ۔ معلم کو چاہیے کہ اپنے آپ کو یا اپنی خدمات کو دوسروں سے برتر نہ سمجھے بلکہ دوسرے معلمین کا احترام کرے اور ان کی خدمات کی اہمیت کو تسلیم کرے ۔ ہر استاد کو اپنی خامیوں اور دوسروں کی خوبیوں کا فراخ دلی سے جائزہ لینا چاہیے اور اس بات کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے کہ معاملہ علم کا

ہو یا عمل کا ، اصلاح کی ہر وقت ضرورت ہے۔ معلم کو ساتھی معلمین کی نکتہ چینی اور عیب جوئی سے ہمیشہ اجتناب کرنا چاہیے۔

معلمین کے باہمی تعلقات کی اساس جذبۂ رفاقت ہے۔ بعض اوقات مدرسے کو ایک بڑے خاندان سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ باہمی رفاقت کا تقاضا ہے کہ معلمین ایک دوسرے کی مشکلات و ضروریات کا احساس کریں اور اس سلسلے میں حتی الامکان ایک دوسرے کی مدد کریں۔ ایک دوسرے کے متعلق آپس میں ، طلبہ میں ، منتظمین کے سامنے اور عوام میں اچھی رائے کا اظہار کریں۔ دوسروں کے کام میں بے جا مداخلت سے پرہیز کریں اور خواہ مخواہ ہر معاملے میں مشورہ دینا ضروری نہ سمجھیں۔ ایسی باتوں سے اجتناب کریں جن سے دوسرے ساتھیوں کی برائی یا تنقیص کا پہلو نکلتا ہو نیز باہمی اختلاف رائے کو برداشت کریں اور اختلاف رائے کو مخالفت کا رنگ نہ دیں۔ کسی ساتھی معلم سے کوئی شکایت ہو تو اسے جا بجا بیان کرنے کے بجائے متعلقہ معلم سے براہ راست بیان کریں اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے جذبے کو حد میں رکھیں تا کہ حسد ، بغض اور کینے کے جذبات پیدا نہ ہونے پائیں۔ اپنے مذہبی ، سیاسی اور معاشرتی نظریات و روابط ساتھی معلمین پر ٹھونسنے سے اجتناب کریں اور ان بنیادوں پر مدرسے میں اپنے غیر رسمی تعلقات یا گروہ بندی کو اپنے منصبی تعلقات سے متصادم نہ ہونے دیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم کا مشترکہ مقصد ہمیشہ سب معلمین کے سامنے رہے۔

معلم کے انتظامیہ سے تعلقات:

نظم و نسق مدرسہ سے مراد مدرسے کے افراد و وسائل کی فراہمی اور استعمال کا وہ عمل ہے جس سے مدرسے کے مشترکہ مقاصد کے حصول میں مدد ملے۔ اس اعتبار سے مدرسے کے تمام افراد جو مشترکہ مقصد کے شعور کے ساتھ اس عمل میں شریک ہوں دراصل منتظمین کا کردار ادا کرتے ہیں لیکن روایتی نقطۂ نظر سے مدرسے کی سطح پر منصب کے اعتبار سے صدر معلم کو منتظم قرار دیا جاتا ہے۔ دوسرے بہت سے

ممالک کی طرح ہمارے ملک میں بھی ابھی تک یہی روایتی تصور نافذ ہے۔ ہمارے صوبے میں مدرسے کی سطح سے اوپر منصب کے اعتبار سے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر (D.E.O) یعنی ضلعی افسر تعلیمات ضلع بھر میں نظم و نسق کا ذمے دار ہے، اس سے اوپر ڈویژنل ڈائریکٹر آف ایجوکیشن (D. D.E.) یعنی ڈویژنل ناظم تعلیمات کمشنری میں اور ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن (D. P. I.) یعنی ناظم تعلیمات عامہ صوبے بھر میں تعلیم کا ذمے دار ہے۔ ناظم تعلیمات عامہ صوبائی سیکرٹری تعلیمات کی تیار کردہ پالیسیوں کو نافذ کرتا ہے اور صوبائی وزیر تعلیم پورے صوبے میں تعلیم کی نگرانی کا ذمے دار ہوتا ہے۔ تعلیمی انتظامیہ ان سب پر مشتمل ہوتی ہے۔ معلم اس انتظامیہ کے نمائندے کی حیثیت سے تعلیمی پالیسیوں کو عملاً نافذ کرتا ہے اور اپنی کارکردگی کے لیے اس کے سامنے جواب دہ ہے۔ معلم اور انتظامیہ کے باہمی تعلقات کے لیے ضروری ہے کہ معلم کو اپنی اس منصبی ذمے داری کا پورا شعور ہو۔

انتظامیہ میں صدر معلم سے استاد کا براہ راست واسطہ پڑتا ہے۔ صدر معلم مدرسے میں قائد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اکثر مدارس میں سب سے پرانے معلم کو صدر معلم کے ممد (Second Master) کا عہدہ دے دیا جاتا ہے۔ معلم کو چاہیے کہ صدر معلم اور ممد سے تعلقات کو خوشگوار رکھے۔ ان کے تفویض کردہ کاموں کو خندہ پیشانی اور خوش اسلوبی سے انجام دے۔ بعض اوقات سہولت کار کے لیے مدرسے کے بعض امور کسی خاص معلم کے سپرد کر دیے جاتے ہیں مثلاً کھیلوں کا انتظام، ادبی سرگرمیوں کی تنظیم یا امتحانات کا بندوبست۔ تمام معلمین کو چاہیے کہ وہ ایسے امور میں متعلقہ معلم سے پورا پورا تعاون کریں۔ انتظامی تعلقات میں کہیں اختلاف رائے ہو تو اسے وقار کا مسئلہ نہ بنائیں بلکہ متعلقہ تنظیم سے افہام و تفہیم کے ذریعے معاملے کو سلجھانے کی کوشش کریں۔ اپنی پسند ناپسند یا رائے پر اصرار کے بجائے مدرسے کے مشترکہ مقصد اور مفاد کو سامنے رکھیں۔

صدر معلم سے اوپر کی سطح کے منتظمین سے بالعموم معلمین کا براہ راست رابطہ نہیں ہوتا لیکن مدرسے کے معائنے کے دوران میں یا کبھی کبھی طلبی پر یا کسی کمیٹی کے اجلاس یا کانفرنس میں اعلیٰ انتظامی افسروں سے براہ راست رابطے کے مواقع بھی آتے رہتے ہیں۔ ان تمام موقعوں پر معلمین کو ان سے پورا پورا تعاون کرنا چاہیے۔ انہیں ضروری معلومات فراہم کرنے میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیے اور اپنی مخلصانہ آراء کے اظہار میں جھجک محسوس نہیں کرنی چاہیے اور ان تمام امور میں تعلیم کے اعلیٰ مقاصد ان کے پیش نظر رہنے چاہییں۔

معلم کے معاشرے سے تعلقات:

مدرسہ معاشرے کا ایک حصہ ہے اور تعلیم کا ایک بہت بڑا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کی معاشرتی نشو و نما میں مدد دی جائے اور انہیں سماجی بہبود کے لیے تیار کیا جائے۔ اس سے مدرسے اور معاشرے کے باہمی تعلقات کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ ان تعلقات کی استواری کی سب سے زیادہ ذمے داری معلم پر ہوتی ہے۔ طلبہ معاشرے اور مدرسے کے درمیان رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں اور طلبہ کا سب سے زیادہ رابطہ معلم سے ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں معلمین کو طلبہ کی وساطت کے بغیر براہ راست بھی معاشرے سے تعلق قائم کرنا چاہیے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں، جن میں سب سے معروف طریقہ انجمن اساتذہ و والدین کا قیام ہے۔ اس کے ذریعے معاشرے میں مدرسے سے براہ راست متعلق طبقے کا مدرسے سے رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس سے ایک طرف تو مقامی آبادی (Community) مدرسے کی کارکردگی اور تعلیم کی ترقی سے روشناس ہوتی رہتی ہے۔ دوسری طرف اساتذہ کو والدین سے ارتباط کے ذریعے بچوں کی ضروریات اور دلچسپیوں سے واقف ہونے کا موقع ملتا ہے۔

والدین اور معلمین کے باہمی تعلقات کی استواری کی بڑی مضبوط بنیاد موجود ہے اور وہ ہے بچوں کی بہبود۔ اس اعتبار سے معلمین کی ذمے داری ہے کہ والدین کو اس بارے میں مطمئن کریں کہ مدرسہ بچوں کی بہبود کے لیے سرگرم کار ہے۔ اس مقصد کے لیے والدین کو

ضروری معلومات فراہم کی جانی چاہییں۔ طلبہ کی پراگرس رپورٹوں سے بھی یہ کام لیا جا سکتا ہے بشرطیکہ انھیں صرف طالب علم کے امتحانی نتائج تک محدود نہ کیا جائے بلکہ مدرسے کی دیگر سرگرمیوں کی رپورٹ بھی اس میں شامل کی جائے۔ وقتاً فوقتاً مدرسے کو اپنی کارکردگی کی جامع رپورٹ شائع کرا کے مقامی آبادی میں تقسیم کرنی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اس کام میں عملاً سب سے زیادہ ذمے داری معلم کی ہوگی۔ معلمین کو اپنے طلبہ کے والدین سے ذاتی روابط بھی قائم کرنے چاہییں اور ان سے ملاقات کے ذریعے طلبہ کی بہتر تربیت کی تدابیر سوچنی چاہییں۔

مقامی آبادی سے تعلقات کے ذریعے معلم کو ایسے درد مند افراد دریافت کرنے چاہییں جو تعلیمی ترقی سے خاص دلچسپی رکھتے ہوں۔ ایسے افراد کو وقتاً فوقتاً مدرسے میں آنے کی دعوت دینی چاہیے اور انھیں اپنی جماعت کی نصابی سرگرمیوں کے دیکھنے کا موقع دینا چاہیے۔ ان سے اصلاح کی تجاویز طلب کرنی چاہییں اور ان پر باقاعدہ عمل کرنا چاہیے۔ یہی کام مدرسے کی سطح پر صدر معلم کو کرنا چاہیے۔

مقامی آبادی سے آگے نکل کر معلم کو پورے قومی معاشرے کو سامنے رکھنا چاہیے۔ ایک قومی کارکن کی حیثیت سے معلم کو چاہیے کہ انتہائی محنت اور خلوص کے ساتھ قوم کی نئی نسل کی تربیت کرے اور اپنے طرز عمل سے معاشرے کو یقین دلا دے کہ تعلیم پر جو قومی سرمایہ خرچ ہو رہا ہے وہ کسی مل یا فیکٹری پر خرچ ہونے والے سرمائے سے کہیں زیادہ نفع بخش ہے۔ اس کا یہ طرز عمل معاشرے میں اس کے اعلیٰ مقام کا ضامن بن جائے گا اور معاشرہ تعلیم میں مزید سرمایہ کاری کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔

معلم کا پیشہ ورانہ ضابطۂ اخلاق:

ضابطۂ اخلاق سے کسی پیشے سے متعلق وہ عملی اصول مراد لیے جاتے ہیں جو اس پیشے سے متعلق افراد کے فرائض، تعلقات اور طرز عمل کا معیار مقرر کرتے ہیں۔ ہر پیشے کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق ضروری

سمجھا جاتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا محرک تو یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک ذمے دار مخلوق بنایا ہے، اچھے اور برے کی تمیز عطا کی ہے اور اپنے انبیا کے ذریعے اچھائی اور برائی کو صاف صاف واضح کر دیا ہے۔ اس امر کا فطری تقاضا ہے کہ انسان اپنے طرز عمل میں اچھائی اختیار کرے اور برائی سے پرہیز کرے۔ پیشہ ورانہ امور میں بھی اخلاقی طرز عمل کے اصولوں کا پہلا سرچشمہ یہی ہے۔ دوسری بڑی بات یہ ہے کہ انسان وسیع معاشرے میں زندگی بسر کرتا ہے اور اس معاشرے کی بعض مخصوص ضروریات ہوتی ہیں۔ ضابطۂ اخلاق کا دوسرا سرچشمہ یہ ضروریات ہیں کیونکہ معاشرے کا رکن ہونے کی حیثیت سے کوئی بھی پیشہ ور انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ہی فرد کی اپنی بھی کچھ ضروریات ہوتی ہیں جن کی تسکین ضروری ہے۔ ضابطۂ اخلاق کا تیسرا سرچشمہ انفرادی ضروریات ہیں۔ اسلام نے انفرادی اور اجتماعی ضروریات کی صاف صاف نشاندہی کر دی ہے۔ پیشہ ورانہ ضروریات کو ان کی روشنی میں متعین کیا جا سکتا ہے کیونکہ ہر پیشے اور اس سے متعلق افراد کی کچھ مخصوص ضروریات بھی ہوتی ہیں۔

پیشہ ورانہ ضابطۂ اخلاق کے لیے درج ذیل خصوصیات کو ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ معلم کے پیشہ ورانہ ضابطۂ اخلاق کے سلسلے میں بھی انہیں پیش نظر رکھا جانا چاہیے۔

۱ - ضابطۂ اخلاق کی نوعیت انفرادی اور شخصی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اجتماعی اور عمومی اصول و ضوابط کے اطلاق کی ذمے داری سراسر فرد متعلقہ پر ہو۔ وہ جس عملی صورت حال سے دو چار ہو اس میں ضابطۂ اخلاق کی تعبیر کا حق اسی کو ہو۔

۲ - ضابطۂ اخلاق میں شخصی و پیشہ ورانہ اقدار کا خاکہ درج ہو۔ ان اقدار کو پُر اعتماد لہجے میں بیان کیا جائے تاکہ افراد متعلقہ انہیں اپنے لیے ناگزیر سمجھنے لگیں۔

۳ - ضابطہ اخلاق مشترکہ کام کا ایک خاکہ پیش کرے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں وہ تمام بنیادی اصول بیان کر دیے جائیں جن سے متعلقہ افراد کے باہمی اشتراک و تعاون کی حدود معلوم ہو سکیں ۔ مثلاً معلم کے ضابطۂ اخلاق میں معلمین کے باہمی تعلقات اور معلم کے منتظمین ، طلبہ ، والدین اور پورے معاشرے سے تعلقات کے اصول شامل ہونے چاہییں ۔

۴ - ضابطۂ اخلاق میں پیشہ ورانہ آزادی کی ضمانت ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اساتذہ کو اپنے پیشے کے متعلق نئے نئے تجربات کرنے اور اپنی تحقیق کے نتائجُ منظر عام پر لانے کی آزادی ہونی چاہیے ۔ انہیں اپنے علم و تجربے کی روشنی میں صورت حال کی مناسبت سے پیشہ ورانہ اصولوں کے انتخاب و اطلاق کی بھی آزادی ہونی چاہیے ۔

۵ - ضابطۂ اخلاق کی نوعیت عملی ہونی چاہیے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں محض مجرد اخلاق اصول ہی بیان نہیں ہونے چاہییں بلکہ ان اعمال و افعال کی بھی نشان دہی ہونی چاہیے ، جو ان اصولوں کا لازمی تقاضا ہیں ۔

۶ - ضابطۂ اخلاق میں پیشۂ تدریس سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کے لیے کشش ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اساتذہ کے فرائض کے ساتھ ساتھ ان کے لیے ترقی اور نشو و نما کے مواقع کی نشاندہی بھی کی جانی چاہیے ۔

۷ - ضابطۂ اخلاق میں معلم کے فرائض و حقوق کی حدود بیان کی جانی چاہییں ۔

۸ - ضابطۂ اخلاق میں پیشہ ورانہ طرز عمل کے ایسے معیار مقرر کیے جانے چاہییں جن پر عمل سے معلمین باہم متحد و منظم ہو سکیں اور انھیں اپنے پیشے سے دلی لگاؤ ہو جائے ۔

۹ - ضابطۂ اخلاق ایسا ہونا چاہیے جس کے حوالے سے عام لوگ پیشۂ تدریس کے مقاصد سے واقف ہو سکیں۔

۱۰ - ضابطۂ اخلاق میں پیشۂ تدریس سے متعلق ماہرین کے اس حق کا تحفظ ہونا چاہیے کہ وہ معاشرے میں تعلیمی قائد کی حیثیت سے موثر کردار ادا کر سکیں۔ اس میں نظام تعلیم کی تشکیل کے تمام پہلو شامل ہیں۔ مثلاً تعلیمی پالیسیوں اور پروگراموں کی تدوین، مقاصد تعلیم کی توضیح، نصاب تعلیم کی ترتیب، درسی کتب کی تصنیف یا منظوری، طریقہ ہائے تدریس کی تحقیق و استعمال، تدریسی معاونات کی تیاری، تربیت اساتذہ کے اداروں کی تنظیم، دوران ملازمت تربیت اساتذہ کا انتظام، طریقۂ امتحانات کا تعین اور نگرانی وغیرہ۔

۱۱ - ضابطۂ اخلاق میں ملک کے اساسی فلسفۂ حیات یعنی نظریۂ پاکستان کو بنیادی حیثیت دی جانی چاہیے۔

پاکستانی معلمین کے لیے ضابطۂ اخلاق کا خاکہ:

پاکستان میں معلمین کا کوئی مدوّن ضابطۂ اخلاق نافذ نہیں۔ پیشۂ تدریس کی حیثیت کا تقاضا ہے کہ معلمین کے لیے ایک مشترکہ ضابطۂ اخلاق مرتب کیا جائے اور اسے نافذ کیا جائے۔ ادارۂ تعلیم و تحقیق کے طلبہ نے اس مسئلے پر تحقیق کے بعد پاکستان میں معلمین کے ضابطۂ اخلاق کی ضرورت و اہمیت واضح کی ہے۔ اس سلسلے میں ماہرین تعلیم، وکیلوں، صحافیوں، ڈاکٹروں، تاجروں اور صنعت کاروں میں ایک سوال نامہ تقسیم کیا گیا جس کے جواب میں ۹۹ فی صد لوگوں نے ضابطۂ اخلاق کی ضرورت سے اتفاق کیا۔

اس کے بعد ۱۹۶۷ء میں ادارۂ تعلیم و تحقیق کے تعلیم یافتہ افراد کی تنظیم انجمن فاضلین نے پاکستانی معلمین کے لیے ضابطۂ اخلاق کا ایک مسودہ اخبارات میں شائع کیا اور اس کی نقول پاکستان کی مختلف اساتذہ تنظیموں کو ارسال کیں۔ لیکن اساتذہ تنظیموں کی عدم دلچسپی

کی وجہ سے اس ضابطۂ اخلاق کو ابھی تک آخری شکل نہیں دی جا سکی - بہر حال اوپر جو اصول بیان کیے گئے ہیں انھیں سامنے رکھتے ہوئے ضابطۂ اخلاق کا ایک خاکہ تیار کیا جا سکتا ہے جس میں درج ذیل نکات شامل ہونے چاہییں -

۱ - معلم کو پیشہ ورانہ اعتماد کی فضا قائم کرنی چاہیے - اس کا مطلب یہ ہے کہ طلبہ، معلمین اور نظم و نسق مدرسہ سے متعلق امور کو کسی غیر متعلق شخص سے زیر بحث نہیں لانا چاہیے -

۲ - معلم کو اپنے رفقائے کار کے متعلق نکتہ چینی اور عیب جوئی سے اجتناب کرنا چاہیے اور ان کے متعلق گفتگو کے سلسلے میں انتہائی احتیاط برتنی چاہیے -

۳ - معلم مدرسے کی پالیسی اور لائحۂ عمل کے متعلق براہ راست اپنے رفقاء اور صدر معلم سے بات کرے اور صدر معلم کی اجازت کے بغیر اعلیٰ انتظامی افسروں سے غیر ضروری رابطہ نہ رکھے -

۴ - معلم کو اپنی شرائط ملازمت کی پوری پابندی کرنی چاہیے -

۵ - معلم کو اپنے طلبہ کو ٹیوشن پڑھنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے -

۶ - معلم کو مدرسے کے امور میں سیاسی اثر و رسوخ کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہیے -

۷ - معلم کو چاہیے کہ ایسی کسی آسامی کے لیے درخواست نہ دے جس پر کوئی دوسرا معلم کام کر رہا ہو البتہ اگر وہ آسامی خالی ہو رہی ہو تو درخواست دے سکتا ہے -

۸ - معلم کو چاہیے کہ مدرسے کو گروہی سیاست اور فرقہ وارانہ اختلافات کا اکھاڑا نہ بنائے -

- معلم کو کسی درسی کتاب یا تدریسی مواد کی منظوری وغیرہ کے سلسلے میں کوئی معاوضہ یا تحفہ قبول نہیں کرنا چاہیے -

۱۰- معلم کو چاہیے کہ اس اعتماد کو حتی الامکان قائم رکھے جو طلبہ کو اس پر ہوتا ہے۔ جب تک طلبہ کے مفاد یا مفاد عامہ کا تقاضا نہ ہو طلبہ کے متعلق معلومات کو صیغہ راز میں رکھنا چاہیے۔

۱۱- معلم کو مسلسل پیشہ ورانہ نشو و نما کی کوشش کرتے رہنا چاہیے اور اپنے طرز عمل سے پیشہ تدریس کو نوجوانوں کے لیے پر کشش بنانے اور اس کے معاشرتی وقار کو بلند کرنے کے لیے حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔

۱۲- معلم کو چاہیے کہ طبقہ معلمین کے حقوق کا احترام کرے اور ان کے تحفظ کی پوری پوری کوشش کرے۔

۱۳- معلم کو چاہیے کہ عام افراد معاشرہ، طلبہ کے والدین اور سرپرستوں، رفقائے کار، طلبہ اور منتظمین سے پورا پورا تعاون کرے۔

۱۴- معلم کا فرض ہے کہ پاکستان کے اساسی نظریے یعنی اسلامی نظریہ حیات کے تحفظ و استحکام کی پوری پوری کوشش کرے اور طلبہ کو اسلامی جمہوری معاشرے کے ذمے دار شہریوں کی حیثیت سے تربیت دے۔

ضابطہ اخلاق کا نفاذ اور تنظیم اساتذہ:

ضابطہ اخلاق کی تیاری کے بعد اس کے نفاذ کا مسئلہ درپیش ہوگا۔ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ اساتذہ کی کل پاکستان پیشہ ورانہ تنظیم قائم کی جائے۔ اس کی ایک اپنی عدالت اخلاق ہو جو ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف مناسب کارروائی کرے۔ ضروری ہو تو ان کے پیشہ تدریس سے اخراج کی سفارش کرے اور معلم کے طور سے ان کی ملازمت کے مواقع ختم کر دے۔ ایک دوسری رائے یہ ہے کہ ضابطہ اخلاق کو ایک قانونی دستاویز نہیں بننے دینا چاہیے بلکہ اسے معلمین کے دل و دماغ اور روح کے لیے ایک موثر

پیغام کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے جسے وہ اپنے پیشے سے محبت کی بنا پر نظر انداز نہ کر سکیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طاقت کے بجائے ترغیب کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ دراصل یہ دونوں طریقے ایک دوسرے سے متضاد نہیں بلکہ ایک دوسرے کے ممد ہو سکتے ہیں۔ معلمین کی اپنی غیر سرکاری تنظیم کے ذریعے سے ضابطۂ اخلاق کے نفاذ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ضابطۂ اخلاق ایک قانونی دستاویز بن جائے گا۔ بلکہ یہ معلمین کے رضاکارانہ اخلاق طرز عمل کا نشان ہوگا۔ چنانچہ ترقی یافتہ جمہوری ممالک میں معلمین کے ضابطۂ اخلاق کے نفاذ کا ذریعہ اساتذہ کی تنظیمیں ہی ہیں۔

دراصل پیشے کی خصوصیات میں یہ بات شامل ہے کہ اس سے متعلق کارکنوں کی اپنی پیشہ ورانہ تنظیم ہو۔ مغربی ممالک میں جوں جوں معلمی کو پیشے کی حیثیت حاصل ہوتی گئی، معلمین کی پیشہ ورانہ تنظیمیں ظہور میں آتی گئیں۔ حتیٰ کہ اب اکثر جمہوری ممالک میں مختلف مضامین کے معلمین کی اپنی اپنی انجمنیں ہیں جو علاقائی، صوبائی اور قومی سطح پر منظم ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ تمام معلمین کی ایک مشترکہ انجمن ہوتی ہے جو قومی سطح پر قائم ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے دور عروج میں ہر پیشے سے متعلق کارکن اپنی انجمنیں قائم کرتے تھے جنھیں ''نقابات'' کہا جاتا تھا۔ معلمین کی بھی ایسی انجمنیں ہوتی تھیں جو ان کے حقوق کے تحفظ اور تعلیمی امور کی نگرانی کی ذمے دار ہوتی تھیں۔ دور حاضر کے ایک مشہور مسلمان محقق ڈاکٹر احمد شلبی نے تحقیق کے بعد ایسے شواہد پیش کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دور عروج میں معلمین کے تقرر اور معزولی تک کے اختیارات ان کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔

پاکستان میں معلمین کے ضابطۂ اخلاق کے نفاذ اور معلمین کے پیشہ ورانہ شعور کی نشو و نما کے لیے ضروری ہے کہ پیشہ ورانہ بنیادوں پر معلمین کی تنظیمیں قائم ہوں جو ایک قومی انجمن اساتذہ کا حصہ ہوں۔ آج کل معلمین کی جو انجمنیں

قائم ہیں ان میں بہت کم ایسی ہیں جنھیں صحیح معنوں میں پیشہ ورانہ تنظیمیں کہا جا سکتا ہے - اکثر انجمنوں کا طریق کار ٹریڈ یونینوں والا ہے حالانکہ تدریس کوئی ٹریڈ یا محض روزی کمانے کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک پیشہ ہے - ٹریڈ یونین کے انداز میں کام کرنے والی انجمنوں سے معلمین میں پیشہ ورانہ شعور پیدا نہیں کیا جا سکتا نہ ہی ان سے کسی اخلاق شعور کی تخلیق ہو سکتی ہے - حکومت بھی ایسی انجمنوں سے بہت زیادہ ہمدردی کا برتاؤ نہیں کر سکتی - جہاں تک معلمین کی پیشہ ورانہ انجمنوں کا تعلق ہے پاکستان کے قومی تعلیمی کمیشن نے 1959ء میں اس بات کی سفارش کی تھی کہ ایسی انجمنوں سے معلمین کے حقوق کے تحفظ کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور ان کی پیشہ ورانہ نشوونما بھی ہو سکتی ہے، جس میں معیاری اخلاق اصولوں کے مطابق ان کے طرز عمل کی تشکیل بھی شامل ہے -

سوالات

۱ - دلائل سے ثابت کیجیے کہ تدریس ایک پیشہ ہے -

۲ - معلم کے پیشہ ورانہ تعلقات کی نشان دہی کیجیے اور ہر ایک کی اہمیت بیان کیجیے -

۳ - پیشہ ورانہ ضابطۂ اخلاق سے کیا مراد ہے ؟ ایک اچھے ضابطۂ اخلاق کے لیے کون کون سی خصوصیات ضروری ہیں ؟

۴ - معلم کے پیشہ ورانہ تعلقات میں ہر ایک کے متعلق چند ایسے نکات بیان کیجیے جنھیں پاکستانی اساتذہ کے ضابطۂ اخلاق میں شامل کیا جا سکے -

۵ - تنظیم اساتذہ کی پیشہ ورانہ اہمیت پر مختصر نوٹ لکھیے -

۶ - ضابطۂ اخلاق کو ایک قانونی دستاویز نہیں بننے دینا چاہیے - بحث کیجیے -

تیرھواں باب

ضبط مدرسہ

ضبط کا مفہوم :

تعلیم و تعلّم کے سلسلے میں ضبط (Discipline) کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ آپ نے اکثر اس قسم کی باتیں سنی ہوں گی کہ آج کل طلبہ میں ڈسپلن کی بڑی کمی ہے۔ فلاں استاد کی جماعت کا ڈسپلن ناقص ہے، فلاں استاد ڈسپلن قائم کرنے میں ماہر ہے۔ اس قسم کے تمام تبصروں میں ''ڈسپلن'' سے طلبہ کی ایسی حالت مراد لی جاتی ہے کہ وہ استاد کے بالکل قابو میں ہوں اور ان کی ایک ایک حرکت استاد کے اشاروں کی پابند ہو۔ ڈسپلن کے اس روائتی مفہوم کے مطابق امن و امان کو سکول کے اولین قانون کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ استاد کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کو امن و امان پر مجبور کرے اور طلبہ کا اولین فریضہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ استاد کا حکم مانیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور سے ڈسپلن کو استاد کے خوف کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ فلاں استاد نرم دل ہے لہٰذا فلاں جماعت میں ڈسپلن ناقص ہوتا ہے اور فلاں استاد کی سختی کی وجہ سے اسی جماعت میں ڈسپلن درست ہوتا ہے۔ ڈسپلن کا یہ تصور انتہائی ناقص ہے۔

ڈسپلن (Discipline) کا لفظ لاطینی لفظ (Discipulus) سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی ہیں شاگرد یا چیلا۔ جبکہ ڈسپلن کے لفظی معنی متعین قواعد کے مطابق زندگی گذارنا ہیں۔ اردو فارسی اور عربی میں ڈسپلن کے لیے ضبط کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جس کے لفظی معنی ہیں پوری توجہ سے کسی چیز کی حفاظت کرنا۔ اصطلاحی معنوں میں ضبط سے مراد طالب علم کی وہ تربیتی حالت ہے جو اسے اس کے وسیع تر مقاصد حیات سے ہم آہنگ کر دے اور بے ضبطی (Indiscipline) سے مراد

ایسی حالت ہوگی جو مقاصد حیات کے کلی یا جزوی زیاں کا باعث ہو -
گویا ضبط ، مقاصد حیات اور مقاصد تعلیم کی حفاظت کے بنیادی اصولوں
کا نام ہے -

ضبط کی اہمیت و ضرورت :

ضبط کے مفہوم سے اس کی اہمیت و ضرورت واضح ہو جاتی ہے -
ضبط کے طریق کار میں ماہرین تعلیم کی آرا مختلف ہیں لیکن اس کی
اہمیت و ضرورت کے بارے میں سب متفق ہیں - بعض ماہرین کے
نزدیک تعلیم و تدریس میں ضبط کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ فوج
میں - دراصل کوئی بھی گروہ یا جماعت ضبط کے بغیر قائم نہیں رہ
سکتی - ہر گروہ یا جماعت متعدد افراد پر مشتمل ہوتی ہے -
ان افراد کے باہمی تعلقات اور فرائض و حقوق کا تحفظ مناسب قواعد و
ضوابط کا تقاضا کرتا ہے - چنانچہ ہر ادارے ، انجمن اور تنظیم کے کچھ
قواعد و ضوابط ہوتے ہیں جو متعلقہ افراد سے خاص قسم کے طرز عمل
کا تقاضا کرتے ہیں - قومی سطح پر ملکی قوانین کی یہی حیثیت ہوتی
ہے -

مدرسہ ایک معاشرتی ادارہ ہے - اس میں افراد کی ایک بہت بڑی
تعداد شامل ہوتی ہے - ان افراد کے باہمی تعلقات اور حقوق و فرائض
کی حدود متعین کرنا بہت ضروری ہے - اس مقصد کے لیے تمام متعلقہ
افراد کے انفرادی اور اجتماعی مقاصد میں ہم آہنگی ضروری ہے - ضبط
مدرسہ کا مقصد یہی ہے - اس سلسلے میں یہ امر پیش نظر رکھنا ضروری ہے
کہ مدرسہ معاشرے کا ایک حصہ ہے لہذا ضروری ہے کہ مدرسے کے
مقاصد اور معاشرے کے مقاصد میں مطابقت کا خیال رکھا جائے اور اسی
کے مطابق ضبط کے طریقے اختیار کیے جائیں - غرضیکہ ضبط کا مقصد یہ
ہونا چاہیے کہ بچوں میں ایسی عادات و خصائل کو راسخ کر دیا
جائے جنھیں معاشرے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے - اس کے ساتھ
ساتھ بچوں کی فطری ضروریات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے -

ضبط کے جدید مفہوم کی رو سے اس کے تین بڑے مقاصد ہیں :

(الف) مدرسے کی منظم ترقی کے لیے ضروری حالات فراہم کرنا ۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ طلبہ میں شعور اجتماعیت ، جذبہ تعاون اور احساس ذمہ داری اور اساتذہ میں دانشمندانہ جذبہ ہمدردی موجود ہو ۔

(ب) طلبہ کو ایک بالغ شہری کی حیثیت سے موثر کردار کے لیے تیار کرنا ۔ طلبہ کو مختلف طریقوں سے آزادانہ طرز عمل کے مواقع فراہم کیے جائیں لیکن ساتھ ہی ایسے مواقع جن ذمے داریوں کا تقاضا کرتے ہیں ان میں ان کی وضاحت بھی کر دی جائے تا کہ فرض اور آزادی میں توازن قائم رہے اور طلبہ آزادی کو معاشرے کی بہبود کے لیے استعمال کرنے کی تربیت حاصل کر لیں ۔

(ج) طلبہ میں ضبط دروں (Self Discipline) کی صفت پیدا کرنا ۔ طلبہ پر فوری مفادات کے مقابلے میں دور کے مقاصد کی اہمیت واضح کی جائے ۔ انھیں جہد مسلسل اور استقلال و استقامت کی قدر و قیمت کا شعور دلایا جائے تا کہ وہ بتدریج ضبط دروں کی تربیت حاصل کر لیں ۔

ضبط کی اقسام :

تعلیمی دنیا میں عام طور سے تین قسم کا ضبط رائج رہا ہے ۔ اول خارجی ضبط ، دوم آزادانہ ضبط ، سوم سماجی ضبط ۔ ان میں سے ہر ایک کی مختصر وضاحت حسب ذیل ہے :

خارجی ضبط :

خارجی ضبط قدیم مدارس میں سب سے زیادہ رائج رہا ہے ۔ اس کی تہہ میں تعلیم کا یہ تصور کار فرما تھا کہ استاد کا کام بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا اور متعلقہ معلومات فراہم کرنا ہے ۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ طلبہ استاد کے سامنے خاموش بیٹھے ہوں تا کہ وہ سکون و

اطمینان سے اپنا کام کر سکے ۔ عام طور سے سکون و اطمینان کی یہ فضا ڈنڈے کے زور سے پیدا کی جاتی تھی ۔ گویا خارجی ضبط سے مراد ضبط کی وہ حالت ہے جو طلبہ کے دلوں پر استاد کا خوف طاری کر کے پیدا کی جاتی تھی ۔ ضبط کے اس طریقے میں طلبہ کے جوش و جذبے اور دلچسپیوں کو بالکل دبا دیا جاتا تھا ۔

دراصل خارجی ضبط کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ میں اطاعت مطلق کی صفت پیدا کی جائے ۔ ضبط کا یہ طریقہ آمرانہ معاشروں کی ضرورت کے عین مطابق ہے ۔ جدید جمہوری دور سے قبل مطلق العنان بادشاہوں کا زمانہ تھا جو رعایا سے بے چون و چرا اطاعت کا مطالبہ کرتے تھے ۔ مدارس نے معاشرے کی اس ضرورت کے مطابق ، ضبط کا طریقہ اختیار کیا ۔ چنانچہ اس طریقے کے تحت تربیت پانے والے طلبہ بڑے ہو کر آمرانہ معاشروں کے فرماں بردار شہری ثابت ہوتے تھے ۔ اس طریقہ ضبط میں استاد بادشاہ کی طرح سے حاکم مطلق کی حیثیت رکھتا تھا اور طلبہ پر اس کی اطاعت فرض ہوتی تھی ۔ مطلق العنان بادشاہوں کی طرح وہ طلبہ کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لیے ہر قسم کی سزا دینے کا مجاز تھا ۔

قدیم و جدید کی بحث سے بالاتر ہو کر دیکھا جائے تو آج کل بھی آمرانہ معاشروں کے تعلیمی اداروں میں ایسے ہی ضبط کی ضرورت ہے ۔ اگر اشتراکی ممالک کے مدرسے طلبہ کو جمہوری تربیت دینے لگ جائیں تو ایسے طلبہ بڑے ہو کر خود اشتراکی نظام کے غیر جمہوری بندھنوں ہی کے خلاف بغاوت کر دیں گے ۔

خارجی ضبط کی خامیاں :

خارجی ضبط سے بظاہر کمرۂ جماعت اور مدرسے میں ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں استاد سکون کے ساتھ تدریس کر سکتا ہے لیکن تعلیم و تدریس کے صحیح مفہوم کی رو سے اس طریقۂ ضبط میں درج ذیل خامیاں ہیں :

۱ - یہ طریقہ بچوں کی فطرت کے خلاف ہے - بچے زندگی کے جوش اور ولولے سے پُر ہوتے ہیں۔ یہ ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما کا زمانہ ہوتا ہے - آمرانہ فضا میں ڈر اور خوف کے زیر اثر انہیں بے حس و حرکت بنا کر سیکھنے پر مجبور کرنا ان صلاحیتوں کی نشو و نما کو روک دیتا ہے -

۲ - اس طریقہء ضبط کی نوعیت منفی ہے - اس میں طلبہ پر یہ زور دیا جاتا ہے کہ ''یہ نہ کرو ، وہ نہ کرو''۔اس سے فعالیت کی نفی ہوتی ہے - اس طریقے کے مسلسل استعمال سے بالآخر طلبہ میں انفعالیت یا بے عملی (Passivity) پیدا ہو جاتی ہے جو انسانی کردار کے لیے انتہائی خطرناک ہے -

۳ - اس طریقہء ضبط کی منفی نوعیت کی وجہ سے طلبہ کی طرف سے بعض اوقات نفسیاتی رد عمل کا اظہار بھی ہوتا ہے - یہ رد عمل باغیانہ ہوتا ہے لہذا ایسے طلبہ کو سزا سے واسطہ پڑتا ہے - سزا کا اثر یہ ہوتا ہے کہ یا تو بچہ مدرسے سے بھاگ جاتا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تعلیم سے متنفر ہو جاتا ہے یا سزا کے خوف سے بغاوت ترک کر دیتا ہے اور اس کے دل میں استاد کے خلاف نفرت کا مستقل جذبہ پیدا ہو جاتا ہے -

۴ - اس طریقہء ضبط میں خوف و ہراس بنیادی کردار ادا کرتا ہے - خوف و ہراس بزدلی کی جڑ ہے - اس سے بچوں میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے جس سے غلامانہ ذہنیت جنم لیتی ہے - علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ تو خوف کو تمام برائیوں کی جڑ قرار دیتے ہیں - اور فرماتے ہیں کہ کلمہ توحید کا صحیح مطلب سمجھ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شرک دراصل خوف سے جنم لیتا ہے -

ہر کہ رمز لا الہ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

۵ - اس طریقہء ضبط سے بچوں میں جدت، اختراع اور تخلیق کی صلاحیتیں

ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ وہ شروع ہی سے اُستاد کے احکام کی بے چون و چرا پابندی کے عادی ہو جاتے ہیں اور اپنے دماغ سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں ۔

۶ - اس طریقۂ ضبط میں اُستاد بچوں کی خامیوں کی جستجو میں رہتا ہے۔ اسے تدریسی عمل سے زیادہ اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ کہیں کوئی طالب علم ضبط کی روائتی فضا کے خلاف کوئی حرکت تو نہیں کر رہا ۔

بحیثیت مجموعی خارجی طریقۂ ضبط اجتماعیت پرست تصور تعلیم پر مبنی ہے جس میں بچے کی انفرادی ضروریات کو کوئی حیثیت نہیں دی جاتی ۔

آزادانہ ضبط :

آزادانہ ضبط کا طریقہ خارجی ضبط کے بالکل برعکس ہے۔ یہ انفرادیت پسند تصور تعلیم کا نتیجہ ہے جس میں فرد کی کامل آزادی کو بنیادی حیثیت دی جاتی ہے ۔ گویا آزادانہ ضبط کا طریقہ طلبہ پر قواعد و ضوابط کی رسمی پابندیاں عائد کرنے کا قائل نہیں ۔ اس طریقے کے حامی اس بات کے قائل ہیں کہ آزادانہ فضا میں بچے خود بخود اپنی صلاحیتوں کی نشو و نما کر لیتے ہیں ۔ چونکہ تعلیم و تدریس اور نظم و ضبط کا مقصد یہی ہے لہٰذا آزادانہ ضبط ہی بچوں کی صحیح نشو و نما کا باعث بن سکتا ہے ۔

اس طریقۂ ضبط میں بچے اپنی فطری پسند اور میلان طبع کے مطابق مشاغل کا انتخاب کرتے ہیں اور ہر مشغلے کے لیے وقت کا تعین بھی خود کرتے ہیں ۔ اُستاد کی حیثیت محض ایک مشیر کی ہوتی ہے جو بچے کی آزادی میں خلل انداز نہیں ہو سکتا ۔

آزادانہ ضبط کی خامیاں :

یہ طریقۂ ضبط بچوں کی غیر محدود آزادی کا حامی ہے جس سے بالآخر انارکی یعنی انتشار اور بدنظمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے ۔ اس کی

اہم خامیاں درج ذیل ہیں :

۱ - یہ طریقۂ ضبط بچوں میں خود غرضی ، خود پسندی ، خود آرائی اور لا ابالے پن کو پروان چڑھاتا ہے - بچے پابندیٔ قانون کو آزادی کے منافی سمجھنے لگتے ہیں - مدارس میں لا قانونیت کی فضا پیدا ہو جاتی ہے اور بچوں میں مجرمانہ ذہنیت پیدا ہونے لگتی ہے -

۲ - یہ طریقہ نفسیاتی اصولوں کے خلاف ہے - بچہ فطرتاً متضاد صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے - اس میں خیر اور شر دونوں قوتیں موجود ہوتی ہیں - اسے آزاد چھوڑ دینے کا مطلب یہ ہے کہ بچے کو ایک مسلسل کشمکش میں مبتلا کر دیا جائے ، جس کے نتیجے میں شر کی قوتوں کے فروغ کے بھی اتنے ہی امکانات ہیں جتنے کہ خیر کی قوتوں کے بچے کی فطرت کا دوسرا پہلو اس کی کمزوری ہے - وہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہے - اسے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے لیے کیا مفید ہے اور کیا غیر مفید - لہٰذا اس کی فطرت متقاضی ہے کہ اسے ایسے عوامل سے محفوظ رکھا جائے جو اس کی شخصیت کے لیے مضر ہوں - یہ بات غیر محدود آزادی کی فضا میں ناممکن ہے -

سماجی ضبط :

سماجی ضبط کا تصور جدید جمہوری روایات کی پیداوار ہے - اس تصور کے مطابق بچے کی زندگی کے دو پہلو ہیں : ایک انفرادی دوسرا اجتماعی یا سماجی - دونوں باہم مربوط اور لازم و ملزوم ہیں - ہر بچہ اپنی انفرادی حیثیت کے ساتھ ساتھ سماج یا معاشرے کا جز بھی ہے - فرد اور معاشرہ دونوں کا وجود ایک دوسرے پر منحصر ہے - گویا اس تصور کے تحت تعلیم و تدریس اور نظم و ضبط کے سلسلے میں فرد اور معاشرے دونوں کی ضروریات اور تقاضوں کا خیال رکھنا ضروری ہے - اس طرح خارجی ضبط اور آزادانہ ضبط کے انتہا پسندانہ طریقوں کے مابین

ایک ایسا طریقۂ ضبط اختیار کیا جاتا ہے کہ بچے مشترکہ سماجی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کریں اور ان کی نشو و نما کریں۔

سماجی ضبط کے نقطۂ نظر سے مدرسے کو ایک چھوٹے سے جمہوری سماج کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ بچے کی مدرسی زندگی میں ذہنی، جسمانی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی فعالیتوں کا انتظام اس طرح کیا جاتا ہے کہ بچوں کو اپنے ہم جولیوں کے ساتھ اشتراک عمل کی ضرورت محسوس ہو۔ اس اشتراک عمل کا جو تعلق ان کی شخصی نشو و نما سے ہے اس کی وضاحت بھی کی جاتی ہے اور مشترکہ مقصد کے حصول میں اس کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے۔ اس طریقۂ ضبط میں بچوں کو فعالیتوں کے انتخاب اور ان کے قواعد و ضوابط خود مرتب کرنے کی آزادای بھی دی جاتی ہے لیکن وہ یہ سب کچھ دوسروں کے ساتھ مل کر کرتے ہیں لہٰذا ان میں باہمی اخوت و محبت اور ایثار و تعاون کے جذبات فروغ پاتے ہیں۔

اسلام اپنے اجتماعی مزاج کی وجہ سے آزادانہ ضبط کا قائل نہیں اور اپنے جمہوری مزاج کی وجہ سے خارجی ضبط کے بھی خلاف ہے۔ اسلام دراصل ضبط دروں یا ضبط نفس (Self-Discipline) کا قائل ہے اور اس کے لیے آزادانہ ضبط اور خارجی ضبط کے طریقوں کے بجائے سماجی ضبط کا طریقہ اپناتا ہے۔

سماجی ضبط کے اصول:

۱ - مدرسے میں اخلاقی فضا پیدا کی جائے۔ بچہ مدرسے میں داخل ہوگا تو شعوری طور سے اس اخلاقی فضا سے متاثر ہوگا۔ مدرسے کے اخلاقی معیار کو قبول کرے گا اور رفتہ رفتہ اس کے اخلاقی رنگ کو جذب کرنے لگے گا۔

۲ - طلبہ میں ایسا اجتماعی شعور پیدا کیا جائے کہ وہ مدرسے کو اپنا سمجھنے لگیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے ساتھی طلبہ کو

اپنا رقیب اور مد مقابل سمجھنے کے بجائے مشترکہ مقصد کے حصول کے لیے انھیں اپنا معاون و مددگار سمجھیں گے اور مدرسے کی عمارت اور ساز و سامان کی ذاتی اموال کی طرح حفاظت کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی مدرسے کی نیک نامی کے لیے ان میں ذوق و شوق سے کام کرنے کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔

۳۔ طلبہ میں احساس ذمہ داری پیدا کیا جائے۔ سماجی امور میں مشترکہ ذمے داری کے تصور سے بعض اوقات کام کو ایک دوسرے پر ٹال دینے کا رجحان فروغ پاتا ہے۔ اس کے تدارک کے لیے ضروری ہے کہ طلبہ میں انفرادی ذمے داری کا احساس پیدا کیا جائے۔ اس سلسلے میں اسلام کا یہ نقطہ نظر سب سے زیادہ مفید ہو سکتا ہے کہ اجتماعی معاملات میں بھی ہر فرد اپنی اپنی استطاعت کے مطابق شرکت کا ذمے دار ہے۔ اگر کوتاہی کرے گا تو گناہ گار ہوگا۔ ذمے داری کے اس احساس سے مدرسے کی سماجی فضا میں تمام افراد کی شرکت کا انتظام ہو جائے گا اور یہ شرکت مثبت اور مفید ہو گی۔

۴۔ اساتذہ اپنے عمل سے ضبط کا نمونہ پیش کریں۔ ضبط قائم کرنے کے لیے استاد کے شخصی اثر کو دور جدید کے مغربی مفکرین کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتے بلکہ بعض اوقات اسے خارجی ضبط کا لازمہ قرار دے کر بالکل مسترد کر دیا جاتا ہے۔ تعلّم کے مفہوم کو سامنے رکھیں تو استاد کو نظر انداز کرنے کا یہ رجحان بالکل بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے استاد کی شخصیت طالب علم کے ضبط پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"طالب علم کو اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی تربیت دی جائے اور یہ تربیت استاد اپنے اعمال سے دے سکتا ہے۔ استاد کے لیے ضروری ہے کہ اپنے علم کے مطابق عمل بھی کرے۔ اگر اس کا عمل اس کے علم کے خلاف ہوگا تو طالب علم کو اس سے ہدایت نہ ہوگی۔

اگر ایک شخص خود ایک کام کو کرے اور دوسروں کو کہے کہ وہ ایسا نہ کریں تو لوگ اس کا تمسخر اڑائیں گے"۔

امام غزالیؒ کے اس قول میں ضبط کا بڑا جامع تصور پیش کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں استاد کے کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔

ضبط دروں :

اس باب کے شروع میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ ضبط کا ایک بہت بڑا مقصد یہ ہے کہ طلبہ میں بتدریج ضبط دروں یا ضبط نفس کی صفت پیدا کی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طالب علم کسی خارجی دباؤ یا سماجی اثر کے بغیر خود بخود صحیح طرز عمل اختیار کرے اور برے طرز عمل سے پرہیز کرے۔ جدید ماہرین نفسیات ضبط دروں کے علاوہ ضبط کی ہر قسم کو ناقص سمجھتے ہیں۔ تاہم ضبط دروں کے حصول کا کوئی معیاری طریقہ ابھی تک پیش نہیں کیا جا سکا۔ اس سلسلے میں اسلام کا نظام عقائد و عبادات ہماری مدد کرتا ہے۔ علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسلامی شریعت پر عمل کرنے سے انسان روحانی طور سے ترقی کرتا ہے اور خدا کے وجود اور اس کی (وحدانیت) کا صدق دل سے قائل ہو جاتا ہے۔ صحیح عقیدہ اس کے دل میں جگہ کر لیتا ہے اور اس کا ہر عمل اس اعتقاد کے تابع ہو جاتا ہے جو اسے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے۔ گویا صحیح اعتقاد کا پیدا کیا ہوا ضبط صراط مستقیم سے بھٹکنے نہیں دیتا۔ اسلامی عبادات میں ضبط دروں کی ایک واضح مثال روزہ ہے۔ روزہ دار کی حالت پر غور کریں کہ سخت بھوک پیاس کی حالت میں تنہا غسل خانے میں نہا رہا ہوتا ہے لیکن اس بات کی پوری احتیاط کرتا ہے کہ کہیں پانی کا کوئی قطرہ حلق سے نیچے نہ اتر جائے۔ حالانکہ وہاں نہ کسی کا شخصی اثر ہوتا ہے نہ کوئی معاشرتی دباؤ۔ ظاہر ہے کہ ضبط دروں کی یہ کیفیات محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے تصور سے حاصل ہو سکتی ہے جس کی بنیاد عقیدے اور ایمان پر ہے۔

تربیت ضبط کے لیے موزوں مشاغل کی ضرورت محتاج بیان نہیں۔ مدرسے کے پروگرام کی تشکیل میں ایسے مشاغل اور فعالیتوں کا انتخاب اور تنظیم ایک اہم مسئلہ ہے۔ اسلام کے نظام عبادات میں با جماعت نماز ایک ایسی فعالیت ہے جس سے ضبط کی عملی تربیت ہوتی ہے۔ نماز کے ایک ایک عمل میں نمازیوں کا پورے اہتمام اور توجہ سے امام کی پیروی کرنا اور روزانہ پانچ دفعہ اس کی مشق سے عملی ضبط کا پہلو بخوبی واضح ہوتا ہے۔ 1948ء کا ذکر ہے کہ بھارت کے فلسفی گورنر جنرل راج گوپال اچاریہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ گئے تو یونیورسٹی کے طلبہ نے انھیں گارڈ آف آنر پیش کیا۔ یہ گارڈ آف آنر اتنا شاندار تھا کہ گورنر جنرل کے ملٹری سیکرٹری نے دریافت کیا کہ ان طلبہ نے کتنی مدت کی فوجی تربیت حاصل کی ہے۔ جب اسے بتایا گیا کہ انھیں صرف دو ہفتے تربیت دی گئی ہے تو اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ صرف دو ہفتے کی تربیت کے بعد اس قسم کا مظاہرہ صرف مسلمان نوجوان ہی کر سکتے ہیں کیونکہ ان کی نماز انھیں ضبط سکھاتی ہے۔

ضبط کے محرکات :

اوپر کی بحث سے آپ ضبط کے محرکات معلوم کر سکتے ہیں۔ ان کا مختصر بیان درج ذیل ہے :

(۱) جذبۂ خوف :

استاد یا منتظمین مدرسہ کی ناراضی کے خوف اور سزا کے ڈر کو ضبط کے ایک بڑے محرک کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ خارجی ضبط کا تو سارا انحصار ہی اس پر ہوتا ہے۔ ضبط کا جدید تصور سزا کو ضبط کا ذریعہ قرار دینے کے منافی ہے۔ تاہم تعلیم و تدریس کے سلسلے میں سزا سے کلی اجتناب کا نظریہ ماہرین میں محل اختلاف ہے۔ اس مسئلے کی اہمیت کی وجہ سے اس باب کے آخر میں "سزا اور ضبط" کے عنوان سے اس پر ذرا تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

(۲) جذبہ احترام :

استاد کے احترام کا جذبہ بھی ضبط کا بہت بڑا محرک ہے ۔ مغربی ماہرین تعلیم اس محرک کو عام طور سے نظر انداز کرتے ہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مشرقی روایات کی وجہ سے ہمارے مدارس میں آج بھی ضبط کا بہت بڑا محرک یہی جذبہ احترام ہے ۔ اسلامی نقطۂ نظر سے استاد کا مرتبہ بہت بلند ہے ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے مجھے ایک لفظ بھی سکھا دیا میں اس کا غلام ہوں ، وہ چاہے مجھے فروخت کر دے ، چاہے آزاد کر دے ۔ استاد کے اس مرتبہ و مقام کی وجہ سے طلبہ استاد کے احترام کی بنا پر ایسی حرکت سے اجتناب کریں گے جس میں استاد کی ناراضی کا پہلو ہو ۔ اس لحاظ سے یہ جذبۂ احترام طلبہ میں ضبط کا بڑا مؤثر ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ خود استاد کا کردار ضبط کا عملی نمونہ ہو ۔

(۳) انعام و تحسین :

ضبط کے خارجی محرکات میں جذبۂ خوف اور جذبۂ احترام کے علاوہ انعام و تحسین کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اچھے اخلاق کے مظاہرے پر طالب علم کی تعریف کی جائے اور کبھی کبھی مناسب انعام دیا جائے ۔ اس سے طالب علم کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور وہ اچھے اخلاق کی طرف مزید راغب ہوتا ہے ۔ بعض ماہرین نفسیات اس محرک کو طلبہ کے لیے مضر قرار دیتے ہیں ۔ ان کی رائے ہے کہ اس سے طلبہ میں لالچ اور حرص کی بیماری پیدا ہونے کا اندیشہ ہے ۔ انعام و تحسین کے سلسلے میں احتیاط ملحوظ رکھنے سے یہ اندیشہ ختم ہو جاتا ہے ۔ تعلیمی کارکردگی پر طلبہ کو کامیاب قرار دینے ، انہیں درجہ اول یا دوم عطا کرنے اور اعلیٰ کارکردگی پر وظائف اور تمغات عطا کرنے کا رواج بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے ۔ اخلاق حسن کارکردگی پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے ۔

(۴) ماحول کا اثر :

مدرسے کا ماحول اور فضا بذات خود بہت بڑے محرکات ضبط میں شامل ہے - آپ نے عام طور سے دیکھا ہوگا کہ لوگ مسجد میں بعض ایسی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں جنھیں عموماً مسجد سے باہر معیوب نہیں سمجھا جاتا - یہ مسجد کی مقدس فضا کا اثر ہوتا ہے - مسجد تو خیر خانۂ خدا ہے اور اس میں فضول باتیں کرنا شرعی لحاظ سے معیوب ہے لیکن آپ اپنی بزم ادب ، ہسٹاریکل سوسائٹی ، سائنٹی فک سٹڈی سرکل ، ہیلتھ کلب یا سٹوڈنٹ یونین کے اجلاس کو بھی دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان اجلاسوں میں اپنے ہی بے تکلف دوستوں کے ساتھ آپ کا رویہ نسبتاً بہت زیادہ سنجیدہ اور شائستہ ہوتا ہے - ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان اجلاسوں کا سنجیدہ ماحول ہی آپ کے طرز عمل کا واحد محرک ہوتا ہے - اس نقطۂ نظر سے اگر مدرسے میں عام فضا اخلاق اعتبار سے معیاری ہوگی تو طلبہ خود بخود اس سے متاثر ہوں گے اور اپنے طرز عمل کو اس کے مطابق ڈھالیں گے -

(۵) اجتماعی شعور :

انسان کو عام طور سے خود غرض سمجھا جاتا ہے لیکن دراصل یہ اس کی فطرت کا فقط ایک پہلو ہے - وہ طبعاً معاشرت پسند بھی ہے - اس کی فطرت کا یہ پہلو اس میں اجتماعی شعور پیدا کرتا ہے اور وہ دوسروں سے ہمدردی و تعاون کا جذبہ محسوس کرنے لگتا ہے بلکہ بعض اوقات وہ دوسروں کی خاطر قربانی میں بھی لطف محسوس کرتا ہے - اس طرح انسان میں ضبط کی تربیت ہوتی ہے - مدرسے کے ماحول میں بھی اس شعور سے کام لیا جا سکتا ہے - یہ شعور خواہ نمایاں نہ ہو ، انسانی فطرت میں پوشیدہ طور سے موجود ضرور ہوتا ہے - مدرسے میں مناسب فضا فراہم کر کے اسے ظہور میں لایا جا سکتا ہے -

(۶) احساس ذمہ داری :

احساس ذمہ داری ضبط کا بہت بڑا محرک ہے اور ضبط دروں تو

اس کے بغیر ممکن نہیں ۔ دراصل کوئی معاشرتی گروہ ، چھوٹا ہو یا بڑا ارکان کے احساس ذمہ داری کے بغیر زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا ۔ ذرا اپنے معاشرے میں نظام خاندان ہی پر نظر ڈالیں ۔ اس نظام میں ایک طرف تو باپ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت اس کی ذمے داری ہے اور دوسری طرف جوان بیٹوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ بوڑھے والدین کی کفالت ان کا فریضہ ہے ۔ نظام خاندان کے قیام کا انحصار اس احساس ذمہ داری پر ہے ۔ مدرسے کی فضا کو بھی طلبہ میں احساس ذمہ داری پیدا کرکے نظم و ضبط سے بہرہ ور کیا جا سکتا ہے ۔

(۷) جذبۂ ایمان :

جذبہ ایمان ضبط کا سب سے اہم محرک ہے ۔ احساس ذمہ داری کے پیدا کرنے کا سب سے موثر ذریعہ بھی یہی جذبہ ہو سکتا ہے اور اس اعتبار سے ضبط دروں کا انحصار بالآخر اسی پر ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صاحب ایمان شخص اپنے عقیدے کی وجہ سے کسی بھی خارجی دباؤ کے بغیر ہر اس عمل سے اجتناب کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے منافی ہو اور ہر اس عمل کو اختیار کرتا ہے جس سے اللہ کی رضا حاصل ہو سکے ۔

ہمارے تعلیمی نظام میں اس محرک کو بروئے کار لانے کے امکانات بہت زیادہ ہیں ۔ اس سے طلبہ میں ضبط دروں کی صفت پیدا کی جا سکتی ہے جو ضبط کا نصب العین ہے ۔

(۸) سزا اور ضبط :

محرکات ضبط میں سزا کو بڑی نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے لیکن جدید تصورات تعلیم میں سزا کے استعمال کے متعلق بڑا اختلاف پایا جاتا ہے ۔ بعض ماہرین تعلیم نے سزا کی شدید مخالفت کی ہے اور اس سے کلی اجتناب پر زور دیا ہے ۔ دراصل سزا کے مکمل بائیکاٹ کا یہ تصور سزا کے اندھا دھند استعمال کے خلاف شدید رد عمل ہے ۔ ابھی انیسویں

صدی ہی کی بات ہے کہ مغربی ممالک کے تعلیمی اداروں میں ڈنڈے کا بے تحاشا استعمال ہوتا تھا۔ عام تصور یہ تھا کہ بچے کے اندر ایک شیطان ہوتا ہے جسے ڈنڈے مار مار کر نکال دینا چاہیے۔ انگریزی کا مشہور مقولہ ہے Spare the rod and spoil the child جس کا مطلب یہ ہے کہ ڈنڈے کا استعمال چھوڑ دو گے تو بچہ بگڑ جائے گا۔

اس صورت حال کا رد عمل آزادانہ ضبط کے تصور کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس میں بچے کو ایسی چھوئی موئی بنا دیا گیا کہ استاد نے اسے ذرا گھور کر بھی دیکھ لیا تو اس کے نازک جذبات مجروح ہو جائیں گے اور اس کی شخصیت تباہ ہو جائے گی۔ نفسیاتی اعتبار سے پہلی صورت کی طرح یہ دوسری انتہائی صورت بھی فطرت انسانی کے منافی ہے اور بیرون مدرسہ معاشرے میں ہمیں اس کا کوئی نمونہ نظر نہیں آتا۔ مدرسہ تو معاشرے ہی کا عکاس ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں آزادانہ ضبط کی مصنوعی فضا پیدا کرنا قطعاً خلاف فطرت ہے۔

اسلام فطرت انسانی کا نبض شناس ہے۔ اس نے اوپر بیان شدہ دونوں صورتوں کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ وہ تربیت انسانی کے لیے ترغیب اور سزا دونوں کی اہمیت کا قائل ہے۔ لیکن انسان کی عظمت اسی میں قرار دیتا ہے کہ وہ سزا کے بغیر صحیح طرز عمل اختیار کرے۔ چنانچہ مسلمان مفکرین تعلیم نے سزا کے بے جا استعمال اور سزا میں تشدد اور سختی کی ہمیشہ مخالفت کی اور محض انتہائی مجبوری کی صورت میں سزا کو جائز رکھا اور اس کی بھی یہ حد مقرر کر دی کہ زیادہ سے زیادہ تین چھڑیاں لگائی جائیں۔

سزا میں بے اعتدالی کے نفسیاتی نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ ابن خلدونؒ فرماتے ہیں کہ اس سے طالب علم کی طبیعت بجھ جائے گی اور اس میں جوش و نشاط کی جگہ کسالت اور بددلی پیدا ہو گی۔ وہ خباثت اور دروغ گوئی کا عادی ہو جائے گا۔ سزا سے بچنے کے لیے مکر و فریب کرنے لگے گا۔ یہ رد عمل اس کے شرف انسانیت کا خاتمہ کر دیں گے۔ ان کی رائے ہے کہ جسمانی سزا اگر ضروری ہو

جائے تو بچے کو تنہائی میں بلا کر صرف تین بید مارے جائیں - امام غزالیؒ کی بھی یہی رائے ہے - ان کے نزدیک یہ سزا کی آخری صورت ہے - اس سے قبل استاد کو چاہیے کہ پہلے بچے کو اشارے کنائے سے سمجھائے ، پھر ضرورت پڑے تو ساتھی طلبہ کی موجودگی میں سرزنش کرے - اس پر بھی بچہ اصلاح نہ کرے تو سزا دی جا سکتی ہے - سزا دیتے وقت منہ پر تھپڑ طمانچہ وغیرہ مارنے کی سخت ممانعت ہے کیونکہ حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ چہرہ مظہر الٰہی ہے -

سوالات

۱- ضبط کے روائتی اور اصطلاحی مفہوم کا فرق مثالوں سے واضح کیجیے -

۲ - تعلیم و تدریس میں ضبط کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی فوج میں - بحث کیجیے -

۳ - ضبط کی مختلف اقسام کی تشریح کیجیے اور بتایے کہ مختلف صورتوں میں ضبط کے محرکات کیا ہوتے ہیں ؟

۴ - خارجی ضبط اور آزادانہ ضبط کی خامیاں بیان کیجیے اور بتائیے کہ سماجی ضبط میں انھیں کس طرح دور کیا جاتا ہے ؟

۵ - سماجی ضبط کے اصول بیان کیجیے اور بتائیے کہ خارجی ضبط اور سماجی ضبط میں کیا فرق ہے ؟

۶ - ضبط دروں کی اہمیت و ضرورت بیان کیجیے اور بتائیے کہ سماجی ضبط اور ضبط دروں میں کیا فرق ہے ؟

۷ - ضبط کے مختلف محرکات کی تشریح کیجیے اور بتائیے کہ ان سے کس کس قسم کا ضبط پیدا ہوتا ہے ؟

۸ - سزا کے متعلق مختلف نظریات پر مختصر نوٹ لکھیے -

ـبط کی تربیت میں استاد کے کردار کی وضاحت کیجیے -

چودھواں باب

مضمون وار اساتذہ اور جماعت وار اساتذہ

طلبہ کی بہترین تعلیم و تربیت کے لیے پروگرام کو مضامین اور جماعتوں کے لحاظ سے مختلف اساتذہ میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تاکہ ہر معلم اپنے شعبے میں تفویض کردہ کام کو اچھے طریقے سے انجام دے سکے اور طلبہ کی بہترین رہنمائی کرتے ہوئے ان کی اچھے طریقے سے تربیت کرے۔ اس تقسیم کار سے جہاں معلمین احسن طریقے سے کام کر سکتے ہیں وہاں طلبہ بھی ان اساتذہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مدرسوں میں کام کی تقسیم کے عام طور پر دو طریقے مروج ہیں۔ پہلے طریقے کے مطابق اساتذہ کو اپنے اپنے مضمون میں طلبہ کی رہنمائی کرنی ہوتی ہے۔ ہر معلم کسی خاص مضمون میں خصوصی مہارت رکھتا ہے اور وہ اس مضمون کو مختلف جماعتوں اور درجوں کے طالب علموں کو پڑھاتا ہے۔ اس طرح ہر جماعت کو مختلف معلمین اپنے مضمون پڑھاتے ہیں۔ تقسیم کار کے اس طریقے کو ''مضمون وار اساتذہ یا ''ماہرین مضامین خصوصی'' کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ دوسرے طریقے کے مطابق طالب علموں کی ایک جماعت ایک معلم کے سپرد کر دی جاتی ہے اور دوسری جماعت دوسرے معلم کو اور تیسری جماعت تیسرے معلم کو۔ اس لحاظ سے ہر ایک معلم کے ذمے ایک جماعت کی تعلیم و تربیت کا کام ہوتا ہے۔ وہ اپنی جماعت کے طالب علموں کو مختلف مضامین اور سرگرمیوں میں رہنمائی مہیا کرتا ہے۔ اس طرح در حقیقت وہ معلم اپنی جماعت کے طلبہ کی تربیت کا ہر لحاظ سے ذمہ دار ہوتا ہے۔ تقسیم کار کے اس دوسرے طریقے کو ''جماعت وار اساتذہ/معلمین'' کا طریقہ کہا جاتا ہے۔

مضمون وار اساتذہ اور جماعت وار اساتذہ کے لحاظ سے مدرسین کے کام کی ترتیب کا مسئلہ ابھی تک متفقہ طور پر حل نہیں ہوا۔ بعض ماہرین

تعلیم مضمون وار اساتذہ کے طریقے کو پسند کرتے ہیں اور بعض ماہرین تعلیم جماعت وار اساتذہ کے طریقے کو فوقیت دیتے ہیں - اس لیے بعض تعلیمی اداروں میں مدرسین کے کام کی تقسیم اور ترتیب "مضمون وار اساتذہ" کے لحاظ سے ہے اور بعض تعلیمی اداروں میں "جماعت وار اساتذہ" کے لحاظ سے اور کچھ تعلیمی اداروں میں ملا جلا طریق کار اختیار کیا جاتا ہے -

تدریسی کام کی تقسیم کے ان دونوں طریقوں کے حق میں اور ان کے خلاف مختلف دلائل دیے گئے ہیں - ان دونوں ترتیبوں کے فوائد و نقصانات کا جائزہ لے کر ہی ان میں سے کسی ایک ترتیب کو اپنایا جا سکتا ہے یا ان ترتیبوں کے امتزاج سے کام کی تقسیم کا کوئی اور طریقہ وضع کیا جا سکتا ہے - اس لیے سب سے پہلے ہم باری باری ان دونوں ترتیبوں کا جائزہ لیتے ہیں -

مضمون وار اساتذہ کی ترتیب

مضمون وار اساتذہ کی ترتیب سے بہت سے فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں جن میں سے مختصر طور پر چند ایک یہ ہیں :-

۱ - ماہرین مضامین کی اپنے اپنے مضمون میں دلچسپی اور مہارت :

مضمون وار مدرسین میں سے ہر ایک اپنے اپنے مضمون میں خصوصی دلچسپی رکھتا ہے - اسے اپنے مضمون پر عبور حاصل ہوتا ہے - اس کے پاس اپنے مضمون کے متعلق ذخیرۂ معلومات بھی زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے مضمون میں طلبہ کو بہتر طور پر استفادہ کرنے کا موقع مہیا کرتا ہے اور طلبہ کے لیے اس مضمون میں دلچسپی، والہانہ لگاؤ اور جوش کا سامان مہیا کرتا ہے - اس طرح سے طلبہ اپنے مضمون میں بہترین ماہرین خصوصی سے تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہیں اور ان کے لیے سکول کے ہر مضمون میں دلچسپی کا سامان موجود رہتا ہے - اس کے برعکس جماعت وار اساتذہ اپنی اپنی جماعت کے ہر مضمون میں مساوی دلچسپی اور معلومات و مہارت کے حامل نہیں ہوتے

چنانچہ طلبہ ایسے معلمین سے ہر مضمون میں بہترین رہنمائی حاصل نہیں کر سکتے ۔ لہٰذا تعلیمی معیار کے گرنے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے جب کہ مضمون وار اساتذہ کی ترتیب سے طالب علموں کا ہر مضمون میں معیار تعلیم بہتر ہو سکتا ہے ۔

۲ ۔ مضمون وار کمرے یا تجربہ گاہیں :

مضمون وار اساتذہ کی صلاحیتوں سے مزید استفادہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ ہر مضمون کا ایک کمرہ ہو جس میں ہر ماہر مضمون اپنے مضمون کی نسبت سے توضیحی سامان، آلات، نقشے، چارٹ وغیرہ رکھ سکے۔ ماہرین تعلیم کے نقطۂ نظر سے کمرۂ مضمون یا تجربہ گاہ موجودہ زمانے میں نہایت ضروری ہو گیا ہے ۔ ان کمروں کی بدولت ہر مضمون کی تدریس کا مخصوص ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے ۔ اس طرح طلبہ ہر مضمون کے مطالعے میں خصوصی دلچسپی لے سکیں گے ۔

۳ ۔ طلبہ کے نقطۂ نظر میں وسعت :

مضمون وار اساتذہ کی ترتیب کے ذریعے بچوں کو زیادہ اساتذہ سے متاثر ہونے کا موقع ملتا ہے ۔ اس طرح ہر طالب علم مختلف شخصیتوں کے مالک اساتذہ سے کسب فیض کر کے اپنی اپنی ذہنی قوتوں کو وسعت دیتا ہے اور اپنے اپنے فطری رجحان کے مطابق تربیت حاصل کرتا ہے ۔ اس کے برعکس جماعت وار اساتذہ کی ترتیب سے طلبہ ایک ہی معلم اور اس کی شخصیت سے متاثر ہوتے ہیں ۔ یہ حقیقت ہے کہ چاہے کوئی معلم کتنا ہی قابل، موثر اور جاذب شخصیت کا مالک کیوں نہ ہو، طلبہ کی شخصیتیں اور طرز فکر و نظر محدود رہیں گی ۔

۴ ۔ طریقۂ تدریس :

ہر استاد اپنے اپنے مضمون میں تدریس کے طریقوں اور تعلیم کے اصولوں پر بخوبی عبور حاصل کر سکتا ہے ۔ وہ وسیع مطالعے کے ذریعے

اپنی دل چسپی کے خصوصی مضمون میں معلومات کو وسیع کر سکتا ہے اور ان کی مدد سے اپنے طلبہ کی بہترین تربیت کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس جماعت وار استاد نہ تو تمام مضامین کے اصولوں اور طریقوں سے پورے طور پر بہرہ ور ہو سکتا ہے نہ ہی اس کے لیے تمام مضامین کی معلومات میں وسعت پیدا کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔

۵۔ بچوں کی بہتر تربیت :

ایک ماہر مضمون استاد کا تعلق اپنے طلبہ سے کئی سال تک قائم رہتا ہے کیونکہ وہ ایک ہی مضمون کئی جماعتوں کو پڑھاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جماعت وار مدرس کا تعلق اپنی جماعت کے طلبہ سے صرف ایک سال کے لیے ہوتا ہے۔ اس طرح مضمون وار استاد اپنے مضمون کے طالب علموں کے طبعی میلان، ذہانت، دل چسپیوں اور ان کی مشکلات سے واقف ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے طلبہ کی اجتماعی اور انفرادی مشکلات کو بہتر طور پر حل کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ جماعت وار معلم میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے طلبہ میں ہر مضمون میں دل چسپی کا سامان ان کی ذہانت، فطری رجحان اور میلان کے مطابق کر سکے۔ مزید یہ کہ جماعت وار مدرس ہر مضمون میں طالب علموں کی مشکلات کو بہتر طور پر سمجھ نہیں سکتا اور نہ ہی ان کا حل تجویز کر سکتا ہے۔

۶۔ مضمون کے مواد کی درجہ بندی :

ایسا مدرس جو ایک ہی مضمون بہت سی جماعتوں کو پڑھاتا ہے وہ بہتر طور پر اپنے مضمون کے مواد کی درجہ بندی ترتیب سے مختلف جماعتوں کے لیے کر سکتا ہے۔ اس سے معلم کو پڑھانے اور طلبہ کو پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے مضمون وار اساتذہ کی مدد سے طلبہ کی نشو و نما سے مختلف درجوں کے لحاظ سے کام کی تقسیم ہو جاتی ہے جو نہایت موزوں ہے۔ اس کے مقابلے میں جماعت وار معلمین کے لیے عام طور پر یہ آسان نہیں ہوتا کہ وہ اپنی جماعت کے تمام

مضمونوں کا ربط اس سے پہلی جماعت اور اس کے بعد والی جماعت کے مضمونوں سے کر سکے۔

۵۔ انفرادی تعلیم :

موجودہ صدی میں جہاں تعلیم میں اور بہت سی جدت طرازیاں کی گئی ہیں وہاں بچے کی انفرادیت پر بھی بہت زور دیا گیا ہے۔ بچے کی منفرد شخصیت کی مکمل نشو و نما کے لیے ضروری ہے کہ علیحدہ علیحدہ مضمون میں ماہر اساتذہ بچوں کی تربیت کے لیے موجود ہوں۔ طلبہ کی تربیت کے لیے ایک ہی معلم کو چند مضمونوں کا ماہر سمجھ لینا بچوں کے ساتھ ظلم ہے اور اب تو زمانہ ہی مخصوص مہارتوں کا ہے۔ اس لیے اس زمانے میں طلبہ کی صحیح تربیت کے لیے مضمونوں کے ماہرین کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت صنعت و دستکاری، موسیقی، گھریلو سائنس اور جسمانی تربیت کے مضامین میں اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔

جماعت وار اساتذہ :

ہم نے مضمون وار اساتذہ کے لحاظ سے سکول کے کام کی تقسیم کے چند فوائد اوپر بیان کیے ہیں۔ اب ہم جماعت وار اساتذہ کے لحاظ سے سکول کے کام کی تقسیم کے افادی پہلوؤں کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ بچے کی نشو و نما کا مکمل جائزہ :

جماعت وار استاد چونکہ اپنے طلبہ کو تمام یا بیشتر مضامین پڑھاتا ہے اس لیے وہ اپنے طالب علموں کو بھی زیر توجہ رکھتا ہے۔ ان کی شخصیتوں، صلاحیتوں، دلچسپیوں اور رجحانات کا مکمل جائزہ لیتا ہے۔ وہ صرف ایک ہی مضمون کے نقطۂ نظر سے طلبہ کو نہیں پرکھتا بلکہ طلبہ کو تمام مضمونوں کے لحاظ سے زیر مطالعہ رکھتا ہے۔ اس لیے وہ مختلف مضامین کے لحاظ سے مختلف طلبہ کی حسب ضرورت تدریس و تربیت کر سکتا ہے۔ وہ طلبہ کے احساسات، جذبات، مشکلات اور ترقی کا اندازہ مضمون وار استاد کی نسبت زیادہ بہتر طور پر کر سکتا

ہے ۔ اس کے برعکس ماہر مضمون جزوی طور ہر بچے کا جائزہ لیتا ہے اور بچے کو اپنے ہی مضمون کے نتائج کے اعتبار سے پرکھتا ہے ۔

۲ ۔ طلبہ کی صلاحیت کے مطابق کام :

جماعت وار معلم اپنے طالب علموں کو مختلف مضامین میں گھر کا کام دیتے وقت یہ امر ملحوظ رکھ سکتا ہے کہ طلبہ ایک دن میں سب مضامین کا کتنا کام مکمل کر سکیں گے اور وہ ان کی استطاعت کے مطابق ہی کام دیتا ہے۔ مضمون وار اساتذہ کبھی تو ہر مضمون میں طلبہ کو گھر کے کام کے بھاری بوجھ تلے دبا دیں گے اور بعض اوقات طلبہ کے لیے گھر کا کام قطعاً نہیں ہوگا ۔ کیونکہ ایک مضمون کے استاد کو دوسرے مضمون کے مدرس سے طلبہ کو دیے گئے کام کا علم اور اندازہ نہیں ہوتا ۔

۳ ۔ احساس ذمہ داری :

جماعت وار مدرس اپنی جماعت کی اجتماعی نشو و نما اور ترقی کے لیے زیادہ کوشاں رہتا ہے کیونکہ وہ ان طلبہ کو اپنی جماعت سمجھتا ہے اور ان طلبہ کی ہمہ جہت تعلیم و تربیت کو اپنا فرض سمجھتا ہے ۔ اس کے برعکس مضمون وار اساتذہ میں بچے کی تربیت کے لیے احساس ذمہ داری نہیں ابھر پاتا ، کیونکہ انہیں کسی خاص جماعت کے ساتھ خصوصی تعلق نہیں ہوتا اور وہ طلبہ کی مکمل شخصیت کی تعمیر کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتے ۔

۴ ۔ مختلف مضامین میں وحدت اور باہمی ربط :

مضمون وار اساتذہ اپنے اپنے مضمون کی تدریس پر زور دیتے ہیں ۔ اس طرح ہر مضمون اپنی اپنی جگہ خود مختار حیثیت اختیار کر جاتا ہے ۔

اس طرح ایک مضمون کے علم سے دوسرے مضمون میں فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا اور ایک مضمون کا تعلق اور ربط دوسرے مضمون سے پیدا نہیں ہو سکتا ۔ حالانکہ انسانی ذہن کی طرح علم ایک وحدت ہے اور مختلف مضامین ایک ہی پودے کی مختلف شاخیں۔ مضمونوں کی

اس مصنوعی تقسیم اور حد بندی کا علاج جماعت وار اساتذہ کی ترتیب
سے ممکن ہے ۔ جماعت وار ترتیب میں ایک مضمون کے علم اور معلومات
سے دوسرے مضامین میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ جیسے ریاضی، کیمیا،
طبیعیات اور دیگر دوسرے سائنسی علوم کو باہم مربوط کرنے کے
لیے جماعت میں بے شمار مواقع مہیا ہوتے ہیں۔ اسی طرح زبان اور معاشرتی
علوم میں باہمی ربط پیدا کیا جا سکتا ہے بلکہ ہر مضمون کو ہر
دوسرے مضمون سے کسی نہ کسی طرح منسلک کیا جا سکتا ہے اور
یوں علم ایک وحدت میں سمویا جا سکتا ہے ۔ مثلاً اردو کی کتاب میں
فتح مکہ کی کہانی کو دینیات ، تاریخ اور علم سیاست پڑھانے کے لیے
بھی استعمال کیا جا سکتا ہے ۔

۵ ۔ طلبہ کی اخلاقی تربیت :

ایسا معلم جو سکول کے طلبہ کو دن بھر جماعت وار انتظام کے
تحت پڑھاتا ہے وہ طلبہ کے کردار کی تربیت کے لیے زیادہ مؤثر ہوتا
ہے ۔ اس کے برعکس ماہر مضمون جماعت میں کم وقت گزارتا ہے ۔ وہ
طلبہ کی اخلاق تربیت میں زیادہ موثر ثابت نہیں ہوتا ۔ اخلاق اور
کردار کے نقطۂ نظر سے جماعت وار استاد ہی زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

۶ ۔ اساتذہ کی موزونیت :

بعض اساتذہ طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے بڑی جماعتوں کے طلبہ
کی تدریس و تربیت کے لیے موزوں ہوتے ہیں اور بعض چھوٹی جماعتوں
کے طلبہ کی تدریس کے لیے ، اس لیے جماعت وار اساتذہ کی ترتیب کے
لحاظ سے مدرس کو اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق جماعت میسر آ
سکتی ہے اور ہر جماعت کے طلبہ کو بہترین مدرس ۔ مضمون وار اساتذہ
کی ترتیب میں ملنا ممکن نہیں ۔

۷ ۔ مدرسے کے انتظام میں سہولت اور کفایت :

مدرسے کے انتظام کے نقطۂ نظر سے جماعت وار ترتیب زیادہ مناسب
ہے ۔ ہر جماعت کے نظم و ضبط اور اخلاق و کردار کا ذمہ دار ایک

ہی معلم ہوتا ہے - طلبہ اپنے مدرس سے زیادہ عقیدت رکھتے ہیں اور تعاون کرتے ہیں - مزید برآں مدرسے کے اخراجات میں جماعت وار اساتذہ کی وجہ سے بچت اور کفائت ہو جاتی ہے کیونکہ ہر جماعت کا ایک معلم ہوتا ہے - مضمون وار اساتذہ کے لحاظ سے زیادہ اساتذہ کی ضرورت ہوگی اور مدرسے کو زیادہ مالی بوجھ برداشت کرنا ہوگا -

۸ - معلم کے لیے تنوع :

اگر ایک معلم ایک ہی مضمون بدستور پڑھاتا رہے تو تکان اور عدم دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے اور وہ کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی راہ پر چلتا جائے گا - جماعت وار مدرس کے لیے ایک مضمون کی تدریس کے بعد دوسرے مضمون کی تدریس میں تنوع کا سامان مہیا ہو سکتا ہے اور وہ تدریس میں اپنی دلچسپی برقرار رکھ سکے گا -

۹ - سب مضامین پر مناسب توجہ :

اگر مضمون وار اساتذہ ہوں تو وہ صرف اپنے مضمون پر طلبہ کی توجہ دلاتے ہیں اور عملاً ہر مدرس ایک دوسرے کا مد مقابل بن جاتا ہے اور اپنے مضمون ہی میں کامیابی پر زور دیتا ہے - اس کے برعکس جماعت وار اُستاد تمام مضامین میں مناسب رہنمائی کا اہتمام کرتا ہے - ایسے مضامین جن میں کوئی طالب علم کمزور ہوتا ہے ان پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور جن مضامین میں کسی طالب علم کی ترقی بہت اچھی ہوتی ہے اس پر نسبتاً کم توجہ سے بھی معلم اس طالب علم کے تمام مضامین کی ترقی اور کامیابی کا ضامن بن جاتا ہے -

مضمون وار اساتذہ اور جماعت وار اساتذہ کی بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کسی مضمون کا ماہر خصوصی اپنے مضمون کی تدریس میں طلبہ میں سرگرمی اور دلچسپی پیدا کر سکتا ہے لیکن بچوں کی تربیت کے لیے یہ زیادہ فائدہ مند نہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ترتیب کے مطابق بچوں کو مضمون کے تابع اور ماتحت بنا دیا جاتا ہے اور مدرس جس کا صحیح مقصد بچوں کی تعلیم و تربیت ہے ایک خطیب

میں بدل جاتا ہے ، جس کو صرف اپنے مضمون سے دلچسپی ہوتی ہے -
اس کے برعکس جماعت وار اُستاد طلبہ کو عامیانہ سطح پر مضامین کی
معلومات فراہم کرتا ہے - وہ طلبہ کو مضامین کی اعلیٰ پائے کی علمی
بحثوں سے روشناس نہیں کر سکتا اور یوں طلبہ کی ذہنی اور علمی ترقی
رک جاتی ہے - اس بحث سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں قسم
کی ترتیب میں کچھ فوائد ہیں اور کچھ خامیاں ، لہٰذا دونوں ترتیبوں
کے فوائد حاصل کرنے اور خامیوں سے بچنے کی ایک ترکیب یہ ہے کہ
جماعت وار معلم ایک جماعت کو عمومی مضامین پڑھائے مثلاً اردو ،
معاشرتی علوم اور حساب اور مضمون وار معلم ایک یا زیادہ خصوصی
مضامین پڑھائے مثلاً فنون عملی ، سائنس اور خانہ داری وغیرہ۔ دوسری
ترکیب یہ کہ ہر معلم کے ذمے چند مضامین کی تدریس ہو اور وہ یکے
بعد دیگرے چند جماعتوں کو اپنے مضامین پڑھائے یا طلبہ مختلف
مضامین کے مطالعے کے لیے مختلف کمروں میں جائیں -

مضمون وار اساتذہ یا جماعت وار اساتذہ کی ترتیب کی کامیابی
کا انحصار در حقیقت اس بات پر ہے کہ وہ کس قسم کے
مدرسے اور کس درجے کے طالب علموں کے لیے استعمال کی جاتی
ہے - چونکہ پرائمری سکولوں میں مختلف مضامین کے مبادیات ہی
پڑھائے جاتے ہیں اور ان سکولوں میں مضامین کے گہرے علم کی بجائے
بچوں کی نشو و نما پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اس لیے پرائمری سکولوں
میں جماعت وار اساتذہ ہی ہونے چاہییں - ان مدرسوں میں تعلیم کا زیادہ
تعلق بچوں کی بنیادی ذہنی ، جسمانی اور اخلاقی عادات کی تشکیل سے
ہوتا ہے اس لیے اساتذہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ بچوں سے محبت اور
بردباری کا سلوک کریں اور ان کی نفسیات سے گہری واقفیت رکھتے
ہوں - مزید برآں اس درجۂ تعلیم میں مختلف مضامین کا باہمی ربط نہایت
ضروری ہے اور یہ ربط جماعت وار معلم ہی بہتر طور پر پیدا کر سکتا
ہے - جدید تعلیمی نظریات کے لحاظ سے پرائمری سکولوں میں علمی
مضامین کی بجائے طلبہ کی سرگرمیوں اور تجربات پر زیادہ توجہ دی جاتی

چاہیے اور اس کے لیے منصوبی طریقۂ تدریس کو بروئے کار لایا جانا چاہیے اور اس قسم کا انتظام جماعت وار اساتذہ کی ترتیب ہی سے ممکن ہے - پرائمری جماعتوں کے بچوں کے کردار و سیرت کی تربیت جماعت وار مدرس کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے کیونکہ بچوں کا تعلق پورے سال کے عرصے میں ایک ہی معلم سے ہوتا ہے - چھوٹے سکولوں میں خصوصاً جماعت وار اساتذہ کی ترتیب ہی باکفایت اور موزوں ہے ، اس لیے پرائمری سکولوں کے اساتذہ کے لیے لازمی قرار دیا جائے کہ وہ معلمی کی تربیت کے دوران میں سب مضمونوں کی تدریس کی اہلیت حاصل کریں -

موجودہ تعلیمی پالیسی کے مطابق پرائمری تعلیم کو آٹھویں جماعت تک وسیع کر دیا گیا ہے، اس لیے جماعت وار اساتذہ کی ترتیب ابتدائی تعلیم کی آٹھویں جماعت تک نافذ العمل ہونی چاہیے- البتہ دستکاری، زراعت ، ڈرل اور ڈرائنگ جیسے خصوصی مضامین کی تدریس کو اس ترتیب سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے - اسی طرح حسب ضرورت دیگر مضامین کو بھی مضمون وار تدریس کے لیے منتخب کیا جا سکتا ہے - خاص طور پر ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کے طلبہ کے لیے مضامین کے مواد اور معلومات کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے لہذا مضمون وار اساتذہ کی ترتیب زیادہ فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے -

ہمارے مدرسوں میں عام طور پر جماعت وار اساتذہ کی ترتیب پر بھی پوری طرح عمل نہیں کیا جاتا - عام طور پر وہ معلم جو کسی جماعت کو ایک یا زیادہ مضامین پڑھائے ، جماعت کی حاضری لگائے ، فیس یا چندہ وصول کرے اور طلبہ کی رپورٹیں لکھے ، جماعت وار معلم یا ٹیچر انچارج کہلاتا ہے - اس طرح کی تعلیم سے بچوں کی تربیت کے وہ فوائد حاصل نہیں ہو پاتے جو عام طور پر جماعت وار اساتذہ کی ترتیب سے حاصل ہونے چاہییں -

بعض اوقات مضمون وار استاد کو کسی جماعت کا انچارج بنا دیا جاتا ہے - اگرچہ وہ کسی ایک مضمون کا ماہر خصوصی ہوتا ہے لیکن

اسے پوری جماعت کے طلبہ کے کردار و سیرت اور نشو و نما کا ذمہ دار
بنا دیا جاتا ہے ۔ وہ انہیں مطالعے کے لیے رہنمائی مہیا کرتا ہے ۔ سکول
میں ان کے کردار کا نگران ہوتا ہے ۔ کھیل کے میدان میں ان کی
سرپرستی کرتا ہے اور سکول سے باہر طلبہ کے والدین سے راہ و رسم
بھی پیدا کرتا ہے ۔ اس قسم کی ترتیب سے جماعت وار مدرس کے اخلاق
فوائد اور مضمون وار معلم کے علمی فوائد بھی طلبہ کو حاصل ہو
جاتے ہیں ۔

پرائمری سکولوں میں جماعت وار اساتذہ کی ترتیب کی عمدگی کے
پیش نظر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ایک معلم کو پہلی جماعت سے لے
کر پرائمری کی آخری جماعت تک طلبہ کے ایک ہی گروہ کے ساتھ سال
بہ سال چلایا جائے ۔ اس طرح طلبہ سے کئی سال متعلق رہنے کے باعث
وہ طلبہ کی شخصیتوں کو بہتر طور پر سمجھ سکے گا اور اپنے بہترین
اخلاق کی مستقل چھاپ طلبہ کے کردار پر ثبت کر سکے گا ۔ مزید برآں
اس قسم کے انتظام سے ایک مدرسے کے سب اساتذہ میں مساوات کا شعور
بھی پیدا ہو سکے گا ، لیکن اس ترتیب میں یہ خامی ہو سکتی ہے کہ
کوئی ایک معلم علمی اور پیشہ ورانہ طور پر ایک جماعت کے لیے
موزوں ہو لیکن کسی دوسری جماعت کے لیے سود مند
نہ ہو سکے ۔ دوسری خامی یہ ہے کہ طلبہ کے ایک ہی معلم
کے چند سال تک مسلسل زیر اثر رہنے سے کوتاہ بینی اور تنگ نظری
پیدا ہو سکتی ہے اور وہ اپنی شخصیتوں کی تکمیل کے لیے زیادہ
اساتذہ کی تربیت کی وسعتوں سے ہم کنار نہیں ہو سکیں گے ۔ ان
خامیوں کے تدارک کے لیے ایک متبادل تجویز یہ ہے کہ کسی ایک
معلم کو ہر دو تین سال بعد پہلے سے اونچی جماعت کا انچارج بنا دیا
جائے ۔ اس سے اس میں عزم و عمل اور مسابقت کا جذبہ بھی پیدا ہوگا
اور طلبہ کی تربیت بھی مناسب ہو گی ۔

مضمون وار ماہر خصوصی سے بھی نفع بخش کام لیا جا سکتا ہے ۔
وہ کسی ایک مضمون کا ذمہ دار ہو ۔ اس کے متعلق جدید ترین معلومات

حاصل کرے - اس مضمون کے متعلق تجدیدی کورسوں میں شرکت کرے - وہی مضمون پڑھانے والے اساتذہ کی رہنمائی کرے اور ہیڈ ماسٹر کو اس مضمون کے نصاب ، امتحانات اور طریقہ ہائے تدریس کے متعلق واقفیت بہم پہنچاتا رہے اور مدرسے کے امتحان کے لیے اپنے مضمون کے آزمائشی پرچے بھی بنائے جن سے دوسرے معلمین اور طلبہ آخری امتحان میں تیاری کے لیے مدد لے سکیں -

سوالات

۱ - جماعت وار اساتذہ کی ترتیب سے کون سے فوائد حاصل ہوتے ہیں ؟ اس ترتیب کی خامیاں بھی تحریر کیجیے -

۲ - مضمون وار اساتذہ کی ترتیب کیونکر فائدہ مند ہو سکتی ہے اور اس ترتیب کی خامیوں سے کیسے بچا جا سکتا ہے ؟

۳ - جماعت وار اساتذہ اور مضمون وار اساتذہ کی ترتیبوں کی خوبیوں اور خامیوں کا موازنہ کیجیے -

۴ - آپ ہیڈ ماسٹر کے طور پر پرائمری سکول میں جماعت وار ترتیب کو نافذ کریں گے یا مضمون وار ترتیب کو ؟ دلائل سے واضح کیجیے -

۵ - جماعت وار معلم کس طرح سے مختلف مضامین میں ربط پیدا کر سکتا ہے ؟ مثالوں سے واضح کیجیے -

۶ - اگر کسی سکول میں چند مضامین کے ماہر خصوصی موجود ہوں تو ان سے کس طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے ؟

۷ - مضمون وار اور جماعت وار اساتذہ کی ترتیبوں کے فوائد حاصل کرنے اور خامیوں سے بچنے کے لیے کون کون سی تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں ؟ دلائل سے واضح کیجیے -

۸ - پرائمری مدرسے کے طلبہ کے کردار و سیرت کی نشو و نما کے لیے کون سی ترتیب بہتر ہو گی ؟

پندرھواں باب

اکتسابی جائزہ

اکتسابی جائزے کا مفہوم :

کسی بھی تعلیمی نظام کا مرکزی کردار طلبہ ہوتے ہیں - ان کی سیرت و کردار اور تعمیر و تکمیل اور نشو و نما کے لیے مقاصد کے تعین کے بعد تعلیم ، نصاب تعلیم ، طریقہ ہائے تدریس، معلمین، مدرسوں ، محکمے کی عمارات ، کھیل کے میدانوں ، تدریسی اور غیر تدریسی عملے، تدریسی معاونات اور تعلیمی ساز و سامان کا انتظام کیا جاتا ہے - ان انتظامات کے بعد مدرسے کے ذمہ دار افراد، حکومت ، والدین اور معاشرہ یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ طلبہ نے کہاں تک سکول کی سہولتوں سے فائدہ اٹھایا ہے اور تدریس کی کارکردگی کا معیار کیا ہے - اس لیے مدرسے کی تنظیم میں ایسی کوئی نہ کوئی مشینری ہونی چاہیے جس کے ذریعے طلبہ کی ترقی کا اندازہ کیا جا سکے - اس اعتبار سے اکتسابی جائزہ تنظیم مدرسہ کا اہم جز ہے -

مدرسے کے کام میں طلبہ کی ترقی کا تحصیل علوم و فنون کا ہر پہلو سے جائزہ لینا بہت مشکل ہے - خصوصاً تعلیم کے وہ نتائج جو ذہنی، اخلاق ، روحانی یا معاشرتی صفات پر مشتمل ہوتے ہیں ، ان کا جائزہ بہت دشوار ہوتا ہے ، لیکن مدرسے کے نصاب میں شامل مختلف مضامین میں حاصل کردہ معلومات اور مہارتوں کا صحیح طور پر جائزہ لیا جا سکتا ہے - ان حالات میں اکتسابی جائزے سے مراد وہ امتحان ہے جو مقررہ اوقات پر مناسب وقفوں سے طلبہ کی تحصیل کردہ معلومات اور مہارتوں کو پرکھنے کے لیے لیا جاتا رہے اور اس طرح طلبہ کی رفتار ترقی اور تعلیمی عمل کی کارکردگی کا اندازہ ہو سکے -

امتحانات کی ضرورت و اہمیت

مدت دراز سے امتحانات لینے کا طریقہ مختلف اقوام میں جاری رہا ہے - چین میں تقریباً چار ہزار سال قبل امتحان کا طریقہ رائج تھا - اسی طرح پرانے زمانے میں ہندوستان، یونان، روم، ازمنہ وسطیٰ اور یورپ میں امتحانات مروج تھے - یہ امتحانات زیادہ تر زبانی ہوتے تھے لیکن بعد میں تحریری امتحان بھی لیے جانے لگے - آج کل کے تحریری امتحان تو انیسویں صدی کی پیداوار ہیں - اب یہ بیشتر ممالک کے نظام ہائے تعلیم کا اہم جزو تصور کیے جانے لگے - برصغیر پاک و ہند میں تحریری امتحان 1860ء کے قریب رائج کیا گیا اور اب تک معمولی رد و بدل کے ساتھ جاری ہے- غرضیکہ مختلف ادوار میں امتحان کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور رائج رہا ہے -

امتحانات کی ضرورت اور اہمیت کی وضاحت کے لیے درج ذیل امور توجہ طلب ہیں :

۱ - امتحانات تعلیمی نظام کا جزو لاینفک ہوتے ہیں - تعلیم کے ذریعے طلبہ میں علمی قابلیت بڑھتی ہے - ان میں عمل، احساسات اور خیالات کی عادات پروان چڑھتی ہیں - طلبہ کی شخصیت اور سیرت و کردار کی ان تبدیلیوں کے جائزے کے لیے کسی نہ کسی طرح کے نظام امتحانات کی ضرورت ہے - اس سے طلبہ کی قابلیت اور اکتسابی قوتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے -

۲ - معلمین کو بھی امتحانات کے ذریعے طلبہ کی قابلیت اور اکتسابی قوتوں کے جاننے کی ضرورت ہے تا کہ وہ ان طلبہ کی گروہ بندی کر کے اپنی تدریس کو ان کی سطح پر لے جائیں -

۳ - والدین بھی بجا طور پر توقع کرتے ہیں کہ ان کے بچوں کی ترقی کے متعلق انھیں آگاہ کیا جائے - یہ رپورٹ امتحانات کے نتائج کی بنا پر ہی تیار کی جا سکتی ہے -

۴ - مختلف آسامیوں کے لیے ملازم بھرتی کرنے والے ادارے یہ یقین

دہانی چاہتے ہیں کہ فارغ التحصیل امیدوار میں بلا شبہ ایسی صفات موجود ہیں جن کی مدد سے وہ بھرتی کرلیے جانے پر اپنا کام عمدگی سے انجام دے گا۔ یہ یقین دہانی امتحانات کے نتائج کی بنا پر ہی کی جا سکتی ہے۔

۵۔ اسی طرح معاشرہ یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل نوجوان جنھیں مختلف ذمہ دار عہدوں پر فائز کیا جائے وہ درحقیقت ان کے اہل ہیں۔ امتحانات اس لحاظ سے پیمانے کا کام دیتے ہیں، جن سے طلبہ کی ذہانت، قابلیت اور اکتسابی قوتیں اور اوصاف کو ناپا اور تولا جاتا ہے۔

۶۔ امتحانات مختلف امیدواروں کی قابلیت کی پیمائش اور ان میں تقابل کے لیے معیاری کسوٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۷۔ امتحانات کی اہمیت اور ضرورت اس لحاظ سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ انفرادی طور پر ہر طالب علم کی اور مجموعی طور پر پورے معاشرے کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ امتحانات امیدواروں کی صرف موجودہ صلاحیتوں کی نشاندہی نہیں کرتے بلکہ یہ طلبہ کی متنوع قابلیتوں، رجحانات اور مزاج کا پتا بھی دیتے ہیں۔ ان سے ہمیں طلبہ کے آیندہ پیشے یا تعلیم کے سلسلے میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ طلبہ کو مسلسل یہ رہنمائی مہیا کرنے کے لیے امتحانات ضروری ہیں۔

۸۔ امتحانات اساتذہ اور طلبہ کے لیے مہیج ثابت ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امتحان کا مہیج، دلچسپی والے مہیج سے مقابلتاً گھٹیا ہے لیکن اس کے بھی فوائد ہیں۔ اساتذہ اور طلبہ امتحان کے پیش نظر سخت محنت کرتے ہیں۔ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ پڑھائی کا جائزہ لیا جائیگا اور طلبہ کی کامیابی پر اساتذہ اور طلبہ دونوں کو ترقی کے مواقع ملیں گے۔

۹۔ امتحانات کے ذریعے معلم کو اپنے طریقہ ہائے تدریس اور

نفس مضمون کے انتخاب کی خامی کا پتا چل جاتا ہے۔ اس طرح متعلم کی صلاحیتوں اور تیاری کی خامیوں کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان خامیوں کی روشنی میں معلم اپنے طریقہ ہائے تدریس، نفس مضمون اور طلبہ کی تیاری کے سلسلے میں مناسب رد و بدل کر کے تعلیمی معیار کو بلند کر سکتا ہے۔

امتحان کی قسمیں :

امتحان کی مختلف اقسام ہیں۔ امتحانات کی تقسیم اس بنا پر کی جاتی ہے۔ کہ سوالوں کے جواب کس طرح دیے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے امتحانات کی تین قسمیں ہیں۔ اول تحریری، دوم زبانی اور سوم عملی۔

تحریری امتحان :

تحریری امتحان میں امیدواروں سے عام طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ مقررہ وقت میں چند سوالوں کے جواب تحریر کریں۔ تحریری امتحان کی بھی تین اقسام ہیں۔ اولاً وہ تحریری روایتی امتحان جس میں تعداد کے لحاظ سے کم لیکن مواد کے لحاظ سے وسیع سوالات کے جوابات طویل مضامین کی صورت میں دیے جاتے ہیں۔ دوم طویل مقالہ (Thesis) لکھنے کا امتحان ہے جو لمبے عرصے کی علمی تحقیق کے بعد لکھا جاتا ہے۔ ایسا تحریری امتحان عموماً کالج یا یونیورسٹی کی اعلیٰ جماعتوں میں ہوتا ہے۔ ایسے تحریری امتحان میں عام طور پر یونیورسٹی/کالج کے اساتذہ کی رہنمائی امیدواروں کو میسر ہوتی ہے۔ اگرچہ بنیادی تحقیقی کام امیدوار خود ہی کرتے ہیں۔ سوم معروضی قسم کا تحریری امتحان ہے جس میں طلبہ کو عام طور پر مختصر جواب لکھنے پڑتے ہیں۔ عام طور پر سوال کے سامنے ایک لفظ یا چند الفاظ لکھنے یا مخصوص نشان لگانے سے جواب دیا جاتا ہے۔ سوالات کی فہرست معروضی امتحان میں بہت طویل ہوتی ہے۔ ایسے سوالات کو عام طور پر بہت سے امیدواروں (جو ہم عمر اور ہم جماعت ہوتے ہیں) پر پرکھ کر معیاری (Standardized) بنا لیا جاتا ہے۔ ایسے امتحانات کو عام طور پر "معیاری تعلیمی آزمائشیں" (Stand-

ardized Tests) کہا جاتا ہے ۔

۲ ۔ زبانی امتحان :

زبانی اکتسابی امتحان (Oral or Viva Voca Examination) انفرادی قسم کا امتحان ہوتا ہے ۔ اسی بنا پر یہ امتحان ، تحریری امتحان کے مقابلے میں امیدوار کی ذہنی اور اکتسابی صلاحیتوں کا جائزہ لینے میں زیادہ مؤثر ہوتا ہے ۔ امتحان لینے والے کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ امیدوار اس کے سامنے بالمشافہ موجود ہو ۔ اس طرح وہ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ امیدوار کیا جانتا ہے اور کیا نہیں جانتا ۔ چونکہ یہ امتحان ہر امیدار سے فرداً فرداً لینا ہوتا ہے اس لیے اس پر بہت وقت لگتا ہے ۔ اس امتحان میں امیدوار پر ذہنی دباؤ زیادہ پڑتا ہے کیونکہ ممتحن سامنے موجود ہوتا ہے اور امیدوار کو ممتحن کے زبانی پوچھے گئے سوالات کا جواب اسی وقت دینا ہوتا ہے ۔

۳ ۔ عملی امتحان :

عملی امتحان میں امیدوار پہلے سے سیکھے ہوئے کام کو کرتا ہے اور ممتحن اس کا جائزہ لیتا ہے ۔ عملی امتحان کے لیے مقررہ نصاب میں سے سوالات تجویز کیے جاتے ہیں اور امیدوار متعین کردہ وقت میں عملی کام کرتا ہے ۔ عملی کام کے دوران میں وہ مفید مطالب اور نوٹ بھی کر لیتا ہے اور ممتحن کو دکھاتا ہے ۔ ممتحن عملی کام کو مختلف مرحلوں پر دیکھتا ہے ۔ اس امتحان میں جہاں وقت زیادہ لگتا ہے اور امیدوار کو زیادہ ذہنی دباؤ برداشت کرنا ہوتا ہے وہاں اس کا اہم فائدہ یہ ہے کہ اس امتحان کے ہر وقت نمبر لگا دیے جاتے ہیں اور زبانی امتحان کی طرح اگر صحیح طریقے سے یہ امتحان لیا جا سکے تو یہ امیدوار کی قابلیت اور اکتسابی صلاحیتوں کا صحیح آئینہ دار ہوتا ہے ۔

امتحانات کی ایک اور تقسیم اس بنا پر ہوتی ہے کہ امتحان لینے والا ادارہ کون سا ہے ۔ یہ تقسیم داخلی اور خارجی امتحانات کی ہے ۔

سے عام سکولوں کو واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اس لیے اس کی تنظیم میں نہایت احتیاط اور عمدگی کی ضرورت ہے۔ امتحان جو سکول میں اساتذہ لیتے ہیں اور جس کا مقصد مختلف جماعتوں اور درجوں پر اپنے طلبہ کی ترقی کا جائزہ لینا ہے، داخلی امتحان، کلاس ٹیسٹ یا سکول کا امتحان کہلاتا ہے۔ جب کوئی بیرونی یا خارجی ادارہ جس کا سکول اور طلبہ کی تدریس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، امتحانی پرچے بناتا اور امتحان لیتا ہے تو ایسے امتحان کو خارجی امتحان کہا جاتا ہے۔ ہمارے سکولوں کی آٹھویں جماعت کا خارجی امتحان محکمہ تعلیم اور دسویں جماعت کا امتحان ثانوی تعلیمی بورڈ لیتا ہے۔

۴ - داخلی امتحانات :

ہمارے سکولوں کے داخلی امتحانات عام طور پر سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ ہوتے ہیں اور جون یا ستمبر، دسمبر اور مارچ میں لیے جاتے ہیں۔ یہ امتحانات مدرسے کی تنظیم کا حصہ ہیں اس لیے مدرسے کا سربراہ اپنے تدبر، ذہانت اور ہوشمندی سے امتحانات کا انتظام عمدگی سے کر سکتا ہے۔ داخلی امتحانات لینے سے درج ذیل مقاصد پورے ہو جاتے ہیں :

۱ - ان سے طلبہ کی ذہنی نشو و نما اور تحصیل علم کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۲ - طلبہ کی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے اور انہیں ایک جماعت سے دوسری جماعت میں ترقی دی جاتی ہے۔

۳ - اس میں طلبہ کی آپس میں مسابقت بھی ہو جاتی ہے اور ہر طالب علم کا مقام متعین ہو جاتا ہے کہ کون تعلیم میں آگے ہے اور کون پیچھے۔

۴ - مختلف اساتذہ کی تدریس کا موازنہ ہو جاتا ہے۔

۵ - ان امتحانات سے کسی جماعت کے لیے متعین کردہ نصاب کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

داخلی امتحانات کی تنظیم :

مندرجہ بالا مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے داخلی امتحانات کی بہترین تنظیم کی ضرورت ہے ۔ اس سلسلے میں درج ذیل امور خصوصاً قابل توجہ ہیں :

۱ ۔ امتحانی پرچے بنانا :

داخلی امتحانات میں نہایت اہم کام پرچوں کا بنانا ہے ۔ کسی مضمون میں پرچہ بنوانے کے دو طریقے قابل عمل ہیں : ایک طریقہ تو یہ ہے کہ مدرسے میں ہر مضمون کے سب سے زیادہ تجربہ کار معلم کو یہ پرچہ بنانے کے لیے دیا جائے اور اس سے اس مضمون کا ہر جماعت کے لیے پرچہ بنوا لیا جائے ۔ اگر کسی مضمون کے دو پرچے بنوانے مقصود ہوں تو ان مضامین کے سب سے زیادہ تجربہ کار دو اساتذہ کو پرچہ "الف" اور پرچہ "ب" ہر جماعت کے لیے بنانے کو کہا جائے ۔ اس طریق کار سے تمام جماعتوں کے پرچوں کا معیار یکساں اور موزوں ہوگا ، لیکن اس فائدہ کے حصول میں یہ دقت حائل ہوتی ہے کہ پرچہ بنانے والے کو ہر جماعت کی اوسط قابلیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا ۔ وہ اس بات سے بھی واقف نہیں ہوتا کہ کون سی جماعت نے کون سے عنوانات اور موضوعات پڑھ لیے ہیں ۔ ہر جماعت کی قابلیت اور کارکردگی کو بہتر طور پر جاننے والا اس جماعت کو پڑھانے والا معلم ہی ہو سکتا ہے ۔ پرچہ بنوانے کا دوسرا طریق کار یہ ہے کہ ہر مضمون میں ہر جماعت کا پرچہ وہی استاد بنائے جو اس جماعت کو پڑھاتا ہے لیکن اس طریقے میں خامی یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ پرچہ بنانے والا معلم کمرۂ جماعت میں اپنے طلبہ کو صرف وہی موضوعات اور عنوانات پڑھائے جن کے متعلق پرچے میں سوالات دیے گئے ہوں ۔ اس طرح طلبہ کی ہر مضمون میں تدریس ناقص رہے گی ۔ للهذا پرچہ بنانے کے لیے موزوں ترین طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر مضمون اور ہر جماعت میں پرچہ تو اس مضمون کا تجربہ کار معلم ہی بنائے البتہ وہ اس مضمون کے دوسرے اساتذہ سے جماعت کی قابلیت کے متعلق استفسار کر

لے اور یہ بھی معلوم کرے کہ کون کون سے موضوعات تفصیل سے پڑھائے گئے اور کون سے سرسری طور پر ۔

۲ ۔ پرچے جانچنا :

اساتذہ داخلی امتحانات کے پرچے دیکھنا عموماً بارگراں سمجھتے ہیں اور جب بہت سے پرچے دیکھنے پڑیں اور ان کے لیے وقت بھی کم دیا گیا ہو تو اسے بے دلی سے بیکار سمجھ کر قبول کرتے ہیں اور بڑی بے دردی سے کاپیوں کا جائزہ لیتے ہیں ۔ اس طرح طلبہ سے انصاف نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی صحیح اکتسابی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اساتذہ کاپیاں چیک کرتے وقت کاپیاں دیکھنے کے اصولوں سے اچھی طرح آگاہ ہوں ۔

۳ ۔ خارجی امتحانات :

ہمارے تعلیمی نظام میں خارجی امتحانات بہت اہمیت رکھتے ہیں ۔ ذیل میں اُن کے مقاصد ، مضر اثرات اور خامیاں ، اہمیت و ضرورت اور اصلاح کے متعلق تجاویز کا جائزہ پیش کیا گیا ہے ۔

مقاصد :

۱ ۔ خارجی امتحانات کا مقصد ان میں امتیاز قائم کرنا ہے جنہوں نے اکتساب علم و فن کا ایک خاص معیار حاصل کر لیا ہے اور جو ایسا کرنے میں ناکام ہوئے ہیں ۔

۲ ۔ خارجی امتحان تعلیم کے مختلف مدارج پر ہوتے ہیں مثلاً مڈل سکول امتحان درجہ ہشتم کے آخر میں اور سیکنڈری سکول امتحان درجہ دہم کے اختتام پر ۔ ہر اس امتحان سے یہ معلوم کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اس درجے کی نصابی سرگرمیوں کی تسلی بخش طور پر تکمیل ہو چکی ہے یا نہیں ۔

۳ - طلبہ کی بہت زیادہ تعداد کے پیش نظر ان کی تعلیمی قابلیتوں کے تقابل کا قابل عمل معیار یہ خارجی امتحانات ہی ہیں - ان امتحانات کے نتیجے کے طور پر مختلف طلبہ ، مختلف سکولوں اور مختلف علاقوں کی تعلیمی اکتسابی صلاحیتوں کی باہمی درجہ بندی ہو جاتی ہے -

۴ - خارجی امتحانات کا ایک بڑا مقصد طلبہ کو ان کی قابلیت کے معیار کے مطابق سند دینا ہوتا ہے -

۵ - ان امتحانات سے یہ بھی جائزہ لیا جاتا ہے کہ کون کون سے طلبہ اعلیٰ تعلیم یا پیشہ ورانہ تربیت کے لیے موزوں ہیں - طلبہ کو دی گئی سند کی بنا پر طلبہ کو اعلیٰ تعلیمی یا فنی اداروں میں داخلہ مل جاتا ہے - اس لحاظ سے یہ امتحانات صرف سابقہ یا ماضی کی اکتسابی قوتوں کا ہی جائزہ نہیں لیتے بلکہ طلبہ کے مستقبل کی پیش گوئی بھی کرتے ہیں -

۶ - خارجی امتحانات میں کامیابی کی بنا پر طلبہ ملازمت حاصل کرنے کے مطلوبہ معیار پر پورے اترتے ہیں اور انھیں ملازمت کے حصول میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے -

۷ - خارجی امتحانات سے یہ مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے کہ عوام معلوم کر سکیں کہ کون کون سے مدرسے کس کس معیار کی تعلیم و تربیت مہیا کر رہے ہیں -

۸ - خارجی امتحانات سے ذہین اور لائق ترین طلبہ کا انتخاب آسان ہو جاتا ہے اور انہیں وظائف اور انعامات بھی دیے جاتے ہیں - اس طرح ان امتحانات کا ایک مقصد اور بنیادی اصول طلبہ اور مدرسوں کا باہمی مقابلہ اور مسابقت بھی ہے -

۹ - خارجی امتحانات سے مدرسے اور اساتذہ کی صلاحیتوں اور کارکردگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے -

۶ - خارجی امتحانات سے تعلیمی مقاصد ، نصاب تعلیم اور طریقہ ہائے تدریس کی مناسبت کا جائزہ لیا جا سکتا ہے ۔

خارجی امتحانات کی خامیاں :

پچھلے چند سالوں سے اس روایتی طریقہ امتحانات پر بہت تنقید کی جا رہی ہے ۔ طلبہ تو امتحانات سے نالاں ہیں ہی ، اساتذہ بھی ان امتحانات کو مدرسے کے تدریسی اور تربیتی کام کے لیے مضر سمجھتے ہیں ۔ والدین طلبہ کی ذہنی اور جسمانی صحت پر برا اثر ڈالنے کی وجہ سے ان کو اچھا نہیں سمجھتے ۔ ماہرین تعلیم کی رائے میں یہ امتحانات واضح مقاصد اور نصب العین سے عاری ہیں ۔ اس تنقید کے پیش نظر ہماری حکومت کی طرف سے امتحانات کی اصلاح احوال کے لیے کمیشن اور کمیٹیاں بھی قائم کی گئیں ہیں ۔ ان امتحانات کی اہم خامیاں درج ذیل ہیں ۔

۱ - خارجی امتحانات مدرسوں کے کام پر مضر اثرات ڈالتے ہیں ۔ تعلیمی مواد ، مختلف مضامین پڑھانے کے طریقے اور طلبہ کا طرز فکر ، طرز مطالعہ اور طرز تحریر ان امتحانات سے متاثر ہوتے ہیں ۔ سکول کے تمام کام کو خارجی امتحان کے رنگ میں رنگ لیا جاتا ہے ۔ مدرسے کی تدریس و تربیت کا واحد مقصد یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ کسی طرح عام اصولوں سے ہٹ کر امتحان پاس کرا دیا جائے ۔ مختلف مضامین کے وہ حصے جو امتحان میں اہم سمجھے جاتے ہیں رٹوا دیے جاتے ہیں اور ایسے حصے اور سرگرمیاں جو درحقیقت طلبہ کی شخصیت کی نشو و نما کے لیے بے حد اہم ہوتے ہیں ، نظر انداز کر دیے جاتے ہیں ۔ اسی طرح طریقہ ہائے تدریس اور مدرسے کے دیگر شعبوں میں اصولوں سے انحراف کر کے امتحانات پاس کرانے پر زور دیا جاتا ہے ۔

۲ - خارجی امتحانات کی بہت زیادہ اہمیت کے سبب کچھ تعلیمی عمل بالکل الٹ دیا گیا ہے ۔ تعلیمی عمل میں مختلف عناصر کی ترتیب یوں ہونی چاہیے ۔ ۱ : طلبہ کی شخصیت اور سیرت و کردار کی

ہر پہلو سے تربیت ۔ ۲ : ملی اور قومی نظریۂ حیات ۔ ۳ : تعلیمی مقاصد ۔ ۴ : تفصیلی مقاصد کے حصول کے لیے نصاب ۔ ۵ : نصاب کی تدریس کے مختلف طریقے ۔ مددگار اشیا اور ذرائع اور سب سے آخر میں ۶ : جائزہ یا امتحان ۔ اس لحاظ سے امتحانات ایک ذریعہ ہیں یہ جائزہ لینے کا کہ تعلیمی عمل درست ہوا ہے یا نہیں اور تعلیمی نصب العین حاصل ہو گیا ہے یا نہیں ۔ لیکن موجودہ حالات میں امتحان نے نصب العین کی حیثیت اختیار کر کے تعلیمی عمل کے باقی عناصر کو ذریعے کی حیثیت دے دی ہے ۔

امتحانات صرف علمی اور سائنسی علوم کے اکتساب کا جائزہ لیتے ہیں ۔ دراصل یہ انسانی حافظے کا جائزہ ہوتے ہیں اور طلبہ کی شخصیت کے اخلاقی ، سماجی ، جسمانی ، روحانی اور جمالیاتی پہلوؤں کا جائزہ نہیں لیتے ۔

۴ ۔ امتحانات طلبہ کی صلاحیتوں کا صحیح جائزہ نہیں لیتے ۔

۵ ۔ تعلیمی صلاحیتیں بڑھائے بغیر غلط اور ناجائز طریقے اختیار کر کے کچھ طلبہ نہ صرف پاس ہو جاتے ہیں بلکہ اعلیٰ مقام حاصل کرتے ہیں ۔ یہ بد عنوانیاں پرچہ معلوم کرنے ، کمرۂ امتحان میں غلط ذرائع استعمال کرنے ، کاپیاں جانچنے اور دفتر میں نتیجہ تیار کرنے الغرض ہر مرحلے اور سطح پر مروج ہیں اور طلبہ ان کے والدین ، اساتذہ ، ممتحنین ، دفتر کے کلرک اور افسر سب کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں ۔

۶ ۔ مدرسین اپنے طلبہ کی بہبود کے لیے جدید تدریسی طریقوں اور منصوبوں کو عمل میں نہیں لا سکتے ۔ ان کے سامنے تو صرف مضمونوں کے اہم حصے پڑھانا ، رٹوانا اور اگلوانے کی تیاری کرانا ہوتا ہے ۔ تعلیمی جستجو اور تحقیق ، اساتذہ کو راس آتی ہے نہ طلبہ کو ۔

۷ ۔ امتحانات کے نتائج پورے طور پر قابل اعتبار نہیں کہے جا سکتے ۔

ایک طالب علم کا پرچہ مختلف ممتحنوں کے پاس نمبر لگانے کے لیے بھیجا جائے تو نمبروں کے اختلاف سے یہ واضح ہو گا کہ یہ طریقۂ امتحانات قابل اعتبار نہیں۔ مزید یہ کہ ایک ہی ممتحن اگر ایک پرچے کو مختلف اوقات میں دیکھے تو ہر بار اس کے نمبر یکساں نہیں ہوں گے۔

۸۔ امتحانات طلبہ کی ذہنی، اخلاق اور جسمانی صحت پر مضر اثرات ڈالتے ہیں۔

۹۔ خارجی امتحانات واضح مقاصد اور نصب العین سے عاری ہوتے ہیں۔ ممتحن نہیں جانتے کہ وہ کس مقصد کے لیے کس خاص مضمون کے پرچے دیکھ رہے ہیں اور نہ ہی وہ پرچے دیکھنے کے بعد ہر امیدوار کی صفات کے بارے میں اپنا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ یہ امتحانات برائے امتحانات ہیں۔ ان امتحانوں کے ذریعے امیدواروں کی مخصوص صلاحیتوں کی نشاندہی نہیں ہوتی کہ فلاں طالب علم فلاں نوعیت کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مناسب ہے اور فلاں طالب علم کس مخصوص شعبے میں ملازمت کا اہل ہے۔

۱۰۔ طلبہ میں خلاصے، اشارات، امدادی اشیا اور گائیڈ بکس کی عادت پڑ جاتی ہے۔ طلبہ میں خیال آرائی، منطق اور تخلیقی و ذہنی سرگرمی پیدا ہی نہیں ہونے پاتی۔ اس لحاظ سے طلبہ کی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے۔

۱۱۔ بعض اوقات محض اتفاقات سے نہایت ذہین طلبہ کم نمبر حاصل کرتے ہیں یا فیل ہو جاتے ہیں اور پست ذہن طلبہ اعلیٰ درجے میں پاس ہو جاتے ہیں۔

نظام امتحانات کے لیے اصلاحی تدابیر:

ان خامیوں کی وجہ سے امتحانات کو یکسر ختم کر دینا مناسب نہیں بلکہ امتحانات کی ضرورت و اہمیت کے پیش نظر ان کی اصلاح کر کے ان سے مطلوبہ مقاصد حاصل کرنا ضروری ہے۔

امتحانات کی اصلاح کے لیے چند تجاویز درج ذیل ہیں :

۱ - طلبہ ، اساتذہ ، والدین اور معاشرے کو اس امر کا شدید احساس دلایا جائے کہ امتحانات طلبہ کی صلاحیت کے جائزے اور مقاصد کے لیے انتہائی ضروری ہیں ، اس لیے امتحانات کے متعلق آج کل کا روائتی نقطہ نظر بدل کر امتحانات کا سائنسی نقطہ نظر اختیار کریں -

۲ - امتحانات کے دائرۂ کار کو وسعت دی جائے - امتحانات طلبہ کے حافظے کا ہی جائزہ نہ ہیں بلکہ ان کے ذریعے طلبہ کی ذہنی ، جسمانی ، روحانی ، اخلاقی ، سماجی ، معاشی ، جمالیاتی اقدار اور صفات غرضیکہ پوری سیرت و کردار اور شخصیت کا جائزہ لیا جائے -

۳ - متعلقہ مدرسین سے خصوصی طور پر مدد لی جائے - یہ مدرسین دوران تربیت طلبہ کی شخصیت میں ہونے والی تبدیلیوں اور اوصاف کا ریکارڈ رکھیں -

۴ - امتحانات کے نظام کو درست کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پرچہ بنانے اور کاپیاں جانچنے کے لیے ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے جو امتحان دینے والے طلبہ کی جماعتوں کو پڑھانے کا تجربہ رکھتے ہوں- مثال کے طور پر پرائمری مدرسوں میں تدریس کرنے والے اساتذہ اور یونیورسٹی کے درجے پر تدریس کرنے والے پروفیسروں سے ہائی سکولوں کے طلبہ کے پرچوں کے سلسلے میں کوئی خدمت نہ لی جائے-

۵ - داخلی امتحانات اور خارجی امتحانات کے امتزاج سے ایسا نظام امتحانات معرض وجود میں لایا جائے جس میں داخلی اور خارجی امتحانات کی خوبیاں ، اوصاف اور محاسن تو موجود ہوں لیکن ان میں موجود خامیوں اور کوتاہیوں سے اجتناب کیا جائے -

۶ - تحریری امتحان کے علاوہ زبانی امتحان بھی لیا جائے - بہت سے ملکوں میں یہ طریقہ مروج ہے - اگرچہ اس میں کچھ خامیاں بھی ہیں - اس کے باوجود تحریری امتحان کے ساتھ اگر زبانی امتحان

بھی شامل کر دیا جائے تو یہ ایک دوسرے کی تکمیل کر دیں گے - تحریری امتحان سے طلبہ کی جن ذاتی ، اخلاق ، ذہنی اور روحانی صفات کا اندازہ نہیں ہو پاتا زبانی امتحان میں بالمشافہ سوال و جواب سے یہ صفات منکشف ہو سکتی ہیں ، لیکن جہاں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہو وہاں زبانی امتحان تقریباً نا ممکن ہے -

۷ - مدرسوں میں طلبہ کا جامع ریکارڈ (Cumulative Record) رکھا جائے جس میں ہر طالب علم کی ذہنی ، روحانی ، اخلاق ، سماجی اور جسمانی اقدار ، سیرت و کردار ، دلچسپیاں ، رجحانات ، دل پسند تفریحی کھیل اور مشاغل، علمی و ادبی ذوق اور سماجی بہبود کا جذبہ وغیرہ شامل کیا جائے، ہمارے مدرسوں میں ہر تین ماہ کے بعد پراگریس کارڈ اور سالانہ ڈاکٹری معائنہ کی رپورٹ بھیجی جاتی ہے - اسی طرح اگر ہر طالب علم کا جامع ریکارڈ بھی مرتب کر لیا جائے تو یہ ریکارڈ امتحان کے بہت سے مقاصد پورے کرنے میں مدد دے گا -

۸ - پرچۂ سوالات میں اصلاح کی جائے - سوالات صرف حافظہ کی آزمائش نہ کریں بلکہ سوچ بچار اور خیال آرائی پر زور دیا جائے - سوالات کسی مضمون کے پورے نصاب پر محیط ہوں اور کوئی بھی اہم حصہ نظر انداز نہ کیا گیا ہو - مزید یہ کہ سوالات کی زبان سادہ اور واضح ہو تاکہ ممتحن کے ذہن کو سمجھنے میں طلبہ کو دقت نہ ہو - پرچہ سوالات مرتب کرنے والے اساتذہ کا علمی مواد وسیع اور تدریسی تجربہ کافی طویل ہو -

۹ - طلبہ کی کاپیاں جانچنے کا معیار یکساں اور معروضی بنایا جائے - مختلف ممتحنوں میں نمبر لگانے کا اختلاف کسی ایک ممتحن کی ضرورت سے زیادہ سختی یا نرمی، کچھ سوالات یا سوالات کے مخصوص اجزا سے گہرا شغف یا نفرت ، ممتحن کی عجلت ، اس کی بے پرواہی یا اس کی ذہنی بیداری اور تھکاوٹ کی وجہ سے ہو سکتا ہے - اس

لیے اس اختلاف کی وجوہ کو دور کرنا چاہیے - مثلاً ہر سوال کے مختلف اجزا کے نمبر مقرر کر دیے جائیں - صدر ممتحن ماتحت ممتحنین کو واضح اور تفصیلی ہدایات دے - اس طرح سے نمبر لگانے کا طریق ذاتی پسند و ناپسند سے بالا تر ہو جائے گا اور نمبر لگانے میں یکسانیت پیدا ہو جائے گی -

۱ - عام امتحان کے ساتھ ساتھ طلبہ کو ذہنی آزمائشیں بھی دی جائیں- ذہانت کے جائزے کا طلبہ کے اکتسابی جائزہ سے مقابلہ کیا جائے تو طلبہ کے بہت سے قوی اور کمزور پہلو واضح ہو جائیں گے -

۱ - انشائی طرز امتحان کے ساتھ ساتھ معروضی طرز امتحان کو بھی رائج کیا جائے-

معروضی طرز امتحان یا طرز جدید کے امتحانات:

(Objective Tests or New Type Tests)

معروضی طرز کی آزمائشیں آج کل بہت مقبول ہو رہی ہیں - ان امتحانات میں ممتحن اور امیدوار کی داخلیت کو ختم کر دیا گیا ہے - چنانچہ نمبر لگاتے وقت ممتحن کی ذاتی پسند و ناپسند اثر انداز نہیں ہوتی- چھوٹے چھوٹے سوالوں کے بالکل واضح چھوٹے چھوٹے جوابات ہوتے ہیں - صدر ممتحن کی طرف سے درست تسلیم کردہ جوابات کی روشنی میں ممتحن امتحانی پرچوں کو جانچتا ہے - نمبر لگانے کا یہ عمل سائنسی اور ٹیکنیکل ہوتا ہے - یہ معروضی آزمائشیں پرانے انشائی طرز امتحان (Essay Type Examination) کی خامیوں کو دور کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہیں - یہ آزمائشیں طلبہ کی صحیح تفہیم اکتساب علم اور اس سے پیدا ہونے والے رد عمل، تعلیمی عمل کی وسعت اور گہرائی - طلبہ کی ذہنی تربیت اور ان کی شخصیت کے متعلق صحیح معلومات فراہم کرنے میں معاون ثابت ہو رہی ہیں -

معروضی آزمائشوں کی اقسام:

معروضی آزمائشوں کی دو اقسام ہیں:

۱ - تکمیل کرنے کی آزمائش ۔ (Completion Type)

۲ - شناخت کرنے کی آزمائش ۔ (Recognition Type)

شناخت کرنے کی آزمائشوں کی مزید تقسیم یہ ہے ۔

۱ - باہمی تقابل کی آزمائش ۔ (Matching Type)

۲ - صحیح اور غلط معلوم کرنے کی آزمائش ۔

(True-False Tests)

۳ - کثیر جوابوں میں سے صحیح جواب منتخب کرنے کی آزمائش ۔

(Multiple Choice Tests)

طرز جدید کی ان آزمائشوں کی وضاحت اور تفصیل درج ذیل ہے :

تکمیل کرنے کی آزمائش :

ایسی آزمائشوں میں چند جملے دیے جاتے ہیں ، جن میں سے ہر جملے میں کچھ جگہ خالی چھوڑ دی جاتی ہے ۔ طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ سوچ بچار کی قوت سے اور حافظے کی مدد سے ان خالی جگہوں میں مناسب الفاظ کا استعمال کریں ۔ مثلاً

معاشرتی علوم

۱ - بابر اور ابراہیم لودھی کا پانی پت کے میدان میں مقابلہ سن ——— میں ہوا ۔

۲ - اکبر کا پایۂ تخت اور دارالخلافہ ——— شہر تھا ۔

۳ - محمود غزنوی نے ہندوستان پر ——— حملے کیے ۔

ریاضی

۱ - مثلث کے دو اضلاع کا مجموعہ تیسرے ضلع سے ——— ہوتا ہے ۔

۲ - مثلث کے تینوں زاویوں کا مجموعہ ——— ہوتا ہے ۔

۳ ۔ اگر مثلث کے دو زاویے برابر ہوں تو ان زاویوں کے سامنے کے
اضلاع ——— ہوتے ہیں ۔

باہمی تقابل کی آزمائش :

اس آزمائش میں ایک کاغذ پر دو فہرستیں لکھ دی جاتی ہیں ۔ ایک بیانات کی اور دوسری ان بیانات کے جوابات کی ۔ جوابات والی فہرست میں ترتیب نہیں ہوتی ۔ طلبہ سے کہا جاتا ہے کہ ہر بیان کا جواب جوابات والی فہرست میں سے ڈھونڈیں اور بیانات کے سامنے خالی جگہ پر یہ جوابات لکھ دیں ۔ مثلاً درج ذیل آزمائش میں دائیں طرف بیانات درج ہیں اور بائیں طرف جوابات ۔ درمیان میں جگہ خالی ہے ۔ دائیں طرف کے بیان نمبر ایک کے لیے بائیں طرف والی فہرست سے جواب تلاش کر کے بیان نمبر ایک کے سامنے لکھ دیا ۔ اس طرح ہر بیان کے سامنے مناسب جواب لکھ دیا جائے ۔

بیانات		جوابات
		ا آ ن^2
۱ ۔ دائرے کا رقبہ	———————	ا آ ن^2 × ب
۲ ۔ مربع کا رقبہ	———————	(ط+ع) × ۲ × ب
۳ ۔ مثلث کا رقبہ	———————	ا آ ن^2
۴ ۔ مکعب نما کا حجم	———————	(ض^2)
۵ ۔ بیلن کا حجم	———————	$\frac{1}{2}$ × ق × ب
۶ ۔ رقبہ چار دیواری	———————	ط × ع × ب

بیانات		جوابات
۱ - قرار داد پاکستان	1940	1600
۲ - مسلم لیگ کا قیام		1939
۳ - جنگ عظیم دوم کی ابتدا		1940
۴ - برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام		1906
۵ - جنگ آزادی		1905
۶ - تقسیم بنگال		1857

صحیح اور غلط والی آزمائش :

اس قسم کی آزمائش میں کاغذ کے صفحے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصے میں دائیں طرف بیانات لکھ لیے جاتے ہیں اور بائیں جانب دوسرے حصے میں جگہ خالی چھوڑ دی جاتی ہے ۔ دائیں طرف والے بیانات میں سے کچھ صحیح اور کچھ غلط ہوتے ہیں ۔ اُمیدوار سے کہا جاتا ہے کہ صحیح بیانات کے سامنے ”ص“ لکھ دیں یا ”✓“ کا نشان لگا دیں اور غلط بیانات کے آگے ”غ“ لکھ دیں یا ”×“ کا نشان لگا دیں، نمونہ یہ ہے :

جماعت چہارم اردو

بیانات	جائزہ
	ص یا غ
۱ - پنجاب کا خٹک ناچ بہت مشہور ہے -	
۲ - سندھی لڑکے کے سر پر چادر ہوتی ہے -	
۳ - بلوچی لڑکیاں شلوار قمیض پہنتی ہیں -	
۴ - پٹھان بچوں کی زبان پشتو ہے -	
۵ - پنجاب کی بڑی فصل گندم ہے -	
۶ - پنجابی بچے اچکن پہنتے ہیں -	

بیانات	جائزہ
	ص
۱ - $9\text{لا} \times 4\text{لا} = 36\text{لا}^2$	
۲ - $5\text{لا} \times -6\text{لا} = -24\text{لا}^2$	
۳ - $-35\text{لا} + 47\text{لا} = 12\text{لا}$	
۴ - $\frac{24\text{لا}}{3} = -8\text{لا}$	
۵ - $-3\text{لا} \times 15\text{لا} = 45\text{لا}^2$	

صحیح اور غلط والی آزمائش میں بعض اوقات امیدوار قیاس آرائی اور تک بندی سے کام لیتے ہیں - صحیح طرز فکر کی رہنمائی اور تک بندی

کی حوصلہ شکنی کے لیے غلط نشان لگانے والے کو منفی نمبر دیے جاتے ہیں -

متعدد جوابوں میں سے صحیح جواب منتخب کرنے کی آزمائش :

اس آزمائش میں ایک بیان کے آگے بہت سے جوابات درج ہوتے ہیں لیکن ان میں سے صرف ایک صحیح ہوتا ہے - امیدواروں سے کہا جاتا ہے کہ ہر بیان کے صحیح جواب کے سامنے ''ص'' یا ''✓'' کا نشان لگا دیں - نمونہ یہ ہے :

بیانات	جوابات
ا - مثلث مساوی الساقین	۱ - جس کے تینوں اضلاع برابر ہوں - ۲ - جس کے دو اضلاع برابر ہوں - ۳ - جس کا ہر ایک زاویہ 60 درجے ہو - ۴ - جس کا قاعدہ اور ارتفاع برابر ہوں-
ب - مسلم لیگ کے قیام کا سن	۱ - 1940 ۲ - 1857 ۳ - 1906 ۴ - 1947

معروضی آزمائشوں کے فوائد اور ان آزمائشوں کی روایتی انشائی امتحانات پر فوقیت :

۱ - معروضی آزمائشیں قابل اعتماد ہوتی ہیں - ان میں جوابات مختصر اور واحد ہوتے ہیں - طویل ، مرکب اور پیچیدہ نہیں ہوتے - انہیں آسانی سے غلط یا صحیح کہا جا سکتا ہے اور اس کے مطابق نمبر دیے جاتے ہیں - ممتحن کی داخلیت نمبر لگانے میں اثر انداز نہیں ہوتی - پرچہ کوئی بھی ممتحن دیکھے نمبر یکساں ہی ملیں گے - انشائی طرز کے روائتی امتحانات میں ممتحن کی داخلیت کی وجہ سے دو ممتحن ایک ہی طالب علم کو مختلف نمبر دیتے ہیں یا ایک ہی کاپی ایک ہی ممتحن کو دو مختلف موقعوں پر جانچنے کے لیے دی جائے تو بھی نمبروں میں اختلاف ہوتا ہے -

۲ - معروضی آزمائش سائنسی طریقے سے تیار کی جاتی ہے - اس میں محنت اور وقت زیادہ صرف ہوتا ہے اور سوالات کافی تعداد میں دیے جاتے ہیں اس لیے نصاب یا کتاب کا کوئی بھی حصہ نظر انداز نہیں ہونے پاتا - طلبہ اور اساتذہ پورے نصاب کو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں - روائتی انشائی طرز کے امتحان میں چند سوالات پوچھے جاتے ہیں ، اس لیے ممتحن ، معلم اور طلبہ کئی حصوں کو غیر اہم سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں - طلبہ کو اپنی معلومات کے اظہار کا بعض اوقات موقع نہیں ملتا - غیر متوقع سوالات آنے کی وجہ سے انہیں خسارہ بھی ہوتا ہے اور ان کی قابلیت کا غلط اندازہ لگایا جا سکتا ہے -

۳ - معروضی آزمائشوں کے سوالات کے جوابات میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جس سے ممتحن غلط طور پر متاثر ہو - اگر امیدوار کو صحیح جواب معلوم نہ ہو تو وہ الفاظ کے ہیر پھیر اور ملمع سازی سے اپنی جہالت کو چھپا نہیں سکتا - اس کے برعکس انشائی طرز کے روائتی امتحان میں ممتحن کو فصاحت بیان ، الفاظ کی بندش اور زبان کی روانی سے متاثر کیا جا سکتا ہے -

۴ - معروضی آزمائشوں میں رفتار تحریر کو دخل نہیں ہوتا ۔ سوالات کے جوابات نہایت مختصر ہوتے ہیں۔ روائتی انشائی طرز امتحانات میں طالب علم کی تحریر کی رفتار بھی اہم ہوتی ہے ۔ ہر جواب کو مفصل اور مدلل لکھنے کے لیے کافی وقفے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ سست رفتاری سے جواب تحریر کرنے والا اُمیدوار (اگرچہ اسے سب جوابات یاد ہوں) وقت ختم ہونے پر چند سوالات حل کیے بغیر چھوڑ کر خسارے میں رہ جاتا ہے ۔

۵ - طرز جدید کی آزمائشوں میں طلبہ بہت کم وقت میں بہت سے سوالات کا جواب دے دیتے ہیں اور انہیں تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا ۔ اس کے برعکس انشائی طرز امتحان میں وہ مسلسل دو تین گھنٹے تک لکھنے سے تھک جاتے ہیں ۔

۶ - معروضی آزمائشوں میں اتفاقات اور قیاس آرائی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ۔ بازاری گیس پیپروں ، امدادی کتب اور چند سوالات کو رٹ کر امتحانات پاس کرنے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے ۔ انشائی طرز کے روائتی امتحانوں میں اکثر اوقات اتفاقات اور قیاس آرائی سے مدد لی جاتی ہے اور گیس پیپروں ، امدای کتب اور سوالات رٹنے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے ۔

۷ - ان آزمائشوں کے نتائج شماریات کے اُصولوں کے تحت منضبط کیے جا سکتے ہیں اور طلبہ کو اپنے صحیح علمی مقام اور پوزیشن کا علم ہو جاتا ہے ۔ روائتی امتحان میں ایسا عموماً ناممکن ہوتا ہے ۔

انشائی طرز (Essay Type) کے روائتی امتحانات کی خوبیاں اور معروضی آزمائشوں پر فوقیت :

۱ - انشائی طرز کے امتحانات میں طلبہ کے ذہنی عمل کا جائزہ بہتر طریقے سے لیا جا سکتا ہے ۔ طلبہ کی ذہنی اختراع ، تنظیم مواد خیالات کی صحیح ترجمانی اور صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت

انشائی طرز امتحانات سے منکشف ہو سکتی ہیں ۔ اس کے مقابلے میں
معروضی آزمائشوں سے صرف معلومات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے ۔
ان معلومات کا اظہار بھی بے ربط اور غیر مسلسل ہوتا ہے ۔
طرز جدید کے امتحانات میں صرف اچھے حافظے والا طالب علم
بہت آگے بڑھ جاتا ہے اور درمیانے حافظے والا طالب علم جس
کے ذہنی عوامل بہت بالیدہ ہوتے ہیں پیچھے رہ جاتا ہے ۔

۲ - انشائی طرز امتحان میں قیاس آرائی کو دخل نہیں ہوتا ۔ اس
کے برعکس معروضی آزمائشوں میں طالب علم قیاس آرائی کی بنا
پر بہت سے سوالات کا جواب صحیح دے سکتا ہے ۔ مثال
کے طور پر صحیح اور غلط جوابات کی آزمائشوں میں ایسا ہو
سکتا ہے ۔

۳ - انشائی طرز کے امتحانات میں اگر امیدوار بدعنوانی اور بددیانتی
کرے تو عموماً ممتحن کو پتا چل جاتا ہے ۔ اس کے برعکس
معروضی طرز کے امتحانات میں بددیانتی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے ۔
مثلاً کوئی طالب علم دوسرے طالب علم سے جوابات پوچھ لے یا
نقل کرے تو ممتحن بدیانتی سے آگاہ نہیں ہو سکتا ۔

۴ - انشائی طرز امتحان میں طلبہ میں رفتار تحریر ، انداز تحریر اور
زبان و بیان کی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں ۔ اس کے مقابلے میں معروضی
طرز امتحانات میں یہ تربیت نہیں ملتی ۔

روائتی انشائی طرز امتحانات اور معروضی آزمائشوں کے تقابل کے
بعد یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ امتحانات کے ہر طریقے میں چند اوصاف
موجود ہیں اور چند خامیاں ۔ اس لیے ماہرین تعلیم نے یہ تجویز کیا ہے
کہ امتحان میں ہر مضمون کے پرچے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا
جائے ۔ ایک حصے میں معروضی آزمائشی سوالات ہوں اور دوسرے حصے
میں انشائی سوالات ۔ ایسا کرنے سے ہم دونوں قسم کے امتحانوں کی
خامیوں سے بچ سکیں گے اور ان دونوں کے اوصاف سے بہرہ مند ہو

سکیں گے ۔ کسی بھی قسم کے طالب علم کو خسارہ نہیں ہو گا ۔ ممتحن کی داخلیت بھی محدود ہو جائے گی ۔ عام طلبہ کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا موقع مل جائے گا اور اچھے طلبہ اپنے ذہنی عمل کو استعمال کر سکیں گے ۔

سوالات

۱ ۔ اکتسابی جائزے کی اہمیت اور مقاصد بیان کیجیے ۔

۲ ۔ امتحانات کی مختلف اقسام اور ان کی تفصیل بتائیے ۔

۳ ۔ داخلی اور خارجی امتحانات کا مقابلہ کیجیے اور ہر ایک کا دائرہ عمل بتائیے ۔

۴ ۔ خارجی امتحانات کی اہمیت اور مقاصد مختصر طور پر بیان کیجیے ۔ نیز ان کی خامیاں واضح کر کے اصلاحی تجاویز بھی سپرد قلم کیجیے ۔

۵ ۔ جدید طرز کے امتحانات کی اقسام تفصیل سے بیان کیجیے ۔

۶ ۔ جدید طرز کے امتحانات کا مقابلہ انشائی طرز امتحانات سے کیجیے اور ہر دو کے محاسن اور خامیاں تحریر کیجیے ۔

۷ ۔ کیا امتحانات کو ختم کر کے ان کا متبادل تلاش کیا جا سکتا ہے ؟

تیار کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور و منظور شدہ
بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور/ملتان/
سرگودھا/بہاولپور/راولپنڈی بطور سول ٹیکسٹ بک۔

قومی کمیٹی برائے جائزہ کتب نصاب کی تصحیح شدہ

قومی ترانہ

پاک سرزمین شاد باد　کشورِ حسین شاد باد
تُو نشانِ عزمِ عالی شان　ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سرزمین کا نظام　قوّتِ اخوّتِ عوام
قوم، مُلک، سلطنت　پایندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد

پرچمِ ستارہ و ہلال　رہبرِ ترقی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال　جانِ استقبال
سایۂ خدائے ذوالجلال

کوڈ نمبر B.208　سیریل نمبر 477

تاریخ اشاعت	تعداد اشاعت	ایڈیشن	قیمت
اگست 1980	2000	اول	8.80